جدید ایڈیشن

مسئلۂ اذان و اقامت

ایک معتدل نظریہ

اصلاحات، اضافات اور سوالات و جوابات کے ساتھ

اصغر علی مصباحی

شاہ صفی اکیڈمی
SHAH SAFI ACADEMY
A centre for research on Islamic studies and Sufism

مسئلہ اذان واقامت

ایک معتدل نظریہ

تالیف

اصغر علی مصباحی

شاہ صفی اکیڈمی

خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد

کتاب: مسئلۂ اذان واقامت: ایک معتدل نظریہ

بقلم: اصغر علی مصباحی

اشاعت اول: ۱۴۳۸ھ/۲۰۱۷ء

اشاعت دوم: ۱۴۴۰ھ/۲۰۱۹ء

اشاعت سوم: ۱۴۴۴ھ/۲۰۲۳ء

ناشر: شاہ صفی اکیڈمی، خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد (یوپی)

قیمت: ۲۵۰/ روپے

MAS'ALA-E-AZAN - O- EQAMAT

By: **Asghar Ali Misbahi**

Published by: **Shah Safi Academy**,

Khanqah-e-Arifia, Saiyed Sarawan, Kaushambi, U.P. (India) 212213

Ph: 9910865854 / 93129229

Email: shahsafiacademy@gmail.com

قد أفلح من زكاها

انتساب

حجۃ الامۃ، امام الائمۃ، امام دار الہجرۃ

سیدنا مالک بن انس رضی اللہ عنہٗ

(۹۳-۱۷۹ھ/۷۱۱-۷۹۵ء)

کے نام

جنھوں نے خیر القرون ہی میں اپنے فقہی مسلک کو حکومتی مسلک بننے سے روکا

اور

ان تمام فقہا کے نام

جنھوں نے فروعی مسائل میں اختلاف رائے کو روا رکھا اور اپنی رائے کو کسی پر جبراً مسلط نہیں کیا

فہرست

پس منظر.....................مولانا ذیشان احمد مصباح.....................12

ابو جعفر منصور اور امام مالک..................................... 12

اتحاد کی ایک نئ بنا 15

بریلوی علما کا داخلی انتشار 17

مقدمۂ بدایوں 19

کتاب ہٰذا کا پس منظر 24

تحقیقات مؤلف 29

رد عمل اور اثرات 32

احوال طبع ثانی.....................اصغر علی مصباحی.....................35

عرض حال.....................اصغر علی مصباحی.....................37

پیش لفظ.....................مولانا ابو سعد حسن صفوی.....................40

تقدیم.....................مولانا غلام مصطفی ازہری.....................45

اجتہاد سے کسی کو بیر نہیں، تقلید سے کوئی آزاد نہیں 45

تفردات اور خانقاہ عارفیہ..................................... 53

"مسئلہ اذان و اقامت-ایک معتدل نظریہ" 59

مسئلہ اذان و اقامت ایک معتدل نظریہ......65

فقہی اختلاف؛ رحمت یا زحمت 66

مسئلہ اذان.....................73

اذان کا لغوی و اصطلاحی معنی 74

سلسلۂ اضافات؛ عہد بعہد 76

اذان کی ابتدا: 76
الصَّلاۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کا اضافہ 78
صَلُّوْا فِي رِحَالِکُمْ کا اضافہ: 79
اذان ثانی کا اضافہ: 82
تثویب کا اضافہ: 83
قبل اذان واقامت درود شریف کا اضافہ: 84
اذان کا محل: احادیث کی روشنی میں 87
اذان ثانی کا محل: حدیث کی روشنی میں 90
اذان ثانی کا محل: ائمہ مجتہدین کے نزدیک 92
حضرت امام مالک 92
حضرت امام شافعی 93
حضرت امام احمد بن حنبل 94
حضرت امام اعظم 94
اذان **عند المنبر** پر امت کا توارث 97
سنت اور تواتر و توارث میں فرق: 97
اذان ثانی کے داخل مسجد ہونے کی حکمت: 102
خارج مسجد اذان کے قائلین علما اور ان کے دلائل: 104
دلائل کا تجزیہ: 107
توارث و عرف بہ مقابلہ احیاے سنت: 107
ایک شبہ اور اس کا ازالہ 111
بین یدی الخطیب/المنبر کا مفہوم: 112

لایؤذن فی المسجد سے استدلال کا علمی جائزہ: 113
مسجد میں ذکر بالجہر کی ممانعت: 116
مسئلہ اقامت.....122
اقامت کا لغوی واصطلاحی معنی 123
اقامت کا لغوی معنی 123
اقامت کا اصطلاحی معنی 123
مسئلۂ اقامت کی شرعی حیثیت 124
مسئلۂ اقامت: احادیث کی روشنی میں 128
مسئلہ اقامت اور صحابہ و تابعین کا عمل 138
قد قامت الصلاۃ پر کھڑے ہونے کا استحباب: 138
ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کا وجوب: 140
ایک ضروری تنبیہ: 143
حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب کا علمی مقام 143
حضرت ابوقلابہ کا علمی مقام 144
حضرت عراک بن مالک غفاری کا مقام 144
حضرت محمد بن کعب قرظی کا علمی مقام 145
حضرت محمد بن مسلم ابن شہاب زہری کا علمی مقام 145
حضرت سلیمان بن حبیب محاربی کا علمی مقام 145
حضرت عمر بن عبدالعزیز کا علمی مقام 145
حضرت سعید بن مسیب کا علمی مقام: 147
مسئلۂ اقامت میں مذاہب اربعہ کا موقف 150

امام مالک کا مذہب: 150
امام شافعی کا مذہب: 151
امام احمد بن حنبل کا مذہب: 151
امام ابو حنیفہ کا مذہب: 152
مسئلہ اقامت میں فقہائے احناف کی تفصیل 153
امام طحطاوی کا موقف: 155
امام طحطاوی کی توضیح کی تائید 156
احناف کے نزدیک قیام عند الاقامہ کی کراہت اور صاحب مضمرات کا تسامح... 157
اقامت امام کا حق ہے: 164
مخالفت یا عزیمت؟ 169
ہندوستان کی خانقاہوں اور علمی مراکز کا توارث 171
خانقاہ چشتیہ نظامیہ، دہلی: 171
خانقاہ شیخ سعد خیر آبادی، خیر آباد: 172
خانقاہ عالیہ صفویہ، صفی پور: 172
خانقاہ ردولی شریف کا توارث 173
خانقاہ دائرہ شاہ ولایت الہ آباد 173
خانقاہ دائرہ شاہ محب اللہ الہ آباد 174
خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ 175
خانقاہ کاظمیہ قلندریہ، کاکوری، لکھنؤ: 176
خانقاہ وجیہیہ مجددیہ، رامپور: 176
خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، ضلع پٹنہ (بہار): 177

خانقاہ منعمیہ، پٹنہ: 177
خانقاہ قادریہ، بدایوں : 178
جنوب ہند کا توارث: 178
خانقاہ سلیمانیہ، تونسہ شریف، پاکستان 179
خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں الہ باد: 179
کیا یہ مسئلہ ضروریات اہل سنت اور شعار سنیت سے متعلق ہے؟ 183
ضروریات اہل سنت کا مفہوم: 183
تشبہ اہل بدعت کا مفہوم: 185
حاصل کلام 190
حرف اختتام 192
ضمیمہ.....194
اذان.....195
غیر اجماعی مسائل میں اختلاف کا جواز 195
حضرت غوث پاک کا عمل 197
قُرب وبُعد کا مفہوم 198
کیا امام اعظم کا مذہب یہ ہے کہ مسجد میں کوئی اذان نہ دی جائے؟ 199
کیا جمہور امت کا اتفاق ہے کہ اذانِ ثانی داخل مسجد دینا بدعت ومکروہ ہے؟.... 206
کیا جمعہ کی اذان ثانی کا مقصود دور تک آواز پہنچانا کبھی نہیں رہا؟ 208
"امداد" کی عبارت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ 209
علامہ ابن حجر عسقلانی کا رد اور اس کا جواب 210
کیا پنج وقتہ اذانیں مسجد کے اندر دینا مطلقاً مکروہ ہے؟ 212

کیا ہندوستان کی ساری مسجدوں میں اذان ثانی مسجد کے اندر ہوتی تھی؟ 213
کیا چاروں مذاہب میں داخلِ مسجد اذان دینے کا کوئی ثبوت نہیں ہے؟ 219
کیا غوث پاک، داتا علی ہجویری... سے داخل مسجد اذان کا ثبوت ہرگز نہیں ہے؟ ...222
کیا مسجد کے اندر اذان دینے کا توارث نص کے خلاف ہے؟ 223
کیا مسجد کے اندر اذان دینا سنت مستمرہ کے خلاف اور بدعت ہے؟ 223

اقامت 227

امام طحطاوی کے موقف پر اعتراض اور اس کا جواب 227
کیا حی علی الفلاح سے پہلے کھڑا ہونے والا عتاب کا مستحق ہوگا؟ 229
صاحب مضمرات کا قیام عند الاقامۃ کو مکروہ لکھنا تسامح کیسے ہے؟ 233
کیا عامۂ تابعین ابتدائے اقامت میں قیام کو مکروہ سمجھتے تھے؟ 234
بعض صحابہ و تابعین اور مجتہدینِ ثلاثہ کا عند الفلاح پر قیام کی توضیح 238
کیا حدیث سے مطلقاً ابتدا میں قیام کی ممانعت ثابت ہے؟ 243
جمہورِ امت نے قیام عند الفلاح کا حکم کیوں دیا؟ 250
حنفی ہونے کے باوجود تابعین کا سہارا کیوں؟ 251
اثرِ علی سے قیام عند الاقامۃ کی کراہت کا استنباط غلط ہے؟ 252
''وَجَبَ'' کا معنی آپ نے وجوب اصطلاحی سمجھ لیا ہے؟ 253
امام مالک کو مسئلہ اقامت کے تعلق سے کوئی حدیث نہیں ملی؟ 253
حدیث ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے استدلال اور اس کا جواب 256
اہل سنت کی عام مسجدوں کے معمولات کی موافقت کیوں نہیں؟ 259
اذان و اقامت سے قبل درودِ پاک کا ورد کیوں نہیں؟ 260
آپ کا قول عملِ اہل سنت و جماعت کے خلاف ہے؟ 261

صوفیہ اور مشائخ کے توارث کو اتنی اہمیت کیوں؟ 261
قابل اعتراض چند جملے اور ان کا جواب 262
کیا یہ مسئلہ اب فرعی نہیں ہے؟ 265
وہابیوں کی حمایت کا الزام اور اس کا جواب 265
غیر سنی خانقاہوں سے استدلال کا الزام اور اس کا جواب 266
آج اس مسئلے کو زیر بحث لانے کی ضرورت کیا ہے؟ 269
اہل سنت کے درمیان انتشار برپا کرنے کا الزام 270
آپ نے ڈیڑھ ہزار سوالات کے جوابات کیوں نہیں دیے؟ 271
حافظ ملت کی رائے اور عمل 272
مصادر و مراجع 274

پس منظر

ذیشان احمد مصباحی

''مسئلہ اذان واقامت : ایک معتدل نظریہ'' کا پہلا اور دوسرا ایڈیشن شاہ صفی اکیڈمی سے ۲۰۱۷ء اور ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا تھا۔ تیسرا ایڈیشن ورلڈ ویو پبلشرز لاہور کی طرف سے مصنف کی نظر ثانی اور راقم کے قلم سے کتاب اور موضوع کتاب کے تاریخی اور علمی ''پس منظر'' کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ مؤلف محترم مولانا اصغر علی مصباحی اس علمی کام کے لیے قابل مبارک باد ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کے اندر جس دقت نظر، تحقیق و تنقیح اور ترتیب و تہذیب کے ساتھ حسن بیان اور کمال ادب کا مظاہرہ کیا ہے، اختلافی۔علمی مسائل پر قلم اٹھانے والوں کے لیے یہ ایک اعلیٰ مثال ہے۔

خانقاہ عارفیہ اور اس کے زیب سجادہ داعی اسلام شیخ ابو سعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ العالی کے داعیانہ و عارفانہ مشرب و منہاج سے جو حضرات واقف ہیں، بہت ممکن ہے کہ خانقاہ سے ایسی کتاب کی اشاعت اور پھر اس کے طبع جدید پر ان کے سامنے سوالیہ نشان ہو۔ امت مسلمہ کے سیاسی و سماجی، علمی و فکری اور دینی و دعوتی مسائل سے جڑے ہزاروں نئے موضوعات دعوتِ تحقیق دے رہے ہیں، ایسے میں اس قدیم، فرعی، استحبابی، معمول بہ مسئلے کو موضوعِ سخن بنانے پر سوالیہ نشان قائم ہونا کوئی باعث استعجاب بھی نہیں۔

ابو جعفر منصور اور امام مالک

اس سوال کا جواب دینے سے قبل میں ایک دوسرے امر کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے ہمیں تاریخ کا سہارا لینا ہوگا۔ خلیفہ ابو جعفر

منصور (دورِ خلافت:۱۵۸-۱۳۶ھ) شہر رسول میں حاضر ہے۔ عالم مدینہ امام مالک بن انس (۱۷۹-۹۳ھ) کو طلب کرتا ہے اور ان سے گزارش کرتا ہے کہ آپ اجازت دیں کہ میں مؤطا کے نسخے تیار کراؤں اور تمام بلاد اسلامیہ میں اسے نشر کرادوں تاکہ تمام قضایا اسی کی روشنی میں فیصل ہوں اور یہ ہماری مملکت کے لیے دستور بن جائے، چوں کہ اہل مدینہ کا علم ہی اصل علم ہے۔

امام مالک کے لیے ابو جعفر کی یہ تجویز دو جہتوں سے بہت ہی اہم تھی۔ ایک تو یہ کہ امام مالک اس تجویز کو منظور کر لیتے تو بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عالم اسلام میں فروعی اختلافات کا خاتمہ ہو جاتا اور امت اصول و فروع میں متفق و متحد ہو جاتی۔ اس تجویز کی دوسری اہم جہت یہ تھی کہ وہ فقہ جس پر امت کا اتحاد ہونے والا تھا، کسی اور کی نہیں خود امام مالک کی تھی، لیکن اس کے باوجود آپ کو حیرت ہوگی کہ امام مالک نے منصور کی اس تجویز کو صاف صاف رد کر دیا۔ آپ نے فرمایا:

"امیر المؤمنین! آپ ایسا نہ کریں۔ علما کے مختلف مذاہبِ فقہ ہیں۔ سب نے حدیثیں سنیں اور روایتیں کیں۔ ہر جماعت نے ان میں سے ایک موقف اختیار کر لیا اور لوگ اس پر عمل کرنے لگے۔ اب ان کی آرا سے ان کو روکنا، ان پر گراں گزرے گا۔ اس لیے مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور ہر شہر کے علما کو ان کے اپنے مذہب پر عمل کرنے دیں۔"

منصور نے کہا: "امام! میری زندگی کی قسم! آپ اگر میری بات مان لیتے تو میں اپنی سلطنت میں یہ حکم نافذ کر دیتا۔"[1]

اس واقعے کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے اور عالمِ تخیل میں امام مالک سے سوال کیجیے کہ حضور! امت میں اتحاد ہو رہا تھا تو آپ نے اسے قبول کیوں نہیں فرمالیا، تاکہ ہمیشہ کے

([1]) سیر اعلام النبلاء، جلد:۸، احوال امام مالک بن انس

لیے امت کے اندرون سے اختلاف ختم ہوجاتا اور اتحاد کی راہ ہموار ہوجاتی؟

امام مالک آپ کو جواب دیں گے :

"میرے عزیز! فروعی اختلافات رحمت ہیں۔ ہر عالم کو اس کی تحقیق پر اور ہر خطے کے عوام کو اپنے امام کی تقلید میں عمل کی اجازت ہونی چاہیے۔ جب تک امت کا یہ تنوع و توسع باقی رہے گا، امت میں وحدت کی فضا قائم رہے گی۔ اس کے برخلاف جب بھی فروعی اختلافات میں اتحاد و اتفاق کی دعوت دی جائے گی، امت کا توسع و تنوع کے خلاف سوالیہ نشان قائم ہو جائے گا، پھر اس کوشش کے نتیجے میں امت میں اتحاد تو قائم نہ ہوسکے گا، البتہ انتشار اور باہمی بحث و جدال کا ماحول گرم ہوجائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ امت من حیث الکل ایک اللہ، ایک رسول، اور ایک قرآن پر ایمان لائی ہے، اب اس کے بعد یہ امت کسی فقیہ، امام، مجتہد اور غوث و قطب کو اپنے ایمان کا حصہ نہیں بنا سکتی۔ فروعات میں اتحاد کا مطلب یہ ہے کہ تمام فقہا، علما اور مجتہدین و صالحین کو رد کرکے کسی ایک عالم و مجتہد کو سب پر تھوپ دیا جائے۔ ایسی کوشش کسی بھی عالم کے حق میں خاموش ادعائے نبوت ہے، اس لیے کہ کل امت کے لیے واجب التسلیم صرف پیغمبر کی ذات ہوتی ہے، کسی مجتہد اور فقیہ کی نہیں۔"

امام مالک آپ کے لیے اس راز سربستہ سے بھی پردہ اٹھائیں گے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے علاوہ کسی بھی عالم کو کلی طور پر قبول نہیں کیا جاسکتا۔ خواہ وہ عالم کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، اس کی کچھ باتیں مقبول ہوں گی تو کچھ مردود ہوں گی؛ کیوں کہ "كُلُّ أَحَدٍ يُؤْخَذُ مِنْ قَوْلِهِ وَيُرَدُّ إِلا صَاحِبَ هَذَا الْقَبْرِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ"[1]

ہمارے سامنے ملت اسلامیہ کی پوری تاریخ ہے۔ اس پورے عہد میں کبھی بھی ائمہ صالحین کی طرف سے فروعات میں اتحاد قائم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ امام شافعی نے تو فروعی اختلافات کو برداشت کرنے اور ان اختلافات کے ساتھ اتحاد قائم

([1])المقاصد الحسنة (ص:۵۱۳، ح:۸۱۵)

کرنے کے حوالے سے ایک مستقل اصول دے دیا، جس پر کاربند رہتے ہوئے یہ امت قیامت تک کثرت میں وحدت کی مثال بنی رہے گی۔ آپ فرماتے ہیں:

رَأْيِيْ صَوَابٌ يَحْتَمِلُ الخَطَأَ، وَرَأْيُ غَيْرِيْ خَطَأٌ يَحْتَمِلُ الصَّوَابَ

(میری رائے درست ہے، احتمال خطا کے ساتھ اور میرے مخالف کی رائے خطا ہے، احتمال صواب کے ساتھ)

فروعات میں توسع اور فروعی اختلافات میں برداشت کی روایت اس امت کے مفاخر عالیہ (Highest Boasts)میں سے ایک ہے۔ اس حسین روایت کا ایک حسن یہ بھی ہے کہ کبھی بھی کسی عالم کی تحقیق کو یہ کہہ کر نہیں ٹھکرایا گیا کہ آپ شاگرد ہیں، استاذ سے کیسے اختلاف کر سکتے ہیں؟ آپ چھوٹے ہیں، بڑے سے اختلاف کیسے کر سکتے ہیں؟ بلکہ فروعی اختلافات و تحقیقات کی پوری تاریخ میں بنائے اختلاف ہمیشہ دلیل کو بنایا گیا، نہ کہ شخصیت کو۔ کسی بھی رائے سے اختلاف اسی بنیاد پر کیا گیا اور پھر کسی کے اختلافِ رائے سے بھی اختلاف کیا گیا تو اسی بنیاد پر کیا گیا، خصوصًا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے فقہی مناقشات اور اختلافات کی جو روایت قائم کی، اس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔

اتحاد کی ایک نئی بنا

امت کی اس زریں روایت کے خلاف گذشتہ سوڈیڑھ سو سال سے بغاوت کی جو ایک نئی روایت قائم ہوئی ہے، اس نے امت مسلمہ ہندیہ، خصوصًا اہل سنت کے تار و پود بکھیرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے اور ایسا فطری تھا؛ کیوں کہ امت مسلمہ ایک سیل رواں ہے جس کے سامنے بند باندھنے سے بکھراؤ اور انتشار کا ہونا لازمی ہے۔[1]

فروعات میں اتحاد کے لیے لازمی طور پر کسی ایک عالم کی رائے کو سب پر فائق اور سب کے لیے واجب القبول قرار دینا پڑے گا، ہندوستان کے سنی بریلوی طبقے کی

([1])اس حوالے سے کسی ایک شخص یا طبقے کو مورد الزام ٹھہرانا مشکل ہے، البتہ اصولی طور پر جس نے فہم قرآن میں عدم تعدد پر اصرار کیا، وہ فراہی اسکول ہے، جس پر تفصیل پھر کبھی۔

بات کریں تو اس نے یہ منصب اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی کو تفویض کر دیا۔ اتحاد جماعت کے لیے تاریخ اسلام کی اس منفرد کوشش کے بعد فوراً یہ سوال قائم ہوا کہ کیا کسی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ کسی بھی مسئلے میں اعلی حضرت فاضل بریلوی سے اختلاف رائے کرے؟ جواب دیا گیا کہ نہیں! کیوں کہ وہ اعلم العلما ہیں، کیوں کہ ان کی نظر سب سے زیادہ دقیق ہے، کیوں کہ ان کے قد کے علما نہیں پائے جاتے، اور یہی نہیں، مزید یہ کہ اللہ نے ان کے زبان و قلم کو خطا سے محفوظ کر دیا تھا۔ ایک ناروا دعوی کے اثبات کے لیے فاضل بریلوی کے حق میں اس قسم کی خاموش عصمت اور اپنے حق میں علم غیب کا دعوی کر لیا گیا۔ یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس قسم کی باتیں محض اظہار عقیدت کے طور پر، شاعرانہ نہیں کہی گئیں، بلکہ بیان حقیقت کے طور پر محققانہ انداز سے کہی گئیں۔ انتہا یہ ہوئی کہ بعض فقہی مجالس کے دستور میں فاضل بریلوی سے عدم اختلاف کو شامل کر لیا گیا۔

اتحاد جماعت کے لیے خشت خمیدہ پر قائم اس غلط مفروضے نے سب سے پہلے یہ کیا کہ بریلوی علما کو فاضل بریلوی سے اختلاف رائے رکھنے والے تمام علما کی تردید، تضحیک اور بسا اوقات تضلیل و تکفیر میں مبتلا کر دیا۔ رضویات کا تنقیدی مطالعہ گویا کفر قرار پایا اور اثبات تحقیقات رضویہ ایک جم غفیر کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔

اس روش نے فاضل بریلوی کے تمام مخالفین کے خلاف نفرت و اشتعال کا ماحول گرم کر دیا، قطع نظر اس سے کہ وہ مخالفین فقہیات میں ہوں یا اعتقادیات میں، فروعیات میں ہوں یا اساسیات میں۔

اس غیر فطری و غیر شرعی سعیِ اتحاد نے سب سے پہلے ملی اتحاد کا شیرازہ درہم برہم کر دیا اور بریلوی علما و عوام کو ملی مسائل سے تقریباً کلی طور پر بے نیاز کر کے "سنی مسائل" پر ان کو مرکوز کر دیا، پھر سنیت کی بھی خیر نہ رہی اور تحقیقات رضویہ کو ہی کل "حقیقتِ

سنیت "قرار دے کر "بریلویت کو سنیت کا مترادف "قرار دے دیا گیا۔ رضوی تحقیقات کی روشنی میں تمام اعمال واشغال -واجبات ومندوبات -کو شعار سنیت قرار دے دیا گیا اور ان سے اختلاف کرنے والے خواہ کوئی بھی ہوں، انہیں وہابی، دیوبندی، غیر سنی اور کچھ نہیں تو صلح کلی کی سند دے دی گئی۔

بریلوی علما کا داخلی انتشار

اس غیر فطری سعیٔ اتحاد کا اگلا منفی اثر یہ ہوا کہ خود بریلوی علما جو اپنی تمام تر تحقیقات فقہیہ اور مسائل علمیہ میں فرمودات رضا کو حرف آخر کا درجہ دیتے ہیں، یہ بھی آپس میں دست وگریباں ہو گئے۔ ان کے درمیان اس بات کی جنگ چھڑ گئی کہ دعویٰ تو سب کو رضوی ہونے کا ہے، مگر صحیح رضوی یا مسلک اعلی حضرت پر صحیح طور پر قائم کون ہے؟ ان کے درمیان جب کبھی کوئی فقہی اختلاف رونما ہوا، طرفین میں سے ہر ایک صرف اپنے موقف کو مسلک رضا کے مطابق اور دوسرے کے موقف کو مسلک رضا کے خلاف ثابت کرنے میں لگ گئے۔

مسلک اعلی حضرت کا حقیقی پاسبان وترجمان کون ہے؟ یہ سوال فاضل بریلوی کی وفات کے بعد بہت جلد ہی کھڑا ہو گیا تھا، البتہ فاضل بریلوی کے صاحب زادے مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خان بریلوی نے اپنے ناخن تدبر سے ایسے مباحث کو عام طور پر پنپنے نہیں دیا اور بڑی حد تک درون خانہ اتحاد واتفاق قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ مفتی اعظم ہند کے بعد بریلی کی مسند علم علامہ اختر رضا خان ازہری کو تفویض ہوئی، جن کے عہد میں اس جماعت کے اندر داخلی سطح پر وہ استحکام باقی نہ رہا۔

ادھر اعلی حضرت کے نامور خلیفہ مصنف بہار شریعت علامہ امجد علی اعظمی کے شاگرد رشید حافظ ملت مولانا شاہ عبد العزیز مرادآبادی ثم مبارک پوری نے جامعہ اشرفیہ کی شکل میں سنی بریلوی علما کا سب سے بڑا کارخانہ قائم کر دیا۔ اپنی تعلیمی، تحقیقی، تصنیفی،

اور علمی و دعوتی خدمات کے پیش نظر بہت جلد یہ ادارہ سنی بریلوی جماعت کی آبرو بن گیا۔ حضرت مفتی اعظم ہند کی وفات کے بعد ایک بڑے حلقے میں ایسا محسوس کیا جانے لگا کہ اب سنی بریلوی جماعت کی مرکزیت جامعہ اشرفیہ کو تفویض ہونی چاہیے -

دوسری طرف اعلی حضرت کے ایک دوسرے نامور شاگرد محدث اعظم ہند مولانا سید محمد اشرفی کچھوچھوی کے صاحب زادۂ گرامی علامہ سید محمد مدنی میاں کی طرف بھی بہت سی نگاہیں اٹھ رہی تھیں ۔ یہ ۱۹۸۰ء کے بعد کا زمانہ ہے، جب سب سے پہلے ٹیلی ویژن کے مسئلے پر علامہ مدنی میاں کی رائے جواز پر آئی تو ہندو پاک کے بہت سے بریلوی علما نے ان کی تائید کی، مگر ۱۹۸۴ء میں علامہ اختر رضا خان ازہری کی طرف سے اس کی تردید آگئی۔ ایک مسئلے میں دو بریلوی علما کا اختلاف ہو گیا۔ فقہ اسلامی کی تاریخ میں یہ کوئی نیا واقعہ نہیں تھا، لیکن نیا یہ تھا کہ اگر اس اختلاف کو راہ دے دی جاتی تو بریلویت کا مزعومہ اتحاد جو صرف ایک رائے پر قائم ہو سکتا تھا، وہ اب قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے اس اتحاد کے قیام کے لیے زبردست قلمی و لسانی جنگ لڑی گئی اور اخلاق و ادب کے سارے حدود پامال کر دیے گئے۔ کم و بیش پندرہ سالوں تک جاری رہنے والی اس اشرفی رضوی جنگ میں عام بریلوی حلقے میں رضویت یعنی علامہ اختر رضا خان ازہری کو فتح ہوئی، جب کہ اشرفیت کو اس معنی میں شکست ہوئی کہ اسے عام بریلوی حلقے سے دیس نکالا دے دیا گیا۔

معاملہ بچا اشرفیہ کے بڑھتے ہوئے اثرات کا، اس تفوق و تعلّی کا احساس کہیں نہ کہیں اشرفیہ کے فارغ مصباحی برادران کو بھی رہا اور بریلی کے ارباب درس و فتوی کو بھی رہا، لیکن بریلوی جماعت کے ایک بڑے مدبر عالم علامہ ارشد القادری مصباحی (۲۰۰۲ء) جب تک حیات رہے، اس قسم کے احساسات کو زبان و قلم تک آنے نہیں دیا۔ ان کے بعد یہ بند بھی ٹوٹ گیا۔ ۲۰۰۳ء میں مولانا ضیاء المصطفیٰ قادری نے بعض

ناچاقیوں کے پیش نظر اشرفیہ کو خیرباد کہا اور اسی سال علامہ اختر رضا خان ازہری کے زیر سرپرستی اشرفیہ مبارک پور کی مجلس شرعی کے بالمقابل شرعی کونسل آف انڈیا، بریلی قائم فرمادی۔ شرعی کونسل آف انڈیا بریلی کا قیام بریلوی تاریخ میں کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے، یہ بریلوی جماعت کے اندر رضوی مصباحی انقسام کا سانحہ ہے۔ اس کے بعد علامہ مفتی محمد نظام الدین رضوی کی سرکردگی میں مجلس شرعی مبارک پور سے ایک فیصلہ صادر ہوتا اور پھر شرعی کونسل آف انڈیا بریلی سے اس کا رد بلیغ ہوتا، خصوصاً ٹرین پر نماز کے سلسلے میں جو تنازع پیدا ہوا، وہ مفتی اشرفیہ کی تضلیل اور مبہم تکفیر تک پہنچ گیا۔ ایک بار پھر بریلی سے یہ آواز اٹھائی گئی کہ سارے علما اس جماعت کے سب سے بڑے عالم مفتی اختر رضا خان صاحب کے ہر ہر فتوے کی تصدیق کریں؛ کیوں کہ وہی مسلک اعلی حضرت کے سچے ترجمان اور محافظ ہیں۔ لہٰذا جو ان کی رائے اور تحقیق سے اختلاف کرے گا وہ رضوی نہیں۔ اس کے بعد کے مقدمات تو بریلوی عوام اور عام مولویوں کو یوں ہی ازبر ہیں کہ ”جو رضوی نہیں وہ سنی نہیں اور جو سنی نہیں وہ مسلمان نہیں۔“

یہ بریلوی جماعت کی کل فکری تاریخ ہے، جس میں قدم قدم پر اتحاد کے نام پر انتشار اور نفرت انگیزی کی کار فرمائی ہے۔ یقیناً اس میں استثناءات بھی ہیں اور بعض مردان فکر و دانش نے اس کے قبلے کو درست بھی کرنا چاہا، مگر –کون سنتا ہے فغان درویش! بھلا نقار خانے میں طوطی کی آواز سنائی کب دیتی ہے!

مقدمہ بدایوں

اب ایک مسئلہ اور سن لیجیے! بدایوں سے فاضل بریلوی کا گہرا عقیدت مندانہ ربط رہا۔ آپ مولانا فضل رسول بدایونی (۱۸۷۲–۱۹۷۸ء) سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی شان میں ”مدائح فضل الرسول“ اور ”حماید فضل الرسول“ نامی عربی قصائد کہے ہیں۔ ان کے صاحب زادے مولانا عبد القادر بدایونی (۱۹۰۱–۱۸۳۷ء)

سے بھی غایت درجہ عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ فاضل بریلوی نے ''چراغ انس'' نامی قصیدہ انہی کی مدح میں کہا ہے۔ ان کے صاحب زادے مولانا عبدالمقتدر بدایونی (۱۳۳۴ھ/۱۹۱۵ء) فاضل بریلوی کے معاصر ہیں اور دوطرفہ محبت و احترام کا تعلق ہے۔ ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء میں آپ نے ہی سب سے پہلے فاضل بریلوی کے لیے پٹنہ کے ایک اجلاس عام میں ''مجدد'' کا لفظ استعمال کیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ربط الفت و محبت قائم تھا، پھر گردش ایام نے وہ دن بھی دکھائے جب بریلی سے مولانا شاہ عبدالمقتدر بدایونی کی تجدید ایمان و نکاح و بیعت کا حکم صادر ہوا[1] اور بدایوں سے فاضل بریلوی کے لیے متجدد صاحب! اور نہ جانے کیا کیا القابات عطا ہوئے[2]

اس دل خراش داستان کی ابتدا یوں ہوئی کہ:

۱ - ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں فاضل بریلوی نے اذان ثانی کو اپنی مسجد کے اندرون سے خارج کرادیا۔[3]

۲ - ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۳ء) میں اس مسئلے پر بلگرام کے ایک استفتا کے جواب میں مختصر تحریر لکھی۔[4]

---

(1) سدالفرار، اشاعت دوم، مطبوعہ دارالعلوم رضائے خواجہ اجمیر، ۲۰۰۹ء، صفحہ ۱۳۵ر پر حضرت مولانا عبدالمقتدر بدایونی صاحب پر ''بالاجماع کم از کم پانچ حکم'' لازم کیے گئے ہیں: ۱- تجدید اسلام، ۲- اشاعت توبہ، ۳- تجدید نکاح، ۴- اعادۂ حج، ۵- تجدید بیعت

(2) سدالفرار، ج:۲، ص:۴۸، بحوالہ انکشاف حق، ص:۱۸۸، مطبوعہ دارالخلیل بدایوں، ۱۴۰۴ھ

(3) اس کا دعوی ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی نے فاضل بریلوی کے ایک مکتوب محررہ ۲۳ جمادی الاولی ۱۳۳۲ھ بنام مولانا محمد حمد اللہ شاہ کے حوالے سے کیا ہے، اس میں فاضل بریلوی کے الفاظ یہ ہیں: ''اذان ثانی کا مسئلہ نیاز مند کے یہاں ۳۵ برس سے جاری ہے۔ اکابر علما آئے اور دیکھا اور انکار نہ کیا۔'' یہ قلمی مکتوب خود مولانا مصباحی کا مملوکہ ہے۔ (ماہنامہ سنی دعوت اسلامی، ممبئی، اگست ۲۰۱۶ء ص:۳۸) اس کے برخلاف مولانا حامد رضا خان کے الفاظ یہ ہیں: ''یہ مسئلہ اذان ثانی جمعہ بھی آج کا نہیں، یہاں عملی طور پر قرنوں سے دروازۂ مسجد پر ہوتی'' (اجلی انوار رضا، ص:۱۷، اشاعت دوم، ۲۰۰۹ء، دارالعلوم رضائے خواجہ، اجمیر)

(4) مسئلہ اذان ثانی، از غلام جابر شمس مصباحی، سنی دعوت اسلامی، ممبئی، اگست ۲۰۱۶ء بحوالہ سلامۃ اللہ لاہل السنۃ، از حامد رضا خان

۳ - ۱۳۲۰ھ (۱۹۰۲ء) میں اس پر کسی قدر تفصیلی فتوی لکھا، عنوان تھا: ''اوفی اللمعۃ فی اذان الجمعۃ''۔ یہی فتویٰ ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۴ء) میں تحفۂ حنفیہ، پٹنہ میں شائع ہوا۔[1]

۴ - اوفی اللمعۃ کی اشاعت کے فوراً بعد دیوبندی عالم مولانا خلیل احمد انبیٹھوی (۱۸۹۲-۱۹۲۷ء) نے ''تنشیط الاذان'' لکھی اور فاضل بریلوی کے موقف کو رد کیا[2]

۵ - محرم ۱۳۳۲ھ (اوائل ۱۹۱۴ء) میں فاضل بریلوی پیلی بھیت گئے۔ وہاں لوگوں نے اذان ثانی کا مسئلہ دریافت کیا۔ آپ نے اپنا موقف مدلل طور سے بیان کیا۔ لوگ قائل ہوگئے اور فوراً جمعہ میں اس پر عمل بھی کیا۔ جمعہ بعد پھر آپ کا خطاب ہوا۔ خطاب کے بعد بہت سے لوگ آپ کے دامن طریقت سے وابستہ ہوئے۔ ان میں بہت سے لوگ مجددی تھے، اب سلسلہ قادریہ میں داخل ہوگئے۔ ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی نے فاضل بریلوی کے ایک قلمی مکتوب کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''یہ بات وہاں کے مجددیوں کو سخت ناگوار ہوئی اور وہ اس مسئلہ میں وہابیہ کے ساتھ ہوگئے۔'' مولانا عبد الغفار رام پوری بھی اس مشربی تعصب کا شکار ہوگئے۔ وہاں کے متعصب مجددیوں نے مولانا سے استفتا کیا اور آپ نے فاضل بریلوی کے خلاف فتوی دے دیا۔(3) مولانا عبد الغفار صاحب کا یہ فتوی مختصر ڈیڑھ ورقی تھا، اس کے جواب میں ربیع الاول ۱۳۳۲ھ (۱۹۱۴ء) میں فاضل بریلوی کا رسالہ ''اذان من اللہ لقیام سنۃ نبی اللہ'' جلوہ افروز ہوا۔

۶- رام پور معرکہ چھڑا ہی تھا کہ درمیان میں ایک تحریر مولانا اشرف علی تھانوی

([1]) ماہنامہ سنی دعوت اسلامی، ممبئی، اگست ۲۰۱۶ء ص: ۳۸

([2]) تذکرۃ الخلیل، ص: ۳۹۴۔ فاضل بریلوی کے ایک مکتوب محررہ ۲۶ / شعبان ۱۳۳۲ھ (۱۹۱۴ء) بنام مولانا ظفر الدین بہاری سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اس کا جواب بریلی سے نہیں گیا تھا، فاضل بریلوی کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی، پھر بھی وہ اس کا جواب چاہتے تھے۔ (مکتوبات امام احمد رضا، مرتبہ، محمود احمد قادری، ص: ۵۷)

([3]) ماہنامہ سنی دعوت اسلامی، اگست ۲۰۱۶ء، ص: ۳۷

کی آگئی، جس کا جواب صاحب زادۂ اعلی حضرت مولانا مصطفی رضا خان بریلوی کے قلم سے ''وقایۃ اہل السنۃ عن مکر دیوبند والفتنۃ'' (۱۳۳۲ھ) منصہ شہود پر آیا اور ۱۹/ ربیع الآخر ۱۳۳۲ھ (فروری ۱۹۱۴ء) کی رجسٹری ڈاک سے مولانا تھانوی کو بھیجا گیا۔ [1]

۷ - محرم ۱۳۳۲ھ (اوائل ۱۹۱۴ء) میں رام پور بریلی نزاع شروع ہوا تھا۔ سال بھر کے اندر اندر طرفین سے درجن بھر سے زائد کتب و رسائل کا تبادلہ ہو گیا، جس کا منطقی انجام ''نفی العار عن معائب المولوی عبد الغفار'' اور نفی الحیاء عن الکیاد احمد رضا'' جیسی کتابوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔

۸ - اب اس کے بعد رخ بدایوں کی طرف پھرا۔ اہل بدایوں کا کہنا ہے کہ رام پور - بریلی کے طویل تنازع میں فاضل بریلوی کو اپنے سابقہ تعلقات کے پیش نظر بدایوں سے اپنے موقف کی تائید کی امید تھی، لیکن بدایوں سے تصدیق کے بجائے ان کی رائے کے خلاف فتوی آگیا۔ اب پھر بدایوں سے سوال و جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ تحریر مبارک، تعبیر خواب سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ سد الفرار اور سد الفرفار اور پھر کورٹ کچہری تک پہنچا۔ سد الفرار میں ایک ذیلی رسالہ نکس اباطیل مدرسہ خرما (۱۳۳۳ھ) بھی تھا، جس کے تعارف میں صفحۂ اول پر یہ سطور مرقوم ہیں:

''بہزار افسوس کہا جاتا ہے کہ حضرت تاج الفحول کے بعد مدرسہ بدایوں کے عقائد و اعمال سب متزلزل ہو گئے۔ ان کی ماہواری تحریروں ''شمس العلوم'' و ''مذاکرۂ علمیہ'' سے پونے دو سو قول اس میں انتخاب کیے ہیں، جو خلاف شریعت و خلاف اہل سنت و خلاف اسلام واقع ہوئے ہیں۔ آخر میں گرامی برادران کو توبہ کی ہدایت ہے۔''

ایک معاصر مورخ مولانا سید محمد حسین سید پوری بدایونی (۱۹۱۸ء) رقم طراز ہیں:

([1]) یہ رسالہ مجموعہ رسائل مفتی اعظم جلد ہفتم میں شامل ہے، مطبع امام احمد رضا اکیڈمی بریلی، ۲۰۱۵ء۔ حیرت ہے کہ جابر شمس مصباحی نے اپنے مضمون میں اسے مولانا حامد رضا خان بریلوی کا رسالہ قرار دیا ہے اور اس کا مطبع اہل سنت بریلی ۱۳۳۳ھ بتایا ہے۔ (سنی دعوت اسلامی، ممبئی، اگست ۲۰۱۶ء)

"کچھ مدت سے مولوی احمد رضا خان نے ایک فتویٰ جاری کیا ہے کہ جمعہ کی اذان ثانی جو مسجد کے اندر خطیب کے سامنے منبر کے نزدیک پڑھی جاتی ہے، وہ مسجد سے باہر ہونا چاہیے، اگرچہ مجدد صاحب [نے] اس بارے میں بہت کوشش کی، مگر رواج بہت ہی کم ہوا- لڑائی جھگڑے برپا ہوگئے، گروہ بندی، مقدمہ بازی، فضول خرچی، جہالت، نفسانیت، سب وشتم، بغض وعناد، غرض اس فتویٰ مبارکہ کی بدولت دولت و عزت خاک میں مل رہی ہے، مگر ہنوز روز اول ہے- سیکڑوں فتاوی ورسالے اِس فتویٰ کی تائید وتردید میں شائع ہوئے اور ہورہے ہیں، اشتہارات کا تو شمار ہی نہیں- کہا جاتا ہے اور اکثر رسالوں میں لکھا ہوا پایا گیا ہے کہ مولانا حامد رضا خان و مولانا مصطفی رضا خان کے نام سے جو رسالے اور اشتہارات شائع ہورہے ہیں، وہ خاص حضرت عالم اہل سنت والجماعت، مجدد مائۃ الحاضرہ صاحب کے ہی لکھے ہوئے ہیں، ہم کو اس سے بحث نہیں- مولانا حامد رضا خان کی تحریر سے رسالہ، بدایونی غصے کا حق جواب، مسئلہ اذان کا حق نما فیصلہ، رمز شیرینی چاہ شور (۱۳۳۲ھ)، طب شورش چاہ شور (۱۳۳۲ھ)، قصدیم شیریں باچاہ شور (۱۳۳۲ھ)، رسالہ سدالفرار- اِس [مؤخرالذکر کتاب] پر مقدمہ چل گیا اور مولوی احمد رضا خان صاحب بھی ماخوذ ہیں- اذان ثانی پیش خطیب، متّصل ممبر کے بارے میں کتاب ازالۃ الاوہام (مصنفہ مولوی فاضل عبدالواحد)، صد الفرفار (مولوی فاضل عبدالواحد)، مباحث الاذان (مولوی فاضل عبدالواحد)، بریلوی تحریر کا شافی جواب (مولوی مفتی حبیب الرحمن بدایونی) حبل اللہ المتین لہدم آثار المبتدعین (مولوی عبدالغفار خان رام پوری)- مولانا مصطفی رضا خاں صاحب کی تحریر سے رسالہ وقایۃ اہل السنۃ عن مکر دیوبند والقنبۃ، مقتل اکذب واجہل [وغیرہ] ہیں "- [1]

یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اسی لیے کہ ایک فرعی مسئلے کو معرکہ حق و باطل گمان کر

([1]) مظہر العلماء فی تراجم العلماء والکملاء (تذکرہ علماے ہندوستان) حاشیہ در احوال مولانا حامد رضا خان

لیا گیا اور اس میں بجائے اس کے کہ تعدد آرا اور اختلاف رائے کو برداشت کیا جاتا، ایک متفقہ رائے تک پہنچنے کی کوشش کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر تحریر کے بعد جوابی تحریر اور ہر جواب کے بعد جواب الجواب کا سلسلہ چلتا رہا، جس کا منفی نتیجہ وہی آیا جسے آنا تھا۔ بدایوں کے علاوہ مارہرہ، اجمیر، حیدرآباد، لکھنؤ، کولکاتا کے ارباب علم و مشیخت نے بھی اس فرعی بحث میں حصہ لیا۔ یہ بحث اگر بحث کی حد تک ہوتی تو بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا، انتہائی تکلیف دہ بات یہ ہے کہ تجہیل و تحمیق، تردید و تفسیق، تضلیل و تکفیر، سب و شتم اور ترک تعلق سب کچھ اس کے زیر اثر ہوا۔ آج بھی ہمارا یہی رویہ ہے کہ ہم اس قسم کے مسائل میں کسی ایک فریق کو محقق، اعلم اور برحق مانتے ہیں، دوسرے کو مجادل، جاہل، متعصب اور ناحق باور کرتے ہیں، جب کہ ہونا تو یہ چاہیے کہ ہم طرفین میں سے ہر ایک کا احترام کریں، ہر ایک کو برحق سمجھیں اور ان کے اختلاف کو دلیل کا اختلاف سمجھیں، بلکہ جس طرح ائمہ اربعہ میں سے کسی کی تجہیل و تحمیق اور تفسیق و تضلیل ہمیں گوارا نہیں، اسی طرح علمائے متاخرین کے اختلافات میں بھی ان قبیح جذبات سے ہمارا سینہ پاک ہونا چاہیے، نہ اپنی ہر تحقیق کا جواب طلب کرنا چاہیے اور نہ جواب الجواب میں مبتلا ہونا چاہیے، نہ ترک تعلق اور بائیکاٹ کی پالیسی اپنانی چاہیے، بلکہ جس وقت بھی اپنی تحقیق پر زیادہ اعتماد اور یقین ہونے لگے، جو ایک طبعی امر ہے، فوراً امام شافعی کے اس ارشاد گرامی کو ورد زبان کر لینا چاہیے:

رَأْيِيْ صَوَابٌ يَحْتَمِلُ الخَطَأَ، وَرَأْيُ غَيْرِي خَطَأٌ يَحْتَمِلُ الصَّوَابَ!

اس کے بعد تحقیق کے ساتھ پیدا ہونے والے خود پسندی اور حقارت نگاہی جیسے منفی جراثیم از خود فنا ہو جائیں گے۔

کتاب ہٰذا کا پس منظر

اب قصہ اس کتاب کی اشاعت کا۔ ۲۰۰۷ء میں خانقاہ عارفیہ میں پہلی بار

میری حاضری ہوئی۔ اندر داخل ہوتے ہوئے ایسا لگا کہ وقت کی سوئی اچانک دو تین صدیاں پیچھے چلی گئی ہو۔ ایک عجیب لذت اور سرشاری سے دوچار ہوا۔ ساتھ ہی دو چیزوں پر میری نظر اٹک گئی؛ اقامت اور مزامیر۔ اقامت کا مسئلہ میرے لیے زیادہ توجہ طلب نہیں تھا؛ کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ یہ استحبابی نوعیت کا مسئلہ ہے اور اہل سنت کے مختلف علمی وروحانی مراکز میں آج بھی مروجہ سنی بریلوی طریقے کے خلاف رائج ہے۔ مزامیر کے سلسلے میں زمانۂ طالب علمی میں اعلیٰ حضرت کا حرمت کا موقف سن چکا تھا، علامہ غلام رسول سعیدی کی شرح مسلم نے اس موقف میں مجھے مزید پختہ کر دیا تھا، لیکن صاحب سجادہ آستانہ عالیہ عارفیہ شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ العالی نے پہلی ملاقات میں ہی اس پر ایسی فاضلانہ اور نکات آفریں گفتگو کی کہ اسی مجلس میں حرمت کے تعلق سے میرا یقین پامال ہو گیا۔

۲۰۱۴ء میں جب پہلی بار حضرت مفتی محمد مطیع الرحمٰن مضطر رضوی خانقاہ میں تشریف لائے تو ان کی نظر بھی انہی دونوں باتوں پر پڑی اور ان کا تاثر بھی وہی تھا جو راقم کا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے معائنہ نامے میں لکھتے ہیں :

"الغرض! میں نے یہاں بعض فروعی مسائل، جن پر سنیت کا مدار نہیں ہے، جیسے اقامت کے شروع ہی میں سارے لوگوں کا کھڑا ہو جانا اور سماع بالمزامیر وغیرہ کو چھوڑ کر کوئی ایسی بات نہیں پائی جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکے یہ خانقاہ "سنیت" بلفظ دیگر "مسلک اعلیٰ حضرت" کی پابند نہیں ہے۔"

۲۰۱۲ء سے میں خانقاہ میں مستقل طور سے اقامت پذیر ہو گیا۔ اس بیچ مختلف ارباب علم و دانش کا خانقاہ آنا جانا ہوا۔ میں نے دیکھا کہ بیشتر علما کی نگاہیں خانقاہ کے اندر اتباع شریعت کی جلوہ باریوں اور نماز کی پابندیوں سے کہیں زیادہ ابتدائے اقامت میں نمازیوں کے کھڑے ہو جانے پر ٹک جا رہی ہیں۔ اس دوران اس مسئلے کا علمی

مطالعہ بھی ہوگیا۔ جو بھی سوال کرتا چند جملوں میں اسے مطمئن کر دیتا، یا کم از کم اس پر قائل کر لیتا کہ یہ اہل سنت کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے، یہ ایک فرعی اختلافی مسئلہ ہے اور اس مسئلے میں جو علما و مشائخ کی قدیم روایت ہے، یہ خانقاہ بھی اپنی اسی روایت پر قائم ہے۔ اہل خانقاہ کی دلیلیں آپ کی نظر میں کمزور بھی ہوں، تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ یہ لوگ آپ کے نزدیک اقامت کے مسئلے میں خلاف استحباب طریقے پر قائم ہوں گے، اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

بعض اوقات کچھ سادہ لوح مولوی صاحبان اس قسم کے قابل افسوس شبہات میں مبتلا نظر آتے کہ کیا اعلی حضرت کی تحقیق غلط ہو سکتی ہے؟ یہ تو شعار اہل سنت ہے اور شعار اہل سنت کی مخالفت تو ضلالت ہے۔ اس قسم کی الجھنوں میں بارہا ہمارے جامعہ عارفیہ کے طلبہ بھی مبتلا ہو جاتے اور پھر بیٹھ کر تفصیل سے انہیں سمجھانا پڑتا۔

گذشتہ دس پندرہ سالوں میں خانقاہ عارفیہ اور جامعہ عارفیہ کی دعوتی، علمی، تعلیمی اور رفاہی خدمات کے دائرے میں بے پناہ وسعت پیدا ہوئی۔ سوشل میڈیا کی مہربانی سے ملک بھر میں ان کی خوب تشہیر ہوئی۔ ان کے سبب خانقاہ عارفیہ اور صاحب خانقاہ کی عزت و شہرت اور مقبولیت بہت جلد ملک اور بیرون ملک پھیل گئی، لیکن اس کے ساتھ ایک فطری رد عمل یہ بھی ہوا کہ خانقاہ کے کرم فرماؤں کی تعداد بھی بڑھتی گئی اور طنز و تعریض، سب و شتم، تمسخر اور فتویٰ بازیاں بھی ہونے لگیں۔ اس بیچ مخالفین کی طرف سے جو سوالات زیادہ اٹھائے گئے ان میں ایک اہم مسئلہ اقامت بھی تھا۔ اقامت کا معمول چوں کہ حسب سابق آج بھی جاری ہے، اس لیے اس پر سوالات بھی مسلسل ہوتے رہے، حتی کہ اس عمل کو بنیاد بنا کر خانقاہ پر وہابیت اور ضلالت کی تہمتیں لگائی گئیں۔ خانقاہ کی طرف سے مامور مختلف علاقوں میں ائمہ و اساتذہ اور فارغین عارفیہ کو طرح طرح سے پریشان کیا گیا۔ ان میں سے بعض اپنی

قلت مطالعہ اور خارجی دباؤ کے سبب بعض اوقات الجھنوں کا شکار بھی ہوئے، جن کے پیش نظر اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی کہ اذان و اقامت کے تعلق سے خانقاہ عارفیہ کا جو موقف ہے، اسے علمی انداز میں پیش کر دیا جائے، تاکہ کم از کم خانقاہ کے متعلقین و منتسبین اور غیر جانب دار افراد تک مسئلے کی صحیح نوعیت مدلل طور پر سامنے آجائے، نیز مخالفین کے لیے بھی دعوت فکر و نظر اور پیغام صلح و امن ہو۔

دوسری طرف بعض ارباب علم ایسے تھے جو مسئلے کی نوعیت کو سمجھتے تھے، تاہم ان کا اصرار یہ تھا کہ اس طریقے کو بدل دیا جائے۔ ان کے خلوص اور محبت کو سلام، مگر ایک فرعی، فقہی، استحبابی اور اختلافی مسئلے میں اس قسم کے اصرار کا جواز کیا ہے، میں سمجھنے سے قاصر ہوں، اِلا یہ کہ یہ حضرات فاضل بریلوی کی محبت یا مسلکی جھنڈا برداروں کے خوف میں ایسے مبتلا ہیں کہ وہ سب کو ہر مسئلے میں فاضل بریلوی کی فکر و تحقیق کا پابند بنا دینا چاہتے ہیں۔ یہ بات میں پورے وثوق کے ساتھ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ان میں سے کچھ وہ ہیں کہ مذکورہ بالا اسباب کے پیش نظر جب اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۲۰۱۷ء میں منظر عام پر آیا تو انہوں نے خانقاہ سے قطع تعلق کر لیا، آنا جانا بند کر دیا، یہاں کی دعوت ٹھکرا دی، فون پر اپنے الطاف خاص سے نوازا۔ ان کی دلیل صرف یہ تھی کہ یہ استحبابی مسئلہ تھا، اس پر کتاب لانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور غضب میں ایسے تھے کہ اس پر ہماری معروضات سننے کو بھی تیار نہیں تھے۔

اب ان تک یہ صدائے دلِ دردمند کیسے پہنچاؤں کہ جب یہ ایک فرعی مسئلہ ہے، تو اس پر اس قدر برافروختہ ہونے، پاؤں پٹخنے اور سر پر آسمان اٹھانے کا جواز کیا ہے؟ اور ایک فرعی مسئلے پر کتاب آ ہی گئی۔ جس کی ضرورت سطور بالا میں بیان ہو چکی، اگرچہ وہ ضرورت ان مخلصین کی نظر میں متحقق نہیں ہے۔ تو اس پر اس قدر برہمی کہ نوبت قطع تعلق تک آپہنچی، کا کیا جواز؟ دین و سنیت کے ہزار ہا ہزار مسئلے میں اتفاق کے باوجود ایک

آدھ فرعی مسئلے میں اختلاف کے ساتھ آپ ہم سے اتحاد و محبت کیوں نہیں رکھ سکتے ؟آپ ایسا اتحاد ہم سے کیوں چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے حرف حرف اسیر بن جائیں ؟

وجہ وہی ہے جو ہم نے ابتدائی سطور میں بیان کی ہے کہ گذشتہ سو ڈیڑھ سو سالوں میں فروعات میں اتحاد کی جو ایک نئی ہوا چلی ہے، اس نے دین و سنیت کے شیرازے بکھیر کر رکھ دیے ہیں۔

اس تلخ حقیقت کو اب بلا تاخیر اپنے حلق سے نیچے اتار لینا چاہیے کہ اگر امت مسلمہ اور بطور خاص جماعت اہل سنت میں اتحاد عزیز ہے تو ہمیں فروعات میں اپنی اسی قدیم علمی روایت پر آنا ہوگا کہ استاذ سے شاگرد اختلاف کر رہا ہے اور اس اختلاف کو مذہب مدون میں شامل کیا جا رہا ہے اور جس کے لیے امام شافعی نے اور دیگر ائمہ اعلام نے بھی یہ اصول دیا :

رَأْيِيْ صَوَابٌ يَحْتَمِلُ الخَطَأَ، وَرَأْيُ غَيْرِي خَطَأٌ يَحْتَمِلُ الصَّوَابَ!

اس کے خلاف اتحاد امت و جماعت کے لیے جو بھی کوشش ہوگی وہ انتشار و فساد پر منتج ہوگی۔ چوں کہ اختلاف امت رحمت اسی وقت تک ہے جب تک اسے گوارا کیا جائے۔ جن لوگوں کو یہ اختلاف گوارا نہیں ہوتا، وہ جوش اتحاد اور جذبۂ احقاق حق کے نام پر امت کو زحمت اور فساد کی نذر کر دیتے ہیں-نعوذ بالله من شرور أنفسنا و من سيِّئات أعمالنا و نتوب إليه إنه هو الغفور الرحيم-

میرے علم کی حد تک اس کتاب کی اشاعت کے جواز کے لیے اہلِ خانقاہ کے پاس یہ چند بنیادیں تھیں :

(۱) تواتر کے ساتھ اس مسئلے کی وجہ سے خانقاہ کو وہابیت اور دیوبندیت سے جوڑا گیا۔ یہ بات مختلف حلقوں سے خانقاہ کو موصول ہوتی رہی ہے۔

(۲) بعض تعلیم یافتہ اور نسبتاً سنجیدہ افراد کی طرف سے مخلصانہ انداز میں یہ حکم

بصورتِ مشورہ آتا رہا کہ خانقاہ کا جو اپنا متوارث عمل ہے، اسے تبدیل کر لیا جائے۔ مگر خانقاہ کے اصحاب حل و عقد نے جب ان کے مشورے (حکم) پر عمل نہیں کیا تو وہ کسی قدر ناراض ہو گئے۔

(۳) اس قسم کے فروعی مسائل کو بنیاد بنا کر کہا گیا کہ "حی علی الصلاۃ" پر کھڑا ہونا اور خارجِ مسجد اذانِ ثانی دینا یہ شعارِ اہلِ سنت ہے، جس کی پاس داری واجب ہے اور اہلِ خانقاہ اس شعارِ اہلِ سنت کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

(۴) بعض دفعہ خانقاہ کے سادہ متوسلین -عوام اور عام علما- بھی تذبذب میں مبتلا ہوئے اور انہوں نے مسئلے کی نوعیت کو سمجھنا چاہا۔ انھیں انفرادی طور پر سمجھایا گیا تو وہ مطمئن ہو گئے، لیکن ظاہر ہے اس انفرادی تفہیم سے خانقاہ کے تمام متوسلین کی تفہیم ممکن نہیں تھی۔

تحقیقاتِ مؤلف

مذکورہ بالا وجوہات کے پیشِ نظر جامعہ عارفیہ کے استاذ اور لائبریرین مولانا اصغر علی مصباحی اس مسئلے کی پوری تحقیق میں لگ گئے۔ سال دو سال کے مطالعے کے بعد انھیں اس مسئلے کی تہ سے بہت سے حقائق نکلتے نظر آئے۔ مثلاً یہ کہ:

(۱) اقامت کے وقت کب کھڑا ہونا مستحب ہے۔ اس استحبابی مسئلے میں اختلاف ہے۔ بعض شروع میں کھڑے ہونے کے قائل ہیں اور بعض حی علی الصلاۃ و حی علی الفلاح یا قد قامت الصلاۃ پر۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز اور بعض دیگر تابعین، اولِ اقامت میں کھڑے ہونے کو واجب کہتے ہیں۔

(۲) مولانا اصغر مصباحی کو اپنے مطالعہ و تحقیق کے بعد اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ شروع اقامت میں کھڑا ہونا کسی فقیہ کے نزدیک مکروہ نہیں ہے اور جو بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ اقامت کے وقت مسجد میں داخل ہو رہا ہو تو جہاں ہو وہیں بیٹھ جائے،

یاحی علی الفلاح پر کھڑا ہوا اور اگر کھڑے ہو کر سنا تو یہ مکروہ ہے، اس مسئلے کا سرا قدوری کی شرح مضمرات تک پہنچتا ہے، جو آٹھویں صدی ہجری کی کتاب ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ صاحب مضمرات نے اس کے لیے حضرت علی کے ایک اثر سے استدلال کیا ہے اور اس استدلال میں تسامح کا شکار ہوئے ہیں۔ حضرت علی نے ان لوگوں کو کھڑا ہونے سے منع کیا ہے جو امام کے آنے سے پہلے ہی اس کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں اور ناحق خود کو مشقت میں ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے اس سے استدلال کرتے ہوئے مسجد میں موجود دین کے حق میں شروع اقامت میں کھڑے ہو جانے کو مکروہ کہنا یا اس وقت مسجد میں داخل ہونے والے شخص کے حق میں فوراً نہ بیٹھنے کو اور صفوں تک آنے کو مکروہ کہنا ضعف و تسامح سے خالی نہیں۔ مولانا اصغر صاحب نے اپنی تلاش و جستجو کے بعد کہا کہ یہ مسئلہ مضمرات سے پہلے کسی بھی کتاب میں نظر نہیں آیا۔

(۳) اذانِ ثانی کے مسئلے میں انھوں نے اس حقیقت کا بھی انکشاف کیا کہ دوسری صدی سے یہ مسئلہ علمائے اسلام اور مشائخ دین کے یہاں متوارث رہا کہ اذان ثانی کا مقصد باہر والوں کو بلانا نہیں، ورنہ یہ اذان بھی آج مائک سے دی جاتی۔ یہ صرف اندرونِ مسجد بیٹھے مصلیوں کو آگاہ کرنے کے لیے ہوتی ہے کہ اب خطبہ کا وقت آگیا، اسی لیے اسے اذان خطبہ بھی کہا جاتا ہے اور اسی لیے اسے داخلِ مسجد ہی دی جاتی رہی ہے، حتی کہ اعلیٰ حضرت کی مسجد میں اور ان کے پیر خانے اور دیگر خانقاہوں اور تعلیم گاہوں میں بھی پہلے یہی عمل تھا۔ اعلیٰ حضرت نے جب یہ تحقیق پیش کی تو اسے تمام اہل سنت نے قبول نہیں کیا۔ آج بھی بہت سے علمی و روحانی مراکز کا عمل اعلیٰ حضرت کی تحقیق کے خلاف قدیم طریقے پر ہے۔ خانقاہ عارفیہ بھی انھیں میں سے ایک ہے۔

مولانا اصغر مصباحی نے اس کی بھی تحقیق کی کہ کوئی چیز شعارِ دین اور شعارِ اہل سنت کب بنتی ہے۔ اس پر اعلیٰ حضرت کے والد گرامی علامہ مفتی نقی علی خان صاحب

نے بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ جو لوگ ایسے مسائل کو شعارِ دین یا شعارِ اہل سنت کہتے ہیں، وہ حضرات مفتی نقی علی خان اور دیگر علما کی تحریروں سے واقف نہیں ہیں۔

مولانا اصغر مصباحی نے جب ان حقائق کو حضرت شیخ سے بیان کیا تو شیخ نے اپنے متوسلین کی تفہیم کے لیے اور دوسروں کو بدگمانی و تبرا بازی اور تفسیق و تضلیل کے گناہ سے بچانے کے لیے مولانا اصغر کو حکم دیا کہ وہ سلیقے سے ان تمام حقائق کو مرتب کرلیں۔ جب مولانا اصغر صاحب نے انھیں مرتب کر دیا تو شیخ نے خانقاہ کے متعدّد علما کو اس پر نظر ثانی کرنے کے لیے کہا۔ جب سب نے دیکھ لیا اور کتاب چھپنے کے لیے تیار ہوگئی، پھر دوبارہ چند علما کو مطالعہ کرنے کے لیے کہا کہ وہ اس زاویے سے مطالعہ کریں کہ کہیں کسی مقام پر کسی عالم یا شیخ پر بطور خاص اعلیٰ حضرت پر کسی طرح کا طنز و تعریض تو نہیں ہے۔ ان حضرات نے دیکھا اور جہاں انھیں تھوڑا بھی شک ہوا، اس عبارت کی اصلاح کی گئی۔ بعد ازاں ہفتوں اس پر شیخ مشورہ کرتے رہے کہ کہیں لوگ اسے منفی معنی میں تو نہ لیں گے۔ جامعہ عارفیہ کے اساتذہ نے تقریباً یہ متفقہ رائے دی کہ چوں کہ کتاب میں اہل سنت کے کسی طریقے کو مطعون نہیں کیا گیا، نہ کسی پر طنز و تعریض کی گئی ہے، پھر یہ کہ ہم پر مسلسل اعتراضات ہو رہے ہیں، لوگ اپنی بات منوانے اور ہم کو خاطی بلکہ گنہگار ثابت کرنے کے درپے ہیں۔ اپنے لوگوں کو بھی ورغلایا جا رہا ہے کہ خانقاہ میں گمراہوں کا طریقہ مروّج ہے۔ پھر یہ کہ کتاب نہایت علمی ہے۔ اس کا اسلوب نہایت عالمانہ، محققانہ اور معروضی ہے۔ ایسے میں اب اکیڈمی سے اس کی اشاعت کے لیے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ میں نے یہ بھی عرض کیا کہ کتاب ایسی جامع، محققانہ اور مکمل ہے کہ اب مزید اس کے بعد کچھ کہنے یا کسی جواب الجواب میں ہمیں الجھنا ہی نہیں ہے۔ اس لیے ہم اگر ادب و تحقیق کے ساتھ خانقاہ میں رائج روایت کی تائید اور تمام مراکز میں مروج صورتوں کی توثیق کرتے ہیں اور اس مسئلے کو بحث و جدل اور جواب الجواب کا ایشو بھی نہیں بناتے تو ایسے میں اس کی

اشاعت میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔ احباب نے اس بات کو بھی پسند کیا اور بالآخر یہ کتاب شاہ صفی اکیڈمی سے چھپ گئی۔

ردعمل اور اثرات

اس کتاب کی اشاعت کے بعد اس کے مختلف ردعمل اور کئی اثرات سامنے آئے:

(۱) خانقاہ سے متوسل علما اور عوام پورے طور پر مطمئن ہو گئے اور ان کو اپنی خانقاہ کی روایت پر دلائل و شواہد مل گئے۔

(۲) جو لوگ مخلصانہ مسلسل نصیحتیں کر رہے تھے، ان کو تھوڑی سی تکلیف ہوئی ہوگی کہ انھوں نے ہمارا مشورہ نہیں مانا اور مایوسی بھی کہ اب مستقبل میں مشورہ دینے کی گنجائش نہ رہی۔ ان میں بعض حضرات قطع تعلق پر بھی آمادہ نظر آئے۔

(۳) جو لوگ ان مسائل کو بنیاد بنا کر خانقاہ کو وہابیت اور دیوبندیت یا ضلالت سے جوڑ رہے تھے اور شعارِ اہلِ سنت کی خلاف ورزی کا طعنہ دے رہے تھے، اب ان کی زبان بند ہو گئی۔

(۴) کئی حضرات اس قسم کے سوالات کرتے نظر آئے کہ کیا ضرورت تھی کہ یہ کتاب لکھی جاتی؟ یہ اہل سنت سے بغاوت ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کیوں ہوئی؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے سوچا کہ اس کے پس منظر کی وضاحت کر دی جائے، سو ہم نے وضاحت کر دی۔ یقیناً اہل علم اور سنجیدہ حضرات پر اس کی اشاعت کا پس منظر بھی واضح ہو گیا ہو گا اور ہمارے جو کرم فرما ناراض ہیں، ان سے گذارش ہے کہ خدا کے لیے آپ ان فروعی مسائل میں اختلافِ رائے کی بنیاد پر ناراض نہ ہوں۔ اس استحبابی مسئلے میں آپ کی جو تحقیق ہو اور آپ کے نزدیک جو راجح ہو، آپ اس پر عمل کریں، ہمیں آپ سے کوئی تعرض نہیں ۔ آپ کو اس کا بھی حق ہے کہ آپ بلا استثنا ہر ہر مسئلے میں

حرفاً حرفاً اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی موافقت کریں، لیکن جن علما ومشائخ نے اعلیٰ حضرت کی بعض تحقیقات فرعیہ کو تسلیم نہیں کیا، یا اعلیٰ حضرت نے جن مسائل میں عام علمائے اہل سنت سے اختلاف کیا، ان مسائل میں ان حضرات کو ان کی حالت پر چھوڑدیں۔ اہل سنت فروعی اختلاف کے ساتھ زندہ اور متحد رہ سکتے ہیں۔ ہر مسئلے پر سب کو ایک نقطے پر لانے کی کوشش، اتحاد کے بجائے ہمیشہ داروغہ گیری، تشدد وانتشار اور نفرت انگیزی پر منتج ہوگی، جس سے احتراز ہم سب کے لیے واجب ہے۔

(۵) ہمارے یہاں ایک بڑا طبقہ ردِّیوں کا ہے، جس کے پاس مثبت طور پر کرنے کا کوئی کام نہیں ہے، البتہ ہر وقت دوسروں کا رد کرنے اور دوسروں کے ایمان وعمل کی پیائش کے لیے آستین چڑھائے رہتا ہے۔ پیش نظر کتاب کی اشاعت اول کے بعد وہ طبقہ حسب توقع اپنے فرض منصبی سے جڑ گیا اور آناً فاناً کئی ایک تحریریں اس کتاب کے رد میں آگئیں۔ چوں کہ جدال اور جواب الجواب سے خانقاہ اور ارباب خانقاہ کو کوئی دل چسپی نہیں ہے، اس لیے ان تحریروں کے جواب کا نہ ارادہ تھا اور نہ بنا، البتہ صاحب سجادہ نے کہا کہ اس کتاب پر کیا کیا سوالات قائم کیے گئے ہیں اور مزید کیا قائم کیے جاسکتے ہیں، اپنی طرف سے قائم کرکے، کسی کا نام لیے بغیر، ان تمام کے جوابات دے دو، تاکہ یہ موضوع اپنے اختتام کو پہنچ جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ اپنا لہجہ اور نرم کرو اور کتاب کے جن جملوں پر ہمارے کرم فرماؤں کو اعتراض ہے، قطع نظر اس سے کہ ان کا اعتراض بجا ہے یا بے جا، نئی اشاعت میں ان تمام عبارتوں کو یکلخت بدل دو۔

شیخ کے اس ارشاد کے بعد مولف کتاب مولانا اصغر مصباحی تعمیل حکم میں لگ گئے۔ آخر میں مجھے اور برادر گرامی مولانا غلام مصطفیٰ ازہری صاحب کو بھی حکم ہوا کہ اس کتاب پر کچھ لکھ دیں۔ مولانا ازہری کی تحریر کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں شامل ہے،

جب کہ میری تحریر اب تیسرے ایڈیشن میں شامل ہو رہی ہے۔ شاید اللہ کی یہی مرضی تھی۔ بہر کیف! کتاب آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ پڑھیے اور اپنی مفید اصلاحات وآرا سے ہمیں مستفید کیجیے۔

آخر میں برادر گرامی قدر جناب مقصود احمد کامران (ورلڈ ویو پبلشرز لاہور) کا شکریہ واجب ہے، جن کی کوششوں سے کتاب کا یہ تیسرا ایڈیشن منظر عام پر آرہا ہے اور پاکستانی اہل علم تک اس کی رسائی ممکن ہو رہی ہے۔ اس سے قبل محترم موصوف شاہ صفی اکیڈمی کی شائع کردہ دوسری کتابیں، مثلاً ''مسئلہ تکفیر و متکلّمین''، ''مرج البحرین'' اور مجلہ الاحسان کا سلطان المشائخ نمبر بھی اپنے اشاعتی ادارہ ورلڈ ویو پبلشرز سے شائع کر چکے ہیں، جس کے لیے ہم ان کے ممنون کرم اور مقروض محبت ہیں۔ یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ مقصود بھائی ایک اچھے ناشر و تاجر کتب ہی نہیں، ایک خوش فکر، باذوق، اصلاح پسند، صاحب نظر اور وسیع القلب انسان بھی ہیں۔ مولیٰ کریم انہیں یوں ہی عازم سفر رکھے اور دارین کی سعادتوں سے سرفراز فرمائے۔ آمین

خیر اندیش

ذیشان احمد مصباحی

جامعہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد

۵/ جون ۲۰۲۱ء

احوال طبع ثانی

اصغر علی مصباحی

۲۰۱۷ میں ''مسئلہ اذان واقامت ''بعض احباب کے اصرار اور کرم فرماؤں کے احسانات کے نتیجے میں ترتیب دی گئی تھی۔اس کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ ہمارے جو احباب ان مسائل کو سمجھنا چاہتے تھے وہ سمجھ کر مطمئن ہو گئے کہ یہ فرعی مسئلہ ہے اور خانقاہ عالیہ عارفیہ کا توارث و تحقیق ہے، جس پر ماضی میں امت کا توارث رہا اور آج بھی ملک و بیرون ملک بہت سے علمی و روحانی مراکز اس توارث پر قائم ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب و اشاعت اور مشمولات پر بعض بڑے لوگوں کی طرف سے سوالات اٹھائے گئے جس کے زیر اثر ہم سے بعض لوگوں کی جانب سے مطالبہ کیا جانے لگا کہ آپ اپنی کتاب پر اٹھ رہے سوالات کا جواب دیجیے۔ہم ہر بار ان کا مطالبہ نظر انداز کرتے رہے لیکن جب ہم نے خود محسوس کیا کہ واقعی کچھ سوالات علمی و تحقیقی انداز کے ہیں جن کا جواب علمی طور پر دیا جانا چاہیے تو پھر ہمیں ان سوالات کے جوابات دینے کی طرف مائل ہونا پڑا،اور چونکہ ہمیں خود بھی اس کتاب میں کچھ حذف و اضافہ کرنا تھا،اس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ کچھ حذف و اضافہ اور بعض اہم سوالات کے جوابات کے ساتھ اس کی دوسری اشاعت ہو جائے۔کتاب آپ کے سامنے ہے۔ اب اس کے بعد ان شاء اللہ مزید سلسلۂ جواب الجواب کی حاجت نہ ہوگی،کیوں کہ مسئلہ کی تفہیم اور شکوک و شبہات کے ازالہ کے لیے جتنا لکھ دیا گیا ہے وہ

کافی ہے، اس سے زیادہ قیل و قال اور چنیں وچناں ضیاع وقت کے سوا کچھ بھی نہیں۔

تازہ اشاعت میں ہم نے بظاہر قابل اعتراض جملوں کو بھی حذف کر دیا ہے جن کی نشاندہی ہمارے احباب نے کی تھی، ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ اس اشاعت میں مزید نئے دلائل بھی ذکر کیے گئے ہیں۔ اور چند خانقاہوں کے توارث کو بھی درج کیا گیا ہے جن کا ذکر پہلی اشاعت میں شامل نہیں ہو سکا تھا۔ اور صاحب مضمرات اور صاحب فتاوی صوفیہ کی تاریخ وفات کے سلسلے میں جو تسامحات در آئے تھے، انہیں بھی ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی نئی باتیں پیش کی گئی ہیں جو آپ کے مطالعہ کے حوالے ہیں۔

ہم ان تمام لوگوں کا شکریہ چند رسمی جملوں کے ذریعہ ادا نہیں کر سکتے، جنھوں نے سوالات کی ترتیب و تہذیب اور کتاب کو جدید اشاعت کے قابل بنانے میں ہماری مدد کی ہے، اس کا اجر صرف رب کریم ہی کے پاس ہے۔

اصغر علی مصباحی

مکتبۃ الاحسان، جامعہ عارفیہ، سید سراواں شریف

یک شنبہ ۲۳/ رجب ۱۴۴۰ھ/ ۳۱/ مارچ ۲۰۱۹ء

عرض حال

اصغر علی مصباحی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لولیہ والصلاۃ والسلام علی خیر خلقہ ومن سار علی منہجہ

اللہ تعالی کا احسان ہے کہ اس نے خانقاہ عالیہ عارفیہ میں چار سال سے تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ لائبریری کی خدمت کا بھی موقع عنایت فرمایا، جو میرے لیے باعث صد افتخار ہے، میں اللہ کی اس عنایت پر جتنا نازاں رہوں کم ہے، اس نے میرے لیے اس میں جو سکون واطمینان رکھا ہے وہ شاید کسی بادشاہ کو بھی اپنے محل میں میسر نہ ہو۔

لیکن یہ اطمینان و سکون اس وقت بے اطمینانی اور بے سکونی میں بدل جاتا جب بعض طلبہ لائبریری میں آکر مجھ سے اذان ثانی اور اقامت کے تعلق سے کوئی کتاب طلب کرتے۔ میں نے بعض طلبہ سے دریافت کیا کہ اس موضوع پر کیوں مطالعہ کرنا چاہتے ہو؟ توانہوں نے بتایا کہ اس حوالے سے کچھ لوگ اکثر پریشان کرتے رہتے ہیں اور ہدف طعن بناتے ہیں۔ اس طرح کی باتیں مجھ سے بیان کی جاتیں، لیکن میں ان کو کوئی تحقیقی اور اعتدال پر مبنی کتاب کی طرف رہنمائی کرنے سے قاصر رہتا۔ میرے دل میں خیال آتا کہ کیوں نہ اس موضوع پر ایک علمی و تحقیقی انداز میں مبنی بر اعتدال کتاب لکھی جائے، جو اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کو محیط ہو، لیکن جب میں

اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کی طرف نظر کرتا تو پسینہ چھوٹ جاتا، اسی سوچ میں چار سال گزر گئے۔ ناچار میں نے مشائخ کی ہمتوں کے سہارے اس کا عزم مصمم کر لیا، اس امید کے ساتھ کہ اس موضوع پر کسی حد تک علمی باتیں جمع کر سکوں۔

مجھے اپنی کم علمی کا پورا احساس تھا اس لیے میں بار بار اپنے مشفق استاذ حضرت مولانا غلام مصطفی ازہری انعام صفی صاحب کی جانب رجوع کرتا، وہ ہر وقت میری رہنمائی فرماتے تھے، اس لیے میں پورے وثوق سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب میں جو مفید اور کار آمد باتیں درج ہو سکی ہیں وہ حضرت ازہری صاحب ہی کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہیں، حضرت کی عنایتیں مجھ پر مسلسل رہتی ہیں، میں ان کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

ساتھ ہی بے حد ممنون ہوں استاذ محترم حضرت مولانا ذیشان احمد مصباحی صاحب کا، آپ نے ناچیز پر کرم فرماتے ہوئے اس کتاب کا بغور جائزہ لیا، جگہ جگہ اصلاحات فرمائیں اور اس کی ترتیب و تصحیح میں اپنا قیمتی وقت دیا۔

میں سراپا منت شناس ہوں مخدوم گرامی حضرت مولانا حسن سعید صفوی کا جنھوں نے تمام تر مصروفیات کے باوجود اس کتاب کو پڑھا، مفید مشورے دیے اور پیش لفظ لکھ کر ہماری حوصلہ افزائی فرمائی، اللہ تبارک وتعالی ہمیں ان کے فیوض و برکات سے مالامال فرماتا رہے۔

اخیر میں اپنے رب کریم سے دعا گو ہوں کہ

خداوندا! میری اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرما اور اس کے قارئین کے لیے اس کو سامان ہدایت بنا۔ اگر یہ کاوش وجہ فتنہ بنے، اس سے تشدد پروان چڑھے یا تیرے بندے اس کے ذریعہ گمرہی خریدیں تو اس کو ان تک پہنچنے

سے پہلے پہلے نسیًا منسیاً بنا کر اپنی کائنات کے کسی گم نام گوشے میں ڈال دے اور اگر میرے قلم کی سیاہی سے گمرہی ٹپکے تو اس کو لکھتے وقت میرے قلم کی سیاہی خشک کردے۔

اے رب کریم! مجھ سے دین کا وہ کام لے جو تیری رضا کا داعی ہو اور تیرے بندوں کے لیے تیرے قرب کا ذریعہ بنے۔

اصغر علی مصباحی

مکتبۃ الاحسان، خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں

۲۱/ شوال المکرم ۱۴۳۸ھ/ ۱۶/ جولائی ۲۰۱۷ء

پیش لفظ

مولانا ابو سعد حسن صفوی

ولی عہد خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں

فقہی اختلاف امت کے لیے زحمت نہیں بلکہ رحمت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے فرمان عالی شان اِخْتِلَافُ أُمَّتِي رَحْمَة (میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔) میں اسی حقیقت کو واضح فرمایا ہے۔ خود عہد صحابہ، تابعین و تبع تابعین، ائمہ مجتہدین بلکہ ہر دور میں اصحاب علم کا علمی و فرعی اختلاف اس حقیقت پر شاہد عدل ہے۔ یہ اختلاف امت کے لیے یسر و آسانی کا نوید جاں فزا ہوتا ہے، اختلاف ہونا خلاف فطرت امر نہیں لیکن اختلاف کو قبول نہ کر کے مخالفت پر آمادہ ہونا یہ ضرور افسوسناک ہے۔

مسئلہ اقامت احکام فقہیہ کا ایک فرعی مسئلہ ہے۔ فقہائے احناف کے یہاں اس کی تین صورتیں ہیں:

۱- پہلی صورت یہ ہے کہ امام، صفوں کی طرف سے مسجد میں داخل ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ جس جس صف سے امام گزرتا جائے، اس صف کے لوگ کھڑے ہوتے جائیں۔

۲- دوسری صورت یہ ہے کہ امام، اقامت کے وقت محراب کی جانب سے مسجد میں داخل ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ سارے مقتدی امام کو دیکھتے ہی کھڑے ہو جائیں۔

۳- تیسری صورت یہ ہے کہ امام اقامت کے وقت مسجد میں موجود ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ امام اور مقتدی حی علی الصلاۃ/حی علی الفلاح پر کھڑے ہوں۔

فقہائے احناف کے مذکورہ بالا نظریات کے بشمول، دیگر مذاہب فقہیہ کے معتمد فقہا کے نظریات بھی تفصیل کے ساتھ دلائل وشواہد کی روشنی میں زیر نظر کتاب کی زینت ہیں۔ ان نظریات پر تفصیلی گفتگو سے صرف نظر کرتے ہوئے قارئین کی خدمت میں بس اتنا عرض ہے کہ اس پورے مسئلے کا غائرانہ مطالعہ ہمیں اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ اس مسئلے میں ہمیں آپس میں دست وگریباں ہونے کی کوئی ضرورت ہی نہیں کیوں کہ کیفیت و معمول کے مطابق تینوں صورتوں میں سے جس صورت پر بھی عمل کیا جائے جائز و درست ہے، رہا استحباب وعدم استحباب کا معاملہ تو یہ بھی صورت حال پر منحصر ہے۔ کسی ایک ہی شکل میں استحباب کو منحصر سمجھنا اصل مسئلہ سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔

زیر نظر کتاب کے مطالعے کے بعد مسئلہ مذکور کی ساری جہتیں آفتاب نیم روز کی طرح آشکارا ہو کر سامنے آجاتی ہیں، ساتھ ہی اسے شعار سنیت بتا کر آپس میں تفریق و انتشار کو ہوا دینے کی سعی نامحمود کی حقیقت بھی واشگاف ہو جاتی ہے۔ مسئلہ متذکرہ میں فقہائے احناف کے کسی بھی ایک نظریے پر عامل افراد پر سب وشتم، دشنام طرازی یا کردار کشی نہ صرف افسوس ناک ہے بلکہ شرم ناک بھی۔ یہ معاملہ اس وقت اور زیادہ حساس ہو جاتا ہے جب مسئلہ مذکورہ کے جملہ پہلوؤں سے ناواقف حضرات اس مسئلے کو شعار سنیت بنا کر خود اپنی ہی جماعت کے افراد پر طرح طرح سے الزام تراشی بلکہ اتہام و بہتان تراشی کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے اس مسئلے کے جملہ پہلوؤں سے واقفیت کس قدر ضروری ہے اسے بتانے کی ضرورت نہیں۔

خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد کا معمول بہا مسئلہ اقامت کے حوالے سے فقہائے احناف کے تین واضح نظریات میں سے دوسرا نظریہ ہے اور یہاں جو کیفیت ہے اس کے لحاظ سے شروع اقامت کے وقت ہی امام و مقتدی کا کھڑا ہونا فقہ حنفی کے نقطہ نظر سے مستحب ہے اور اس پر یہاں کے بزرگوں کا توارث بھی

ہے اوراس صورت پر عمل صرف اس خانقاہ ہی کا معمول نہیں ہے بلکہ اہل سنت کی بہت سی قدیم خانقاہوں کا بھی عمل وتوارث ہے جس پر صاحب کتاب نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کیا ہے کہ اس کے برعکس جہاں اقامت کے درمیان کھڑے ہونے کا معمول ہے وہ بھی اپنی جگہ درست ہے، البتہ کسی ایک صورت پر بے جا اصرار ضرور غلط ہے، زیادہ سے زیادہ یہ ایک ترجیحی مسئلہ ہے، لہٰذا جہاں جو صورت متحقق ہے اس کے لحاظ سے عمل کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ اس مقام کے لحاظ سے اسی صورت پر عمل مستحب ہے۔

زیر نظر کتاب "**مسئلۂ اذان و اقامت:ایک معتدل نظریہ**" کے مصنف عزیز گرامی مولانا اصغر علی مصباحی ہیں۔ مرشد گرامی حضور داعی اسلام کے دامن کرم سے وابستہ ہیں، ان کی ابتدائی تعلیم جامعہ عارفیہ میں ہوئی ہے، یہاں کے بعد جامعہ اشرفیہ مبارک پور سے بھی تحصیل علم اور سند فراغت حاصل کی ہے۔ پھر جامعہ عارفیہ کے شعبۂ دعوہ میں ایک سالہ تخصص کا کورس بھی کیا ہے۔ فی الحال جامعہ کی لائبریری اور تدریس کی خدمت پر مامور ہیں۔ وفاشعار، محنتی، جفاکش اور فرائض منصبی کی ادائیگی کے حوالے سے مخلص ہیں۔ خانقاہ کے تربیتی ماحول میں تعلیم وتربیت نے موصوف کی فکر میں اعتدال و میانہ روی کی جو روح پھونکی ہے، قارئین اس کتاب میں اس کی جھلک بجا طور پر محسوس کریں گے۔

موصوف نے نہایت سنجیدہ اور شائستہ اسلوب میں مسئلہ اذان و اقامت کے جملہ پہلوؤں کی تفہیم کی ہے، جذبات وتعصب سے اپنی تحریر کو یکسر پاک رکھا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انہوں نے مسئلہ متذکرہ کا علمی مطالعہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ علمی تحقیق کے منہج کو اپناتے ہوئے موصوف نے اصل ماخذ و مصادر سے براہ راست استفادہ کیا ہے، کتاب کے نام کا حسن انتخاب بھی موصوف کی اعتدال

پسندانہ روش کا غماز ہے۔ اللھم زدفزد

صاحب کتاب کے تحقیقی و علمی ذوق کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اقامت کے وقت حی علی الصلاۃ/حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کے سلسلے میں متاخرین فقہائے احناف کے موقف پر سب سے اہم دلیل صاحب مضمرات کی عبارت سے پیدا شدہ ایک اشتباہ کا بہت عمدہ علمی ازالہ کیا ہے اور مضمرات کے قلمی نسخے کو دریافت کر کے مسئلہ کی اصل حقیقت کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ کذا فی المضمرات کے ذریعے بعد کے فقہی کتابوں میں جس طرح سے ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کی کراہت کی بات کی گئی ہے، موصوف نے اس کی اصل حقیقت پیش کی ہے، دل چسپ بات یہ ہے کہ خود مضمرات میں صاحب مضمرات علامہ یوسف بن عمر صوفی (۸۳۲ھ) نے مسئلہ مذکور اور اس پر مستدل جس اثر کو دلیل کی بنیاد بنایا ہے خود اس اثر میں مسئلہ کی کون سی صورت اور شکل مذکور ہے اسے علمی اسلوب میں موصوف نے ایسا مدلل پیش کیا ہے جس سے اہل علم کے درمیان مذکورہ مسئلہ کی اصل حقیقت سامنے آجاتی ہے اور پیدا شدہ اشتباہ کا ازالہ ہو جاتا ہے، یہ حصہ خاص طور سے قابل مطالعہ ہے۔

اسی طرح اذان ثانی کے مسئلے میں داخل مسجد یا بیرون مسجد کے سلسلے میں سنت و توارث اور اہل علم کے درمیان علمی اختلاف کے تعلق سے صاحب کتاب نے جو علمی تطبیق اور رفع نزاع کی معتدل فکر پیش کی ہے وہ بھی قارئین کو خصوصی مطالعہ کی دعوت دیتی ہے، امید کی جاتی ہے کہ اس تطبیق کے بعد مسئلے کی بہتر تفہیم سامنے آئے گی اور اہل علم اس مسئلے کو اہل سنت کے درمیان نزاع و تفریق کے بجائے فقط ترجیح کے طور پر لیں گے اور ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرائی کی منفی روش سے باز آئیں گے۔

یہ کتاب اگرچہ ایک فرعی مسئلے میں معتدل راستے کی رہنمائی کرتی ہے، لیکن اس کے ساتھ اس کا علمی منہج اور اسلوب بیان ایسا ہے جو شاہ صفی اکیڈمی کی علمی اشاعتی

معیار کے موافق ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس علمی پیش کش کو بنظر تحسین دیکھیں گے۔

اخیر میں بس اتنا عرض کیا جانا ضروری ہے کہ چھوٹے چھوٹے اور فرعی و استحبابی مسائل پر دست و گریباں ہونا، سب و شتم کا بازار گرم کرنا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔ اہل سنت کی صفوں کو منتشر کرنے کی بجائے داخلی اتحاد کو مزید مضبوط کرنے کی طرف اپنی توجہ کو مرتکز کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے اصل حریف کون ہیں ؟اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اہل سنت اور اہل تصوف کے مخالفین کون لوگ ہیں جن کی کوششیں انسانیت کے لئے بھی آزار بنی ہوئی ہیں اور جو اسلام اور مسلمانوں کی رسوائی کا سامان فراہم کر رہے ہیں ،ان کو پہچاننے کی ضرورت ہے اور ان کے خلاف بہت ہی سنجیدہ علمی اور تنظیمی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم اپنی جماعتی قوت کو اپنے اصل حریف پر لگانے کی بجائے خود اپنی ہی جماعت میں غیر شعوری طور پر صرف کر رہے ہیں۔ اس فکر میں ہمیں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ جماعتی شیرازہ بندی کے خلاف کسی بھی سعی کو نامراد کرنے کی ضرورت ہے۔

دعا ہے کہ رب کریم ہمیں ہر طرح کی عصبیت اور نفسانیت سے محفوظ رکھے اور ہمیں ان کاموں میں اپنی قوت کو صرف کرنے کی توفیق دے جس میں اس کی رضا شامل ہو۔ آمین

فقیر ابو سعد حسن صفوی کان اللہ لہ
خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں
۱۸/ شوال المکرم ۱۴۳۸ھ/ ۱۳/ جولائی ۲۰۱۷ء

تقدیم

انعام صفی (غلام مصطفی ازہری)

استاذ جامعہ عارفیہ، سید سراواں

اجتہاد سے کسی کو بیر نہیں، تقلید سے کوئی آزاد نہیں

(۱)

اجتہاد و تقلید انسانی زندگی کا حصہ ہے۔ دنیا کا ہر شخص کبھی کسی مسئلہ میں اجتہاد کرتا ہے تو دوسرے مسئلہ میں تقلید کرتا ہے۔ اس اجتہاد و تقلید کی زنجیر سے کوئی بھی آزاد نہیں۔ کبھی چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ میں بھی تقلید کی زنجیروں سے آزاد نہیں ہوتا اور کبھی بڑے سے بڑے مسئلہ میں اجتہاد و تفقہ کرنے سے اضطراب کا شکار نہیں ہوتا۔

ہم رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو دیکھیں تو کبھی آپ کسی مسئلہ کے لئے وحی کا مہینوں انتظار فرماتے، کبھی فوراً حکم صادر فرماتے۔ اللہ تعالیٰ کبھی اس حکم کی تائید فرماتا اور قول رسول کی نافرمانی کرنے والوں سے تہدید آمیز کلام فرماتا، کبھی سکوت اختیار کر کے تائید و توثیق فرماتا اور کبھی اس اجتہاد کے بارے میں فرماتا: لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (انفال:۶۸) اگر اللہ کا فیصلہ پہلے نہ ہو چکا ہوتا تو اے مسلمانو! تم نے جو بدر کے مشرک قیدیوں سے رہائی کے بدلے مال لے لیا ہے، اس کی وجہ سے تم پر بڑا عذاب ہوتا۔

(۲)

عمر فاروق مستجاب دعائے رسول، ملہم و محدّث اور ترجمان قرآن ہیں، آپ کی رائے پر وحی کا نزول ہوتا ہے۔ لیکن ایک موقع پر حب رسول میں ایسا محو ہوئے کہ بشریت مصطفیٰ آپ کی نگاہ سے محو ہوگئی اور وفات رسول کا انکار کر بیٹھے۔ حضرت ابوبکر نے انہیں جذب سے سلوک کی طرف لوٹانے کے لئے، غلبہ عشق سے نکالنے کے لیے وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ [آل عمران:۱۴۴] کی تلاوت کی۔ یہ وہی عمر ہیں جنہوں نے حضرت ابوبکر کے دور خلافت کے بہت سارے فیصلے بدل ڈالے، بلکہ فرمانِ رسول اعظم اور نصوص محکمہ کی تاویل کر کے امت کی آسانی کے لیے اپنے اجتہاد سے نئی نئی راہیں کھولیں۔ ان کے تفردات کی بہت ساری مثالیں ہیں جن میں بیشتر پر آج بھی عمل ہو رہا ہے اور بعض وہ بھی مسائل ہیں جن کو حضرت عثمان وسیدنا علی رضی اللہ عنہما کے عہد خلافت ہی میں بدل دیا گیا تھا۔

گویا عہد رسالت ہو یا عہد خلافت، اجتہاد و تقلید سے آزاد نہیں رہا۔

(۳)

کوفہ مسلمانوں کا آباد کیا ہوا، بصرہ کے بعد دوسرا شہر ہے، نجف سے دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ ابن مسعود کو کوفہ والوں کے لئے معلم اور امیر کوفہ حضرت عمار بن یاسر کا وزیر بنا کر بھیجا۔ اہل کوفہ کو ان کی پیروی کا یہ کہہ کر حکم فرمایا کہ اے اہل کوفہ! اہل مدینہ عبداللہ بن مسعود کے زیادہ محتاج تھے لیکن ہم نے تمھارے لئے عبداللہ ابن مسعود کو ایثار کر دیا ہے، تم ان کی پیروی کرو اور ان کی بات مانو۔

کوفہ والوں پر حضرت عبد اللہ ابن مسعود کے فتاوی پر عمل کرنا واجب تھا؛ کیوں کہ آپ خلیفۂ راشد کی طرف سے دینی امور کے معلم بنا کر بھیجے گئے تھے۔ حضرت عثمان کے ابتدائی عہد تک آپ وہیں رہے۔

یہی کوفہ ہے جس کو سیدنا علی نے اپنی خلافت میں اسلامی دارالسلطنت مقرر فرمایا۔

کوفہ کا فقہ و اجتہاد عموماً ان ہی دونوں سادات صحابہ کے فتاوی و فرمودات پر چلتا رہا۔ جو بھی یہاں آیا اکثر مسائل میں اس نے اپنے ماقبل کی پیروی کی۔ اس طرح یہاں کا مسلکِ فقہ، حضرت ابراہیم نخعی اور حضرت حماد سے ہوتا ہوا حضرت ابو حنیفہ کے سپرد ہوا۔

فقہائے احناف، شیوخ واساتذہ، مدونین و شارحین سب نے اپنے اسلاف کی پیروی کی۔ کہیں پیش رو سے اختلاف کیا تو کہیں اکابر کے مقابل اصاغر کے اقوال کو راجح و مفتی بہ قرار دیا۔

حضرت ابو حنیفہ نے چند مسائل میں حضرت عبد اللہ ابن مسعود کے قول کو چھوڑ دیا، کچھ مسائل میں حضرت ابراہیم نخعی اور حضرت حماد کے فتاوی کو مرجوح تسلیم کیا، اسی طرح ان کے شاگرد بھی کبھی ایک دوسرے کے خلاف احکام جاری کرتے رہے، لیکن اکثر مسائل میں تقلید ہی کی راہ اپنائی۔

حاصل یہ کہ فقہ حنفی، شخصی فکر سے معرض وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ اجتماعی فکر کا نتیجہ ہے۔ آپ فقہائے احناف میں سے جن کو جو لقب یا جو منصب عطا کر دیں، لیکن ان میں کوئی بھی صد فی صد مقتدا نہیں اور نہ ہی مقلد محض ہے۔ تقلید محضیت فکر طفلانہ یا بسببِ جہالت ہے۔

(۴)

ہم اہل حدیث ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب ہم تک پہنچ رہا ہے!

ہمیں تقلید کی حاجت نہیں۔ تقلید تو جہالت ہے۔ حماقت و سفاہت ہے!!

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ہی بارے میں فرمایا: نَضَّرَ اللهُ

امْرءًا سَمِعَ مَقَالَتِي فَوَعَاهَا وَحَفِظَهَا وَبَلَّغَهَا[1] اللہ تعالیٰ اس شخص کو تروتازہ اور خوش رکھے جس نے مجھ سے کوئی بات سنی، پھر اس نے اسے جیسا مجھ سے سنا تھا ویسے ہی اسے محفوظ رکھا اور دوسروں تک پہنچادیا۔

جی آپ صحیح فرمارہے ہیں۔ہاں! آپ ہی لوگ ہیں جو سب سے زیادہ تقلید کے شکار ہیں اور فقہ حدیث سے بیزار ہیں؛ کیوں کہ صحت حدیث کے لیے ہر راوی کا ثقہ وعادل ہونا ضروری ہے اور عدالت کے ثبوت کے لئے معدل وجارح کے اخبار واجتہاد پر اعتماد کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں؛ کیوں کہ کسی بھی راوی کی ثقاہت وعدم ثقاہت کا فیصلہ اس کے زمانے کے معتمد و متبحر علما کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا، جب صحت حدیث کا ہی دارومدار تقلید پر ہے تو متن حدیث کا فہم تقلید سے آزاد کیوں کر ہوسکتا ہے؟

اسی حدیث کے آخری جملے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ۔ بسا اوقات بلاواسطہ نبی سے سننے والے سے فقاہت میں وہ شخص بہتر ہوسکتا ہے جس تک عہد رسالت کے بعد حدیث پہنچ رہی ہے۔ گویا حضور نے فرمادیا کہ فہم وفقہ میں اضافہ کا تسلسل قیامت تک رہے گا۔ میری امت کی مثال بارش کے قطرے کی طرح ہے، نہیں معلوم اس کا اول بہتر ہے یا آخر۔ مَثَلُ أُمَّتِي مَثَلُ الْمَطَرِ لاَ يُدْرَى أَوَّلُهُ خَيْرٌ أَمْ آخِرُهُ[2]

یہ بات صاف ہے کہ معاصر اہل حدیث یا تو کتاب وسنت کے عرفان وتفقہ سے آزاد ہیں- یا تحقیق کے نام پر تقلید جامد کا شکار ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ اہل حدیث علما متن وسند ہر ایک میں اپنے سابق علما کی تحقیق کے پابند ہیں۔ چند ایک مسائل کو چھوڑ کر حنبلی مسلک کی پابندی کرتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ان کے عوام بھی اپنے آپ کو اہل حدیث یا سلفی کہتے نہیں

([1]) سنن الترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی الحث علی تبلیغ السماع، ح:۲۶۵۸)
([2]) سنن الترمذی، کتاب الامثال عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ح:۲۸۶۹)

تھکتے۔اور حال یہ ہے کہ اپنے معاصر علما کے زیرو زبراور نقطے سے بھی اختلاف کو برداشت نہیں کرتے۔اختلاف کرنے والوں پر سیدھے بدعتی، کافراور مشرک ہونے کا فتویٰ لگادیتے ہیں۔

(۵)

تصوف کی ابتدا تقلید سے ہوتی ہے۔مرید اپنے شیخ کا پابند ہوتا ہے،ایسے ہی جیسے بیٹا اپنے باپ کا پابند ہوتا ہے۔اسے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ میرا باپ اپنے باپ کا پابند ہے بھی کہ نہیں۔باپ کا مسلک حنفی ہے کہ شافعی، اس کا مشرب قادری ہے یا چشتی، وہ محض اپنے باپ کا پابند ہوتا ہے کہ اسے اس کے علاوہ کسی مسلک سے سروکار نہیں ہوتا۔اسے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا مسلک افضل واعلیٰ ہے کہ مرجوح وباطل،اس کا مشرب نہر ہے کہ سمندر۔وہ مست ہوکر چلتا رہتا ہے، چشمۂ صافی نوش کرتا رہتا ہے۔جب وہ بالغ ہوتا ہے، تمام اخلاق حسنہ سے خود کو مزین پاتا ہے، خصائل رذیلہ سے اس کا ذہن وفکر اور قلب وجگر پاک ہوتا ہے۔وہ لطف خداوندی اور قرب سرمدی کے لائق ہوچکا ہوتا ہے۔

اب اسے کون سمجھا سکتا ہے کہ اس کا مسلک مفضول مسلک تھا،اس کا مشرب نہر تھا،اور اب تک تم جہالت کے وادی میں بھٹک رہے ہو، شور وشغب کرنے والے اس سے کہتے ہیں: آنکھیں کھولو۔وہ اپنی مستی سے باہر نہیں آنا چاہتا،لیکن جب کبھی وہ آنکھیں کھولے گا تو اپنے آپ کو در نبی پر پائے گا۔شیخ اپنا کام کرکے غائب ہوچکا ہوتا ہے۔ اب مسلک اس کا مسلک ہوتا ہے۔اور مشرب وپنگھٹ اس کے نام سے جانا جاتا ہے۔

یہ جواں شیخ جب اس مرحلے میں داخل ہوچکا ہوتا ہے تو لوگوں کے اعمال کی تصحیح کی طرف توجہ دیتا ہے۔بعض ارباب عقل وفتویٰ کو معترض پاتا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ اے جوان !تمھارا کردار سنت کے مطابق نہیں ہے۔تمھارے اعمال مسلک رائجہ کے

پابند نہیں ہیں۔

جواں شیخ، در رسول پر جبیں سائی کرنے والا شیخ، خواب گاہ میں بھی بیدار شیخ، غفلت تو دور، غفلت کے خوف سے بھی مضطرب ہونے والا شیخ، سوچتا ہے کہ میرا شیخ جس نے مجھے دربار الٰہی کا پابند بنایا، در رسول تک پہنچایا، اس کا مسلک ہی میرے لئے سب سے افضل مسلک ہے، لیکن یہ قوم جو ہماری مخاطب ہے اور جس کی دعوت ہمارے ذمہ ہے اس کی تفہیم کے لیے تحقیق کا لبادہ اوڑھنا ہوگا جیسے امام ابو حنیفہ نے مسلک کوفہ، مسلک عبداللہ ابن مسعود و مسلک سیدنا علی کو تحقیق سے ثابت کیا۔ یہ جواں شیخ بھی جو حقیقت میں مقلد محض ہے، اپنے شیخ کا نام لیے بغیر تحقیق کا عنوان قائم کرتا ہے اور اپنے شیخ کے مسلک کی تائید و توثیق میں لگ جاتا ہے۔ کبھی یہ جواں شیخ کسی مفتی کی طرح اسباب ستہ (ضرورت، حاجت، عموم بلویٰ، عرف و تعامل، دینی مصلحت، ازالۂ فساد) کو بنیاد بنا کر مفتی بہ قول سے اعراض کرتا ہے، اپنے شیخ کی تردید کیے بغیر یا تو مسلک شیخ سے محض اعراض کرتا ہے، اس مسلکی دلدل سے لوگوں کو نکالنے کے لیے مَنْ سَکَتَ نَجَا پر عمل کرتا ہے اور کبھی کہتا ہے کہ ع

نہ ایں کار می کنم نہ انکار می کنم

گویا صوفی کا مشرب و مسلک اپنے شیخ کا پابند ہے۔ جو شیخ ہوتا ہے اپنے پیش رو کی اقتدا کرتا ہے۔ ان میں جو محقق ہوتے ہیں وہ بعض مسائل میں تغیر و تبدل اور بعض مشربی احکام کو ترک کر کے داد اجتہاد دیتے ہیں اور اپنے خانقاہی مشرب کو نئے رنگ و آہنگ سے آراستہ کرتے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ محدث، فقیہ اور صوفی میں سے ہر ایک اپنے اسلاف کی تقلید ہی کرتا ہے، اس کے ساتھ ہی بعض مسائل میں اپنے مقتدا و سلف سے الگ موقف اختیار کرتا رہتا ہے۔ اس طرح نئے نئے مسالک، مشارب اور مکاتب معرض وجود میں آئے، کچھ پرانے نام کے پابند رہے، کچھ نے نام بھی بدل دیا۔ کسی نے حنفیت

کے نام پر اجتہاد کیا اور کسی نے تحقیق واجتہاد کے نام پر بھی تقلید ہی کی۔

(۶)

یہ بات بھی صحیح ہے کہ ہر دور میں امت کے اندر ایک ایسی جماعت رہی ہے، جس کو ابتداً ہم مغلوب کہہ سکتے ہیں، جنھوں نے امت کے کسی ایک فرد کے ہر ہر فتوے کو آنکھ بند کر کے تسلیم کرنا اپنے اوپر لازم کر لیا، اور اس کے کسی بھی قول وفعل سے انحراف کو کفر وضلالت تصور کیا۔ ایسے لوگ صوفیہ میں بھی بہت زیادہ پائے گئے ہیں، کیوں کہ صوفیہ کے یہاں اپنے شیخ کو مرحلۂ سلوک اور مقامِ عرفان میں کالنبی تصور کیا جاتا رہا ہے، میں نے بڑے بڑے محقق مشائخ کو دیکھا ہے کہ انھوں نے اپنے شیخ یا سلسلے کے مشائخ کی بات کو بظاہر اصول دین سے متصادم ہی کیوں نہ ہو بلا کسی تامل کے نقل کیا ہے، فقہا کے یہاں بھی اس طرح کے مقلدین کی کمی نہیں رہی ہے۔ بہت سارے ایسے علماے ربانیین ہیں جنھوں نے اپنے ہی شرح صدر کے خلاف اپنے امام کے فتوے پر یہ کہتے ہوئے عمل کر لیا ہے کہ ان کے پاس اس سلسلے میں کوئی دلیل رہی ہو گی۔ اسی طرح محدثین کے یہاں علل کے تعین میں تقلید محضیت کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا ہے جیسا کہ اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ مغلوبین اپنی نیت واخلاص کی بنیاد پر ضرور ثواب پائیں گے لیکن جب مغلوبین کی پیروی میں غلو شروع ہو جاتا ہے تو بات جا کر ضلالت ہی پر رکتی ہے، یعنی ایک شخص تقلید کے دائرے کو اپنی ذات سے نکال کر امت مسلمہ کے ہر فرد پر نافذ کرنا چاہتا ہے، یہاں تک کہ ایک کہتا ہے کہ جو حنبلی نہیں وہ مسلمان نہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ سلفی اور اہل حدیث کے علاوہ سب کافر ومشرک ہیں۔ اسی طرح غالی مریدین یہ کہتے ہیں کہ جو میرے شیخ یا سلسلے کا مرید نہیں وہ صوفی نہیں! میرے مسلک سے نہیں تو گمراہ اور بددین ہے! بلکہ دو قدم آگے بڑھ کر کوئی زندیق، ملحد و کافر بھی کہہ دیتا ہے!! العیاذ باللہ

اللہ کا احسان ہے اس امت پر کہ اس نے اس طرح کی گمراہیوں کے قلع قمع کرنے کے لئے علمائے ربانیین کی ایک جماعت کو ہر زمانے میں حق پر قائم رکھا اور انھوں نے اس طرح کے گمراہ کن عقائد سے امت کی حفاظت وصیانت کے لیے تگ و دو میں کوئی کمی نہیں کی۔

(۷)

مذموم اختلاف کون سا ہے؟ اب تک کی گفتگو سے واضح ہوگیا کہ تینوں مقتدا گروہ؛ محدثین، فقہا اور صوفیہ میں سے کوئی بھی تقلید سے آزاد نہیں ہے۔ اسی طرح بعض مسائل میں تفردات سے بھی کوئی جماعت بری نہیں ہے۔ ہر گروہ میں ایسے فتاوے اور احکام مل جائیں گے جو ان کے سلف یا جمہور سے الگ ہیں، لیکن اس کے باوجود سب نے ایک دوسرے کا احترام کیا ہے، فرقہ بندی اور مسلکی تشدد کو کبھی بھی ہوا نہیں دی گئی۔ ہر جماعت نے امت کے لیے کام کیا ہے۔ تفرقہ بازی اور فتنہ پروری، تصور امت کو خاکستر کرنے والی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ١ؕ وَ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (آل عمران:۱۰۵)

تم لوگ ان کی طرح مت ہوجاؤ، جنھوں نے واضح احکام پہنچ جانے کے بعد بھی باہم تفرقہ اور اختلاف کرلیا، ایسے ہی لوگوں کے لیے سخت سزا ہے۔

"مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ" کی قید سے واضح ہے کہ اختلاف مطلقاً مذموم نہیں ہے، بلکہ صرف وہی اختلاف مذموم و ناپسندیدہ ہے جو واضح اور محکم دلائل کے بعد کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسا اختلاف یا تو اصول میں ہوگا؛ کیوں کہ سارے اصول محکم و مبین ہیں یا اختلاف ان فروع میں ہوگا جن کے دلائل واضح ہوجائیں یا دوسرے لفظوں میں جن پر امت نے اتفاق کرلیا ہو۔

اس سے واضح ہوگیا کہ اصول مبینہ اور فروع واضحۃ الدلائل یا متفقہ میں

اختلاف آیت بالا کی روشنی میں مذموم اور ممنوع ہوگا؛ کیوں کہ ایسا اختلاف عموماً محض نفسانی ہوتا ہے لیکن ان فروع میں اختلاف جن کے دلائل ہی ابھی تک واضح نہیں ہیں، چاہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اس بارے میں کوئی نص ہی نہ آئی ہو، یا نص ہے مگر اس سے متعارض ایک دوسری نص بھی ہو، جن میں وجہ تطبیق صریح اور واضح نہ ہو، تو اس قسم کی فروعات میں اختلاف ظاہر ہے کہ وضوح بینات سے پہلے کا ہوگا، اس لیے ایسا اختلاف مذموم بھی نہیں ہوگا۔ یہی وہ اجتہادی اختلاف ہوگا جو اتحاد اصول کے ساتھ محض فروعاتی ہوگا اور بہ مجبوری ہوگا اور اسی اختلاف کو رحمت واسعہ کہا گیا ہے، جس میں خطا پر بھی اجر کا وعدہ دیا گیا ہے۔ لہٰذا ایسے اختلاف کی مشروعیت حدیث و قرآن کریم اور اقوال و اعمال اسلاف سے ثابت ہے۔

جب اجتہاد مشروع ہے، ایسے میں اجتہادی اختلاف بھی شرعی اور مطلوب شرعی ہی ہوگا لہٰذا علمائے محدثین، ائمہ فقہا اور مشائخ صوفیہ کے اجتہادات سے اختلافات کا ظہور قابل ملامت نہیں ہوسکتا اور نہ ہی ایسے مسائل کی تدوین و تحقیق ہی قابل مذمت و طعن ہوسکتی ہے۔

تفردات اور خانقاہ عارفیہ

(۱)

داعی اسلام شیخ ابو سعید شاہ احسان اللہ محمدی اکابر صوفیہ کی ایک زندہ مثال ہیں۔ میرا قلبی وجدان کہتا ہے کہ آپ کی ذات گرامی مجتہدین صوفیہ کی صف اول کی نمائندہ شخصیات میں شامل ہے۔ آپ ایک مجذوب سالک بزرگ ہیں۔ روحانی و عرفانی ماحول میں پیدا ہوئے۔ آپ نے صفوی آنگن میں آنکھیں کھولیں۔ جذب و سلوک ورثے میں ملا۔ آپ نے کسی مولوی یا مدرسہ سے باضابطہ ظاہری علوم حاصل نہیں کیے۔ آپ کو ہر وہ عمل اختیار کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا جس کے بارے میں

یہ یقین ہوجاتا ہے کہ وہ حضرات مشائخ کا طریقہ و معمول رہا ہے۔ اسی طرح آپ نے صوفیہ کے کسی اعتقاد سے سر مو انحراف نہیں کیا۔ اور کر بھی نہیں سکتے کیوں کہ جب قلب و قالب ایک ہوجاتا ہے تو تصور انحراف کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔

(۲)

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست

سخن شناس نہ ای دلبرا خطا این جاست

علوم صوفیہ، احوال و مقامات ہیں۔ ان احوال و مقامات سے جو واقف نہیں ہیں، وہ ان کے ان خاص علوم کا انکار کردیتے ہیں۔ اگرچہ ان کے اس انکار سے ان کے ایمان و عقیدہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسے علوم ہر دور میں بعض لوگوں کو ہی حاصل رہے ہیں۔ صوفیہ نے ان علوم کی تعبیر اشاراتی زبان میں کی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں دو طرح کا علم عطا فرمایا؛ ایک وہ ہے جس کو میں تم لوگوں سے بیان کرتا ہوں، دوسرا وہ ہے کہ اگر میں اسے بیان کروں تو تم لوگ مجھے قتل کردو گے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: حَفِظْتُ مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وِعَاءَيْنِ: فَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ، وَأَمَّا الآخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهُ قُطِعَ هَذَا البُلْعُومُ[1]

اس روایت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بعض صحابہ کے پاس ایسے خاص علوم بھی تھے کہ عام تابعین بھی ان علوم کے متحمل نہیں تھے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس عہد آشفتہ میں ہر عام پڑھا لکھا آدمی ان احوال و معارف کا اہل ہوپائے۔

اسی لیے صوفیہ نے اپنے خاص علوم کو اپنے خاص لوگوں سے بھی اشارات میں ہی بیان کیا ہے؛ کیوں کہ ہر علم اور ہر مسئلہ کے الگ الگ خاص لوگ ہوتے ہیں۔

([1]) صحیح البخاری، کتاب العلم، باب حفظ العلم (ح:۱۲۰)

ایک علم ایک شخص کے لیے عام ہوتا ہے تو دوسرے کے لیے خاص۔ کوئی مسئلہ کسی کے فہم میں ابتداءاً ہی سما جاتا ہے تو کسی کا ذہن برسوں قبول نہیں کر پاتا۔

صوفیہ نے اپنے لوگوں سے بھی اشارات ہی کی زبان میں بات کی تاکہ تاویل وتفہیم اور تفسیر وتوضی ح کی گنجائش باقی رہے، وسوسہ وشک کی صورت میں کوئی مرید صادق انکار کی راہ اختیار نہ کر پائے۔

(۳)

دوزخ اور عقیدہ آخرت سے متعلق ایک مسئلہ تھا۔ داعی اسلام نے کسی دوسرے مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے اس کی طرف اشارہ فرمایا۔ اس اشارہ سے اس فقیر راقم السطور نے ایک نتیجہ اخذ کیا اور داعی اسلام کے خاص لوگوں سے بیان کیا۔ کچھ لوگوں نے انکار کر دیا، کچھ نے تاویل کی، اکثر نے اس مسئلہ کو میرے ہفوات سے شمار کیا۔ بات آئی گئی۔ پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ میں نے ابن عربی اور دیگر اکابر صوفیہ کے حوالے سے اسی مسئلے کو بیان کیا۔ اب بات لوگوں نے بغور سنی اور ان کی سمجھ میں بھی آنے لگی۔

بعض ایسے مسائل بھی گزرے ہیں جن کو سمجھنے میں مجھے بھی ایک زمانہ لگ گیا اور آج بھی بہت سارے ایسے مسائل ہیں جن کو شرح صدر کے ساتھ میں نہیں سمجھ پاتا، حالاں کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ اعتقاد صوفیہ میں عام ہے۔ ان میں وہ مسائل بھی ہیں جن کے بارے میں میرا اپنا گمان ہے کہ ان مسائل کے فہم وترجیح میں حق، صوفیہ پر مشتبہ ہو گیا ہے۔ بعض وہ مسائل بھی ہیں جن میں میں نے اپنے آپ کو تنہا پایا، بعد میں مطالعہ کے درمیان معلوم ہوا کہ کئی اکابر صوفیہ بھی ادھر گئے ہیں، اگرچہ یہ مسئلہ عام صوفیہ کی ترجیح کے خلاف رہا ہے۔

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں

یہ تو اعتقاد کا مسئلہ رہا، جو حالِ قلب سے ہوتے ہوئے سرالسر تک پہنچتا ہے اور جو شخص ظاہر بینی اور عقل پرستی سے آگے نہ بڑھ سکا، اسے اس سے کیا سروکار۔ ان کے لیے تو یہ "الٓمّٓ" کی طرح ہے، جہاں سے " ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ " کہتے ہوئے گزر جانے میں ہی ان کے حق میں سلامتی ایمان اور ذریعہ نجات ہے۔

اعمال اور احکام ظاہری کا حال بھی کچھ اسی طرح ہے۔ ہر خانقاہ، ہر سلسلہ اور ہر شیخ کا اپنا مشرب اور منہج ہوتا ہے، اسی لیے بعض مسائل فقہیہ میں بھی ایک شیخ دوسرے شیخ سے یا عام فقہی مذہب سے جدا مذہب اختیار کرتا ہے۔ جس شیخ کو اس سلسلے کے اکابر میں شمار کر لیا جاتا ہے، تو کوئی کم ہی ہمت کر پاتا ہے کہ اس سے جدا روش اختیار کرے، ہاں! اگر کوئی علوی قلب اور عمری قالب ہو تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے؛ کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ علیم بالذات تو صرف اللہ ہے۔ اگر وہ چاہتا ہے تو شجر میں گویائی عطا کر کے حضرت موسیٰ پر تجلی فرماتا ہے اور جب چاہتا ہے تو رسول اعظم بھی انتظار وحی میں مہینوں گزار دیتے ہیں۔

وہ ہر باطن سے باطن ہے، وہ ہر ظاہر سے ظاہر
کوئی دیکھے تو یہ منظر، سوا اُس کے نہیں کوئی

(۴)

خانقاہ عالیہ عارفیہ، سلسلہ صفویہ کی ایک شاخ ہے۔ سلسلہ صفویہ مینائیہ تین سلاسل کا مجموعہ ہے: (۱) چشتیہ (۲) سہروردیہ (۳) قادریہ

اس سلسلے میں چشتیہ رنگ غالب ہے لیکن مسائل فقہیہ اور اوراد و وظائف زیادہ تر سہروردیہ سے ماخوذ ہیں۔

بعض مسائل فقہیہ ان دونوں سلسلے کا معمول رہا ہے جیسے سماع بالمزامیر، طلوع فجر کے بعد بھی دو رکعت تہجد کا جواز، غائب کی نماز جنازہ، سری نمازوں میں قراءت

فاتحہ خلف امام وغیرہ

حضرت داعی اسلام، شروع سے ہی ٹرین پر نماز ادا کرتے رہے ہیں؛ کیوں کہ انھوں نے اپنے پیر و مرشد کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا تھا، جب کہ ہندو پاک کے علما میں شروع سے ہی اس مسئلے میں کافی اختلاف پایا جاتا تھا۔ اس وقت بھی ایک جماعت ٹرین پر ادا کی جانے والی نمازوں کے اعادہ کا ہی حکم دیتی ہے۔

حضرت داعی اسلام فرماتے ہیں کہ ہمارے مشائخ سے وتر کے بعد دو رکعت نفل بیٹھ کر ہی ادا کرنے کی روایت چلی آ رہی ہے۔

تمام سلاسل میں ایسی چیزیں مل جائیں گی جو کابراً عن کابرٍ چلتی آ رہی ہیں۔ ان مسائل میں بعض وہ ہیں جن میں شروع ہی سے جواز و عدم جواز اور استحباب و کراہت میں اختلاف چلا آ رہا ہے۔ کسی نے ایک کو ترجیح دی تو کسی نے دوسرے کو۔ بعض وہ مسائل بھی ہیں جو سنت سے ثابت ہیں لیکن کسی فقیہ نے اس سنت کو اس طور سے نہیں دیکھا جس طرح ایک صوفی دیکھتا ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھیے:

ہم نے بیان کیا کہ ہمارے سلسلے میں وتر کے بعد والی دو رکعت نفل نماز بیٹھ کر ہی ادا کی جاتی رہی ہے، جب کہ حدیث میں ہے کہ بیٹھ کر ادا کی جانے والی نماز کا ثواب کھڑے ہو کر ادا کی جانے والی سے کم ہوتا ہے۔ طحاوی شریف کا مطالعہ کرتے وقت حضرت عائشہ کی یہ روایت گزری کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اخیر عمر میں کمزوری کی وجہ سے جب وتر کے بعد دو رکعت ادا کرتے تو بیٹھ کر ہی ادا کرتے، جب کہ عام روایات کے مطابق ان دو رکعتوں کو وتر سے پہلے ہی ادا کر لیتے، یعنی عموماً آپ وتر اور قیام اللیل ۹/ رکعت ہی ادا کرتے تو ۶/ اور ۳/ سب کھڑے ہو کر ہی ادا فرماتے اور اخیر عمر میں چار پھر تین کھڑے ہو کر ادا کرتے، اس کے بعد دو بیٹھ کر ادا فرماتے۔ گویا کہ اب بھی ۹/ ہی ادا کرتے جن میں فرض کے ساتھ ساری رکعت کھڑے ہو کر ہی ادا فرماتے، صرف دو رکعت ہی بیٹھ کر ادا فرماتے، وہ بھی اس دو رکعت کو وتر کے بعد ادا فرماتے۔

حنفیہ نے عشا کے بعد نمازوں کی تعداد تو یہی رکھی لیکن بیٹھ کر ادا کرنے کو ضعف و عمر پر محمول کر لیا، جب کہ صوفیہ کہتے ہیں کہ جس نبی نے فرض اور سنت و نفل کی تمام رکعتیں کھڑے ہو کر ادا کر لیں تو وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر ادا کیوں کیں؟ اس میں ضرور کوئی راز اور سِر ہے، جس کو اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں، لیکن ہم ظاہر کو ہی اختیار کریں گے، جیسے رسول اللہ ﷺ نے ادا کیا ہم بھی بلا تاویل اسی طرح ادا کریں گے۔

ان تمام باتوں سے واضح ہو گیا کہ علما ہوں یا صوفیہ، مدارس ہوں یا خانقاہیں، بعض مسائل میں تفردات ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ پریشانی اس وقت شروع ہوتی ہے جب ہم کسی ایک مسئلہ کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور اصول دین میں بلکہ اکثر فروع در فروع میں بھی تمام اتفاقات کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ اس ایک فرعی مسئلہ کی وجہ سے حمیت اسلامی رخصت ہو جاتی ہے، علیک سلیک بند ہو جاتا ہے اور اس سے بھی طبیعت نہ بھرے تو ایک دوسرے کو فسق و گمرہی سے منسوب کر دیتے ہیں، بلکہ تکفیر تک کا حکم لگانے سے گریز نہیں کرتے۔ العیاذ باللہ

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

ماضی میں بھی اختلافات موجود تھے۔ ہم نے اب تک جتنے مسائل ذکر کیے وہ سب پرانے ہی ہیں اور اختلاف بھی پرانا ہے، لیکن عام طور سے سلف صالحین، علمائے ربانیین اور صوفیہ کاملین ان مسائل فرعیہ فقہیہ یا مراسم صوفیہ کی وجہ سے آپس میں دست و گریباں نہیں ہوئے؛ کیوں کہ سب کا مطلوب ایک تھا کہ صالحین ایمان و عرفان کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجات حاصل کر لیں، عام مسلمان فسق و فجور میں مبتلا نہ ہوں، فرائض و واجبات ادا کریں، آپسی بھائی چارگی سے ایک صالح معاشرہ تشکیل پائے، دنیا کے گوشے

گوشے تک اسلام کی روشنی پھیل جائے اور غیر بھی اسلام کے امن پسند پیغام کو سمجھیں۔

"مسئلہ اذان واقامت-ایک معتدل نظریہ"

(۱)

سلطان العارفین حضرت مخدوم شاہ عارف صفی محمدی صفوی قدس اللہ سرہ (۱۳۲۰ھ/۱۹۰۳ء) کو خرقۂ اجازت وخلافت، واقف سرّ قل ھواللہ شاہ عبدالغفور محمدی بارہ بنکوی (۱۳۲۴ھ) سے حاصل تھا، جو مخدوم شاہ محمد خادم صفی محمدی صفی پوری (۱۲۷۸ھ) کے مرید وخلیفہ تھے۔

حضرت مخدوم شاہ عارف صفی محمدی نے اپنے آبائی وطن سید سراواں میں دعوت وتبلیغ اور محبین کی روحانی تربیت کے لیے ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء میں خانقاہ عالیہ عارفیہ کی بنیاد رکھی۔ آپ نے اپنی خانقاہ میں اپنے شیخ کی تعلیمات کو رائج کیا، مراسم خانقاہ ہوں کہ اوراد وظائف، محفل وجد وسماع ہو کہ محفل وعظ، طرز زندگی ہو کہ طرز تربیت، سب میں آپ ہو بہو واقف سر قل ھواللہ تھے۔

اٹھا عجب تضاد سے انسان کا خمیر
عادی فنا کا تھا تو پجاری بقا کا تھا
اس رشتۂ لطیف کے اسرار کیا کھلیں
تو سامنے تھا اور تصور خدا کا تھا

(احمد ندیم قاسمی)

(۲)

زیر بحث مسئلہ اذان واقامت ایک فرعی مسئلہ ہے۔ یہ ان مسائل میں سے ہے جن کا ذکر احادیث کی کتابوں میں، احوال رسول اور عادات صحابہ بیان کرنے کے

لیے ہوا ہے، نہ کہ دین کے ایک رکن اور اساس کی حیثیت سے حکایت کی گئی ہے۔ اسی لیے مجتہدین نے ان مسائل کو اصول کا درجہ نہیں دیا۔ بعض نے تو اہم کتب متون میں اس کا ذکر بھی نہیں کیا۔ احوال زمانہ کے اعتبار سے ان مسائل کی عملی نوعیت بھی بدلتی رہی، لیکن علماے سلف نے کبھی بھی شدت کے ساتھ اس سے تعارض نہیں کیا۔

لیکن متاخرین کی کیا پوچھیں، انھیں تو ہر فرعی مسئلہ اساسی معلوم ہوتا ہے اور اساسی غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس کی فکر کم ہی لوگوں کو رہتی ہے کہ نماز میں اتنے کم لوگ کیوں شریک ہوئے؟ لیکن اس کی فکر زیادہ رہتی ہے کہ جو جماعت کے ساتھ نماز ادا کر رہا ہے وہ میری طرح سنی بریلوی ہے کہ نہیں، اور اس کی پہچان صرف یہ ہے کہ وہ اقامت کے وقت کب کھڑا ہو رہا ہے؟ پوری نماز میں اللہ کو یاد کرنے کی بجائے اپنے نفس کی پوجا کرنے والا شخص علما و مشائخ کا پائجامہ چیک کرتا ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں کہ فرض روزہ چھوڑ کر ایک جزوی مسئلہ میں مسلک کی تائید کے لیے مناظرہ کرتے پھرتے ہیں! اس امت پر نوحہ کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔

(۳)

زیر نظر کتاب ''مسئلہ اذان و اقامت -ایک معتدل نظریہ'' کی پہلی اشاعت ۱۴۳۸ھ/۲۰۱۷ء میں ہوئی۔ اس کے مصنف مولانا اصغر علی ایک جواں سال مصباحی عالم ہیں۔ یہ ان کی پہلی کاوش ہے اور اس وقت حذف و اضافہ کے ساتھ یہ کتاب دوسری اشاعت کے لیے تیار ہے۔ اس اشاعت میں وہ سوالات بھی شامل ہیں، جو علمائے کرام کی جانب سے اس کتاب کے مشمولات، یعنی مواد و تعبیرات پر مختلف کتابوں، رسائل و جرائد اور انفرادی مضامین میں الگ الگ طریقے سے اٹھائے گئے تھے۔ انھوں نے ان تمام سوالوں کا جواب ایک ماہرِ فقہ مفتی اور کہنہ مشق مصنف کی طرح دیا ہے۔ لب و لہجہ عامیانہ نہیں ہے، مناظرانہ نہیں ہے، بلکہ معروضانہ اور متواضعانہ ہے۔

ان کی عمر، بھولی شکل و صورت اور میانہ قد کاٹھ دیکھ کر کوئی یہ اندازہ نہیں لگاپائے گا کہ یہی وہ مولانا اصغر ہیں جو اس کتاب کے مصنف ہیں۔ان کے بعض اساتذہ کو بھی اپنے اس قابل فخر شاگرد پر رشک وشک کا ملا جلا تاثر دیتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔لیکن ہمارے لیے تو ان کی شخصیت قابل فخر ہے؛کیوں کہ انھوں نے اس مسئلہ کو مدافعانہ وداعیانہ طور پر لکھا ہے،تسلط،تشدد اور تعصب کی روش کو اختیار نہیں کیا ہے۔ اپنے موقف کو بڑے مضبوط و محکم انداز سے پیش کیا ہے،لیکن کسی ایک شخص پر بھی اپنے موقف کو مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی ہے اور نہ اس کی دعوت دی ہے۔اللہ ایسے مخلص قلم کاروں کی ایک جماعت پیدا فرمائے جن کی تحریریں امت کو نجات ابدی کی طرف لے جائیں،فتنہ پروری اور تفرقہ بازی کی طرف نہ لے جائیں۔آمین

(۴)

پوری دنیا میں تقریبًا ۲۳.۵٪ آبادی ہی اسلام پرست ہے۔ایک بڑی آبادی توحید آشنا بھی نہیں ہے۔جو مسلمان ہیں،ان میں بھی بہت ہی قلیل تعداد ان کی ہوگی جن کے عقائد سلف صالحین کے مطابق ہوں، فرائض و واجبات ادا کرنے والے ہوں۔ایسے میں ان میں سے کچھ کسی طرح مسجد تک پہنچ جاتے ہیں تو بھی ہمارے پیٹ کا درد کم نہیں ہوتا،ہم ان سے محبت کا اظہار کرکے ان کی اصلاح کرنے کی بجائے ان پر نقد کرنا شروع کردیتے ہیں۔انھیں اخلاص کا سبق کون پڑھائے گا،انھیں اخلاق حسنہ سے کون مزین کرے گا،اس کی کسی کو کوئی فکر نہیں ہوتی۔

یہ تو ہمارا حال ہے۔ہمارا مخالف بھی ہمارے شانہ بہ شانہ کھڑا ہے۔ہمارا دینی دشمن ہمارے اعداد و شمار کم سے کم کرنے میں لگا ہوا ہے۔دنیا کے مختلف خطوں میں مذہب و مسلک کے نام پر ہمیں لڑا رہا ہے،اپنے ہی بھائی سے ہمیں خوف دلا رہا ہے، بندر بانٹ کی طرح ایک دشمن ہتھیار سپلائی کر رہا ہے تو دوسرا دشمن دوسرے بھائی کو جنگ

پر آمادہ کر کے اس کے ساتھ لڑ رہا ہے یا اس کو بھی وہ ہتھیار سپلائی کر رہا ہے۔ جان و مال کے ساتھ ہمارے معاشی حدود بھی تنگ کر رہا ہے۔ معاش کے سارے شعبوں پر بالواسطہ یا بلاواسطہ قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ بیشتر مسلم ممالک اس کے دست نگر ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کے علاوہ جغرافیائی حدود میں بھی دراندازی شروع کر دی ہے۔ فلسطین سمٹتا جا رہا ہے۔ دشمن کئی چھوٹے بڑے ممالک پر للچائی نگاہ ڈالے ہوئے ہے۔

یہ تو جان و مال اور عزت و آبرو کا حال ہے جس کا نمبر ایمان کے بعد آتا ہے۔ ہمارے دشمنوں نے ایمان و اعتقاد کو کمزور کرنے کے لیے با ضابطہ علوم شرقیہ کے مطالعہ و تحقیق کے لیے اپنی ایک جماعت کو تیار کیا، جس کو مستشرق کہا جاتا ہے، انھوں نے ہی مسلکی اختلاف کو ہوا دی اور امت مسلمہ کے درمیان شگاف ڈالنے کی کامیاب کوشش کی، نیز ہمارے تعلیم یافتہ افراد کے فکر و نظر میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لیے تحقیق کے نام پر تدلیس و فریب کی ایک دنیا آباد کر دی۔

ان حالات میں یہ کہہ پانا بہت مشکل ہے کہ دین کے مافیا علما و مشائخ اپنے مسلم معاشرے کے بڑے دشمن ہیں یا ہمارا مخالف؟ کیوں کہ یہ قدسی صفات حضرات، دعوت کے سارے راستے محدود کر چکے ہیں۔ افسوس کہ جہاں مقاصد شرع کی حفاظت ہی مشکل ہو گئی ہو، ہم وہاں ان فروعی مسائل پر جنگ کر کے اپنی دفاعی قوت کمزور کر رہے ہیں۔

جب بھی امت کی اس بے راہ روی کا خیال آتا ہے تو خون کے آنسو روئے بغیر چارۂ کار نہیں رہتا۔

(۵)

پہلی بار اس کتاب کی تصحیح کے وقت تو کم احساس رہا، لیکن دوسری اشاعت کے وقت یہ بات ستاتی رہی کہ آخر امت کے ان بڑے بڑے مسائل سے آنکھیں چرا کر

کہاں ان فروعی مسئلوں کی تحقیق میں ہمارا یہ عالی دماغ خرچ ہو رہا ہے۔ کئی بار تو میں نے مولانا اصغر کے مسودہ کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میرے لیے اس کا مطالعہ ہی گراں ہے۔ اس کی تصحیح کے لیے ایسی ہمت چاہیے جو اپنی نجات پر مطمئن ہو، تکملہ سلوک کر چکا ہو اور امت کے بڑے مسائل پر وہ کام کرتا ہو، ہزاروں کو راہ ہدایت دے چکا ہو اور اس قسم کے چھوٹے مسائل پر اکیڈمک انجوائمنٹ کے لیے کام کر رہا ہو۔ میری ہی نہیں بلکہ جامعہ عارفیہ کے بیشتر علما کی یہی رائے تھی۔

لیکن ''مرتا کیا نہ کرتا''، کبھی کبھی پھنسی بھی ناسور بن جاتی ہے۔

امت کے ان جیالوں کو سلام، جنھوں نے خانقاہ عارفیہ کے محبین و متعلقین کو ہر محاذ پر پریشان کرنا شروع کر دیا تھا، بے سروپا چھوٹی چھوٹی بلکہ منگھڑت باتوں کی وجہ سے اس خانقاہ اور اس کے شیوخ و علما پر اعتراض کرنا شروع کر دیا، استفتا کیے، دار الافتا کے دروازے کھٹکھٹائے۔

اور سلام ہو ان مفتیان کرام پر جنھوں نے خانقاہ عارفیہ سے رابطہ کیے بغیر محض الزامات کی بنیاد پر فتوی جڑ دیا، طالبانیوں کی طرح جہاد بالقلم کر کے اپنے ہی صف کے صوفی منش سادہ لوح مسلمانوں کا سر قلم کر دیا۔

دعوت و تبلیغ کے لیے زمین سے جڑے علما کی رائے تھی کہ اس طرح کے مسائل کا ایک مختصر جواب ضرور دے دینا چاہیے تاکہ ہمارے لوگ کم سے کم اطمینان کی سانس لیں اور ہمارا یہ روحانی مشن آگے بڑھتا رہے۔

ہمیں اپنے کام اور اپنے مشن پر اطمینان ہے۔ خانقاہی مزاج کے مطابق ہم بلا ضرورت معرکہ گرب و بلا از خود برپا نہیں کرتے، لیکن جب مجبور کر دیا جائے تو ننھے علی اصغر کو بھی حق کے لیے پیش کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

کور کورانہ مرو در کربلا

تا نیفتی چون حسین اندر بلا

(۶)

ہمیں اس کتاب کی پیش کش پر فخر نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ مسائلِ امت نہیں ہے۔ جو بچپن میں ہوش سنبھالتے ہی امت کے لیے راتوں کو رویا ہو، وہ ان تحریروں سے کیسے خوش ہو سکتا ہے؟ جس نے امت کی برتری کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہو، وہ ان مسائل میں کیوں کر الجھے گا؟ کیوں کہ اس کتاب کے مخاطب کوئی دشمن نہیں بلکہ ہمارے اپنے ہی ہیں۔ اس رسول کے ماننے والے ہیں جس کی امت میں ہونے کی تمنا انبیا بھی کرتے تھے، کیا اپنے بھائی کے ساتھ ہمارا یہی سلوک ہونا چاہیے؟

لیکن فخر ہے مولانا اصغر کی ذات پر کہ انھوں نے کتاب کی بنیاد تحقیق پر رکھی اور اپنے مشائخ پر کیے جانے والے اعتراض کا مسکت جواب دیا، لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی پوری کوشش رہی کہ کسی کے آئینہ دل پر ذرا بھی خراش نہ آئے، اسی لیے انھوں نے اس کتاب کی اشاعت جدید میں ان تمام درست تعبیرات کو بھی حذف کر دیا جن کو ہمارے کرم فرماؤں نے قابل اعتراض بتایا۔ اللہ انھیں سلامت رکھے اور پوری امت کو امت کے مسائل حل کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین یارب العٰلمین!

انعام صفی (غلام مصطفی ازہری)

۱۳/ رجب المرجب ۱۴۴۰ھ/ ۲۱/ مارچ ۲۰۱۹ء

مسئلہ اذان واقامت

ایک معتدل نظریہ

فقہی اختلاف؛ رحمت یا زحمت

اسلام کے بنیادی اصول ثابت و محکم ہیں جن میں محض احوال واشخاص کی بنیاد پر تبدیلی نہیں کی جاسکتی، لیکن یہ بھی غلط ہے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ زمانے کے تغیرات کو قانون شریعت میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ شریعت محمدیہ انسان کے لیے آخری چراغ ہدایت ہے، اس لیے اس نے ہدایت وضلالت کے بنیادی اصول بتادیے ہیں، عبادت وریاضت کے طریقے اور خطوط کی وضاحت کردی ہے، انفرادی واجتماعی زندگی کے لیے حدود متعیّن کردیے ہیں جو انسان کو ہمیشہ صراط مستقیم پر قائم رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ رہے جزوی یا وقتی مسئلے تو ان کو شریعت کے بتائے ہوئے بنیادی اصولوں کی روشنی میں اور اس کے مقرر کردہ حدود کے دائرے میں رہ کر ہر زمانے میں طے کرنے کی اجازت ہے، یہ کام اجتہاد کے ذریعے انجام پاتا ہے اور اسی کے ذریعے شریعت اسلامیہ میں استحکام وارتقا کا سلسلہ جاری ہے۔

امت اسلامیہ کے اختلاف کو ہم تین حصوں میں بانٹتے ہیں:

۱- اصول دین میں اختلاف جیسے اللہ، ملائکہ، کتب سماوی، رسولان عظام پر ایمان، صوم وصلاۃ کی فرضیت، خمر وربا اور حسد وغیبت کی حرمت وغیرہ۔ ایسا اختلاف کفر ہے۔

۲- وہ قواعد عامہ یا فروع محکمہ جن پر عامۃ المسلمین اور جمہور اہل اسلام متفق ہوں جیسے اجماع کی حجیت۔ ایسی صورت جمہور اہل اسلام اور سواد اعظم کے متفقات

سے عدول گمرہی اور ضلالت ہے۔

۳- باقی رہے وہ فروع جن میں ایک سے زیادہ احتمالات پائے جاتے ہیں اور وہ نوپید مسائل جن پر کوئی نص وارد نہیں ہے، ایسے مسائل میں اختلاف روا ہے بلکہ صحابہ و تابعین کے زمانے میں بلکہ بعد کے زمانہ میں بھی واقع ہے۔

فقہ اسلامی کی ابتدائی چند صدیوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فہم نصوص، ثبوت و عدم ثبوت، اختلاف نصوص، تطبیق، جمع اور ترجیح کی بنیاد پر قدیم و جدید مسائل میں مجتہدین صحابہ و اجلہ تابعین و تبع تابعین نے اختلاف کیا ہے۔

نصوص شرعیہ کے فہم میں صحابہ کے اختلاف کی ایک مثال لفظ "قرء" ہے جس کا معنی ابن مسعود اور عمر کے نزدیک حیض، جب کہ زید بن ثابت کے نزدیک طہر ہے۔

یہ تو نص قرآنی کے فہم کا مسئلہ تھا لیکن حدیث رسول کے فہم میں بھی عہد نبوی سے ہی اختلاف کا دور شروع ہو گیا تھا، غزوۂ بنی قریظہ کا قصہ محدثین و فقہا سب کے نزدیک مشہور ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن عمر فرماتے ہیں کہ جب ہم لوگ غزوۂ خندق سے لوٹے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ العَصْرَ إِلَّا فِي بَنِي قُرَيْظَةَ ہر شخص عصر کی نماز بنی قریظہ ہی میں ادا کرے گا۔ اتفاق سے عصر کا وقت راستے میں ہی ہو گیا۔ ایک جماعت نے نمازِ عصر وہیں ادا کر لی جب کہ دوسری جماعت نے بنی قریظہ پہنچ کر ادا کی۔ ہم میں سے کسی نے دوسرے کو غلط نہیں کہا اور جب نبی کریم ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے بھی کسی کو کچھ نہیں کہا۔ [1]

قرآن کی طرح سنت کا علم یکساں طور پر تمام صحابہ کرام کو بیک وقت حاصل نہیں تھا، کیوں کہ اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کوئی نہ کوئی صحابی ضرور ہوتا تھا لیکن ہر صحابی ہمیشہ آپ کے پاس نہیں ہوتا تھا، البتہ بعض لوگ اکثر اوقات آپ کے پاس رہتے

([1]) صحیح بخاری، کتاب المغازی باب، مرجع النبی ﷺ من الاحزاب ومخرجہ الی بنی قریظۃ (۱۱۲/۵، ح:۴۱۱۹)

تھے ، بعض تبلیغ، غزوات و سرایا کے لیے ادھر ادھر کا سفر بھی کرتے تھے، بعض تجارت، کھیتی باڑی اور دوسری ضروریات میں مشغول ہوتے تھے جب کہ بعض معاملات صرف عورتوں کے لیے خاص تھے یا اس وقت رسول اللہ ﷺ گھر پر ہی ہوتے تھے، اس لیے ان معاملات کا علم ازواج مطہرات یا صحابیات ہی کو ہوتا تھا۔

اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے اس دنیا سے رحلت کر جانے کے بعد ابتدائی عہد میں حدیث کا علم یکساں طور پر سب کے پاس نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ جب کسی صحابی کے پاس حدیث نہیں ہوتی تو وہ اپنے اجتہاد سے کسی مسئلے میں ایک فتوی دیتے لیکن کسی دوسرے صحابی کے پاس اس مسئلہ سے متعلق حدیث موجود ہوتی تو وہ حدیث کے مطابق جواب دیتے پھر اگر اس جواب اور اس حدیث کا علم پہلے صحابی کو ہو جاتا تو وہ اپنے فتوی سے رجوع کر لیتے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت ابو موسی اشعری نے اپنی رائے سے میت کی بیٹی اور بہن کی موجودگی میں پوتی کے لیے فتوی دیا کہ اس کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ پورا مال بہن اور بیٹی کے درمیان آدھا آدھا تقسیم ہو جائے گا۔ لیکن آپ نے سائل سے یہ بھی فرمایا کہ تم اس مسئلہ کے لیے عبد اللہ ابن مسعود کے پاس جانا وہ بھی یہی بتائیں گے۔ سائل حضرت عبد اللہ بن مسعود کے پاس آیا اور ان کے پاس اپنا مقدمہ رکھا، ساتھ ہی حضرت ابو موسی اشعری کا فتوی بھی بتایا۔ آپ نے فرمایا: اگر میں ان کی موافقت کروں تو درستگی کو نہ پاسکوں گا کیوں کہ میرے پاس سنت ہے، اس لیے میں اس کے حق میں وہی فیصلہ کروں گا جو فیصلہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ بیٹی کے لیے نصف ہے، پوتی کے لیے چھٹا حصہ اور اس کے بعد جو بچتا ہے وہ بہن کو ملے گا۔ جب یہ خبر حضرت ابو موسی اشعری کے پاس پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ سنت رسول کے بعد کسی سوال کی حاجت ہی نہیں۔ [1]

([1]) صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب میراث ابنۃ الابن مع بنت (۱۵۱/۸، ح:۶۷۳۵)

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات ضروریات دین کی حیثیت رکھنے والے یعنی قطعی الدلالۃ وقطعی الثبوت [1] مسائل کو بھی مقاصد شرع کے پیش نظر ساقط کر دیا گیا جیسے مستحقین زکات میں مؤلفۃ القلوب کا ہونا نص قرآنی سے ثابت ہے اس کے باوجود علت یا مقصد شرع کے پیش نظر صحابہ کرام نے اس کو مستحقین کی فہرست سے خارج کر دیا۔

اسی طرح سد ذرائع کے نام پر مباح کو حرام کا درجہ دیا گیا جیسے عہد رسالت اور خلیفہ اول کے زمانے میں عورتوں کو مساجد میں آنے اور جماعت میں شریک ہونے کی اجازت تھی لیکن سیدنا عمر فاروق نے فساد زمانہ کی بنیاد پر ان کو مسجد میں آنے سے روک دیا اور صحابہ نے ان کے اس فیصلے سے اختلاف نہیں کیا۔

ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ دین کی مضبوطی یا قرب الٰہی کے لیے بدعت کو سنت تسلیم کیا گیا جیسے باضابطہ امام کی اقتدا میں تراویح کی نماز، جمعہ میں ایک اذان کا اضافہ وغیرہ

گویا فروعی اور مجتہد فیہ مسائل میں اختلاف کی بنیاد جب صحابہ کرام کے عہد زریں میں ہی پڑ چکی تھی تو بعد کے ادوار میں اختلاف ناگزیر ہے اور یہ اختلاف احوال و اشخاص کو مد نظر رکھتے ہوئے رحمت ہے، زحمت نہیں، آسانی اور وسعت کا سبب ہے، سختی اور تنگی کا باعث نہیں۔

بلکہ بقول امام عبدالوہاب شعرانی قدس سرہ شریعت محمدیہ میں جو اختلاف نظر آتا ہے وہ حقیقۃً احوال و اشخاص کا اختلاف ہے، رخصت و عزیمت کا اختلاف ہے، صاحب رخصت، رخصت پر اور صاحب عزیمت، عزیمت پر عمل کرے، اس کی تفصیل میزان الشریعۃ الکبریٰ کے مقدمہ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

([1]) قطعی الثبوت؛ وہ نص جو ہم تک متواتراً پہنچی ہو یعنی اس میں جھوٹ کا احتمال نہ ہو۔ قطعی الدلالۃ؛ وہ نص جو ایک سے زائد تفسیر کا احتمال نہ رکھتی ہو یعنی اس کا صرف ایک ہی معنی ہو۔

سیدنا عمر بن عبد العزیز فرماتے ہیں کہ اگر صحابہ اختلاف نہ کرتے تو مجھے خوشی نہ ہوتی کیوں کہ ان کے اختلاف کی وجہ سے ہی رخصت کا دروازہ کھلا۔[1]

ان اختلافات کو شیخ ابن تیمیہ نے قراءت کے اختلاف سے تعبیر کیا ہے، کیوں کہ ہر قراءت جائز ہے، سود مند ہے، ضرر رساں نہیں، اگرچہ کوئی کسی کو ترجیح دے اور کسی کو چھوڑ دے، اللہ کے رسول ﷺ نے قرا کو مختلف قراءت پر قرآن پڑھنے کی اجازت دی ہے، لیکن انھیں دین میں افتراق پیدا کرنے سے منع فرمایا ہے۔[2]

یہ بات واضح رہے کہ جہاں اسلام کے بنیادی مسائل میں اختلاف تفرقہ اور انتشار کا سبب ہے، وہیں جزوی اور فرعی مسائل میں اختلاف باعث رحمت ہے مگر یہ رحمت اور آسانی بھی اس وقت زحمت کی صورت اختیار کر لیتی ہے جب ہویٰ پرستی اور تعصب مسلکی میں ان فروعی مسائل کو اصول کا درجہ دے دیا جاتا ہے، تفردات کو اجماع اور فتوے کو نص قرآنی اور سنت متواترہ کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے، یعنی اپنے فتوی اور قول کو پوری امت پر نافذ کرنے کی سعی نامشکور کی جاتی ہے، جو سراسر گمرہی ہے۔

اللہ عزوجل امام مالک کے مرقد پہ رحمت و نور کی بارش فرمائے، ان سے عباسی خلیفہ نے کہا کہ آپ موطا کے نسخے تیار کرا دیں تاکہ میں اس کو تمام بلاد اسلامیہ میں بھیج دوں اور وہاں کے گورنروں کو حکم دے دوں کہ وہ اس کے مطابق احکام نافذ کریں تو آپ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو کیوں کہ ہر شہر میں صحابہ میں سے کوئی نہ کوئی پہنچا اور وہاں تابعین میں سے اہل علم موجود ہیں، لوگ اپنے شہر کے علم پر عمل کر رہے ہیں، اب ان کو اس سے منع کرنا ان کے لیے مشقت کا باعث ہوگا، خلیفہ نے کہا کہ اگر آپ مجھے نہ روکتے تو میں ایسا ضرور کرتا۔(3)

([1])عبد الرحمن سخاوی/المقاصد الحسنۃ، باب اول، حرف ہمزہ (ص:۷۰)
([2])احمد بن عبد الحلیم بن تیمیہ الحرانی/اقتضاء الصراط المستقیم (۵۴/۴)
([3])ابو نعیم/حلیۃ الاولیاء (۳۳۲/۶)

ایک متفقہ قاعدہ ہے: لَا يُنْكَرُ الْمُخْتَلَفُ فِيهِ وَإِنَّمَا يُنْكَرُ الْمُجْمَعُ عَلَيْهِ [1] مختلف فیہ پر عمل کرنے والے پر کوئی مواخذہ نہیں، مواخذہ صرف اجماعی مسائل کے خلاف عمل کرنے والے پر ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: وَ اْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ انْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ (لقمان:۱۷) معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: لَا طَاعَةَ فِي مَعْصِيَةِ الله، إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوفِ. اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اتباع جائز نہیں، طاعت تو صرف معروف میں ہے۔ (2)

اس حدیث میں دو کنارے متعیّن کر دیے گئے ہیں۔ ایک طرف یہ متعیّن ہے کہ طاعت صرف معروف میں واجب ہے تو دوسری طرف یہ ہے کہ منکر میں کسی کی اطاعت نہیں۔ شرع میں معروف و منکر اس کو کہتے ہیں جس کا کرنا اور نہ کرنا نصوص میں بیّن اور واضح ہو، یعنی فرض و واجب اور حرام قطعی میں کسی کی اتباع نہیں، ان دونوں حدود کے درمیان آپ کو اختیار ہے جس مذہب یا جس مسلک کو چاہیں اختیار کریں۔

اب اس کے بعد مرحلہ آتا ہے واجب اجتہادی اور حرام اجتہادی کا- آپ پر ضروری ہے کہ جس مذہب فقہی کو آپ نے اختیار کر رکھا ہے، اس کے مطابق واجب اجتہادی کا اتباع کریں اور حرام اجتہادی سے اجتناب کریں، اس کے بعد یہ بھی مناسب ہے کہ اس مذہب کے مستحبات اور اولی امور کا اتباع کریں، لیکن یہ اتباع واجب نہیں اور نہ ہی کسی کو اس کے لیے مجبور کرنا جائز ہے۔ پھر اس کے بعد مرحلہ آتا ہے ان امور کا جن کا استحباب بھی مختلف فیہ ہوتا ہے اور بسا اوقات ایک ہی مسئلہ ایک ہی مذہبِ فقہی کے علما کے درمیان مختلف فیہ ہوتا ہے، ایسے امور میں تشدد، سخت گیری، مناظرہ، اصرار اور جنگ انتہائی درجے کی سفاہت، جہالت اور دین کی سماحت و رحمت کو زحمت بنانے کے ہم معنی ہے۔

([1]) سیوطی/الاشباہ والنظائر (ص:۱۵۸) القواعد الفقهية وتطبيقاتها في المذاهب الاربعة (۲/۷۵۷)
([2]) صحیح بخاری، کتاب اخبار الآحاد، باب ماجاء فی اجازۃ خبر الواحد... ح:۷۲۵۷)

ان ہی مختلف فیہ امور میں سے داخل مسجد اذان ثانی دینے اور اقامت کے وقت کھڑے ہونے کا مسئلہ ہے، یہ دونوں مسئلے ایک ہی مذہب فقہی کے مابین مختلف فیہ ہے، لہٰذا جن کے نزدیک ان دونوں مسئلوں میں جو صورت راجح ہو، اس پر عمل کریں اور دوسرے کے اختلاف رائے کو قبول کریں اور احترام کی نظر سے دیکھیں، لیکن ان دونوں مسئلوں میں جو صورت میرے نزدیک راجح ہے اسے ہم دلائل کی روشنی میں رقم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مسئلہ اذان

اذان کا لغوی واصطلاحی معنی

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا [النساء:۱۰۳] یعنی بیشک نماز مومنوں پر مقررہ وقت کے حساب سے فرض ہے۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنوں پر نمازیں ان کے وقتوں پر ہی فرض ہیں، لہٰذا جس وقت جس نماز کا وقت ہوگا اس وقت وہ نماز فرض ہوگی، لیکن نماز کا وقت کب ہوگا؟ تو اس کے لیے اللہ تعالی نے نظامِ شمسی مقرر فرمایا ہے، قرآن میں ہے: اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا [الاسراء:۷۸] یعنی آپ سورج ڈھلنے سے لے کر رات کی تاریکی تک نماز قائم فرمایا کریں اور صبح کا قرآن، بیشک صبح کے قرآن میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔

تفسیر جلالین کے مطابق اللہ نے اِس آیت کریمہ میں پانچوں نمازیں- ظہر، عصر، مغرب، عشا اور فجر- کا وقت بیان فرمادیا ہے۔[1] لہٰذا سورج کے طلوع و غروب کے حساب ہی سے نماز کی فرضیت کا حکم ہوگا۔

اللہ تعالی نے نماز کی فرضیت کے ساتھ ایک یہ بھی حکم دیا ہے کہ فرض نمازوں کو جماعت کے ساتھ ادا کی جائے جیسا کہ اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے: وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ [البقرۃ:۴۳] یعنی رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جماعت کے

([1]) تفسیر جلالین (ص:۳۷۴)

ساتھ نماز ادا کرو۔

لیکن لوگوں کو جماعت کا علم کیسے ہو؟ اس کے لیے شریعت میں اذان کا سسٹم ایجاد کیا گیا، جس سے لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اب نماز کی جماعت قائم ہونے والی ہے، لہٰذا ہر نماز کے لیے بشمولِ جمعہ اذان سنت موکدہ ہے، اللہ تبارک و تعالی نے خاص اذانِ جمعہ کے بارے میں ارشاد فرمایا: اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ [الجمعۃ:۹] یعنی جب جمعہ کے دن نماز کے لیے ندا دی جائے تو فوراً اللہ کے ذکر کی طرف تیزی سے چل پڑو۔

تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ اِس آیت میں ندا سے جمعہ کی اذان ثانی مراد ہے۔

"النِّدَاءُ" اس کا معنی ہوتا ہے "رفْعُ الصَّوت وظُهُورُهُ" یعنی آواز بلند کرنا اور ظاہر کرنا، اسی معنی میں لفظ "الأذان" ہے جس کا لغوی معنی "الإعلام" کے ہوتے ہیں، یعنی باخبر کرنا، اعلان کرنا، اس معنی میں قرآن کی یہ آیت کریمہ ہے: {وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ } [سورۃ التوبۃ:۳] یعنی سب لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان ہے۔ دوسری آیت ہے: وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ [سورۃ الحج:۲۷] یعنی لوگوں میں بلند آواز سے حج کا اعلان کیجیے۔

اور اصطلاح شرع میں:

عِبَارَةٌ عَنْ إعْلَام مَخْصُوص فِي أَوْقَاتٍ مَخْصُوصَة[1] یعنی اوقات مخصوصہ میں مخصوص چیز -نماز- کے اعلان کرنے کا نام اذان ہے۔

اس کتاب میں ہم بالخصوص جمعہ کی اذان ثانی کے بارے میں گفتگو کریں گے لیکن اس سے پہلے ہم مطلقِ اذان کا ایک سرسری جائزہ پیش کرتے ہیں۔

([1]) العنایۃ شرح الھدایۃ (۱/۲۴۰)

سلسلۂ اضافات؛ عہد بعہد

اذان کی ابتدا:

جب نبی اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے، تو آپ نے مدینہ میں ایک مسجد تعمیر کرنے کا حکم فرمایا۔ جب مسجد تعمیر ہو چکی، تو ضرورت محسوس ہوئی کہ نماز باجماعت کی دور دور تک اطلاع کے لیے کوئی طریقہ اختیار کیا جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہ سے اس سلسلے میں مشاورت فرمائی، جس میں یہ چند تجاویز سامنے آئیں:

۱۔ آگ روشن کر دی جائے۔

۲۔ ناقوس بجایا جائے۔

۳۔ بگل بجایا جائے۔

۴۔ ایک جھنڈا بلند کر دیا جائے۔

لیکن آپ ﷺ کو ان میں سے کوئی مشورہ پسند نہ آیا۔ یہ سعادت ایک صحابی رسول حضرت عبد اللہ بن زید کو حاصل ہوئی، آپ فرماتے ہیں کہ میں اس سلسلے میں کافی متفکر تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی کے ہاتھ میں ناقوس ہے، میں نے اس سے کہا: اے اللہ کے بندے! کیا تم اس ناقوس کو فروخت کرو گے؟ اس نے پوچھا: تم اس کا کیا کرو گے؟ میں نے کہا: میں اس سے نماز کے لیے لوگوں کو بلاؤں گا۔ اس نے کہا: کیا میں تم کو اس سے زیادہ بہتر چیز نہ بتاؤں؟ میں نے کہا: کیوں نہیں،

اس نے کہا: تم کہو:

اللهُ أَكْبَرُ، اللهُ أَكْبَرُ ، اللهُ أَكْبَرُ ، اللهُ أَكْبَرُ
أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا الله، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا الله
أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ الله، أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ الله
حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ
حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ، حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ
الله أَكْبَرُ، الله أَكْبَرُ
لَا إِلَهَ إِلَّا الله

پھر وہ شخص مجھ سے تھوڑی دور چلا گیا، پھر اس نے کہا: جب تم نماز کی اقامت کہو، تو یوں کہنا:

اللهُ أَكْبَرُ، اللهُ أَكْبَرُ ، اللهُ أَكْبَرُ ، اللهُ أَكْبَرُ
أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا الله، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا الله
أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ الله، أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ الله
حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ
حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ، حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ
قَدْ قَامَتْ الصَّلَاةُ، قَدْ قَامَتْ الصَّلَاةُ
الله أَكْبَرُ، الله أَكْبَرُ، لَا إِلَهَ إِلَّا الله

پھر جب صبح ہوئی، تو میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جو کچھ میں نے خواب میں دیکھا تھا اس کو بتایا، آپ نے فرمایا: اِن شاء اللہ! یہ برحق خواب ہے، تم کھڑے ہو کر خواب میں سنے ہوئے اذان کے کلمات بلال کو بتاؤ اور بلال اذان دیں کیوں کہ ان کی آواز تم سے زیادہ بلند ہے۔ میں حضرت بلال کے ساتھ کھڑا ہو گیا، میں

ان کو اذان کے کلمات بتاتا رہا اور وہ اذان دیتے رہے۔ حضرت عمر بن خطاب اپنے گھر میں تھے، انھوں نے اذان سنی تو وہ اپنا تہبند گھسیٹتے ہوئے نکلے۔ اور بارگاہ رسالت میں عرض گذار ہوئے: اے اللہ کے رسول! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، میں نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا تھا۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وللہ الحمد''[1]

اس واقعہ کے بعد باضابطہ نماز باجماعت کے لیے اذان دی جانے لگی۔ اس سے پہلے اگرچہ نماز کی فرضیت کا حکم آچکا تھا، لیکن اذان کا رواج نہ تھا۔

الصَّلاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کا اضافہ

یہ بات تو طے ہے کہ جس اذان کی تعلیم صحابی رسول کو خواب میں دی گئی تھی اس میں ''الصَّلاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ'' کے الفاظ نہیں تھے، اس کا اضافہ بعد میں ہوا۔ اب اس میں اختلاف ہے کہ اس کا اضافہ کس نے کیا؟ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا اضافہ حضرت بلال نے کیا تھا اور حضور نے اس کو برقرار رکھا اور بعض سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اضافہ حضرت عمر کے ایک مؤذن نے کیا جس کو حضرت عمر نے ثابت رکھا۔

حضرت بلال کے اضافہ کرنے پر دلیل وہ روایت ہے جو سنن ابن ماجہ میں آئی ہے کہ حضرت سعید بن مسیب حضرت بلال سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

أَنَّهُ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُؤْذِنُهُ بِصَلَاةِ الْفَجْرِ، فَقِيلَ: هُوَ نَائِمٌ، فَقَالَ: الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ، الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ، فَأُقِرَّتْ فِي تَأْذِينِ الْفَجْرِ، فَثَبَتَ الْأَمْرُ عَلَى ذَلِكَ۔[2]

حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کو نماز کی اطلاع دینے کے لیے آئے، تو آپ سے بتایا گیا کہ حضور آرام فرما ہیں، تو آپ نے دو مرتبہ کہا: ''الصَّلاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ''

([1]) سنن ابی داود، کتاب الاذان، باب کیف الاذان، ح:۴۹۹

([2]) سنن ابن ماجہ، باب السنۃ فی الاذان (۱/۲۳۷، ح:۷۱۶)

آپ کے اس اضافے کو اذان میں شامل کر لیا گیا اور اس طرح یہ سلسلہ جاری ہو گیا۔

امام طبرانی کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

مَا أَحْسَنَ هَذَا يَا بِلالُ اجْعَلْهُ فِي أَذَانِكَ[1]

اے بلال! یہ کتنی اچھی چیز ہے، اس کو اذان میں شامل کر دو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اضافہ کرنے پر دلیل وہ روایت ہے جس کو امام مالک نے مؤطا میں بیان کیا ہے، آپ فرماتے ہیں:

إِنَّ الْمُؤَذِّن جَاءَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ يُؤْذِنُهُ لِصَلاَةِ الصُّبْحِ،فَوَجَدَهُ نَائِمًا، فَقَالَ: الصَّلاَةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ،فَأَمَرَهُ عُمَرُ أَنْ يَجْعَلَهَا فِي نِدَاءِ الصُّبْحِ[2]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس مؤذن نماز فجر کی اطلاع دینے کے لیے آیا تو آپ کو سوتا ہوا دیکھ کر کہا: "الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ" تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مؤذن کو حکم دیا کہ اس کو فجر کی اذان میں شامل کر دیں۔

ان دونوں روایتوں میں محدثین نے تطبیق دی ہے، لیکن یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ "الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ" پہلے اذان میں نہیں تھا، اس کا اضافہ بعد میں بربنائے مصلحت ہوا، اور وہ مصلحت یہ تھی کہ فجر کا وقت سونے کا ہوتا ہے۔ اس لیے سونے والے کو متنبہ کرنے کے لیے اس کے اضافے کو روا رکھا گیا۔

صَلُّوْا فِي رِحَالِكُمْ کا اضافہ:

اسی طرح اذان کے اندر صَلُّوْا فِي رِحَالِكُمْ کا بھی اضافہ ہوا؛ یہ خواب میں اللہ کی طرف سے سکھائی گئی اذان میں نہیں تھا، اس کا بھی اضافہ ایک ضرورت کے تحت ہوا۔ اس کی تفصیل یوں ہے:

([1]) طبرانی/المعجم الکبیر (۴۶۶/۱، ح:۱۰۷۲)

([2]) مؤطا امام مالک۔ کتاب وقوت الصلاۃ، باب ماجاء فی النداء، ح:۱۹۳)

حضرت نافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

أَذَّنَ ابْنُ عُمَرَ فِي لَيْلَةٍ بَارِدَةٍ بِضَجْنَانَ،ثُمَّ قَالَ:صَلُّوا فِي رِحَالِكُمْ، فَأَخْبَرَنَا أَنَّ رَسُولَ الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يأمُرُ مُؤَذِّنًا يُؤَذِّنُ،ثُمَّ يَقُولُ عَلَى إِثْرِهِ:أَلَا صَلُّوا فِي الرِّحَالِ،فِي اللَّيْلَةِ البَارِدَةِ،أَوِ المَطِيرَةِ فِي السَّفَرِ [1]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے مقام "ضجنان" میں سردی کی رات میں اذان دی اور پھر کہا: "صَلُّوْا فِی رِحَالِکُمْ" (اپنی قیام گاہ میں نماز ادا کرلو) اور فرمایا: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے مؤذن کو اس کا حکم دیتے تھے اور مؤذن اذان مکمل کرنے کے بعد سردی کی رات میں یا سفر میں بارش کی حالت میں "صَلُّوْا فِی رِحَالِکُمْ" کہتے تھے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت نعیم بن نحام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

سَمِعْتُ مُؤَذِّنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي لَيْلَةٍ بَارِدَةٍ وَأَنَا فِي لِحَافِي، فَتَمَنَّيْتُ أَنْ يَقُولَ: صَلُّوا فِي رِحَالِكُمْ، فَلَمَّا بَلَغَ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ، قَالَ: " صَلُّوا فِي رِحَالِكُمْ " ثُمَّ سأَلْتُ عَنْهَا، فَإِذَا النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ أَمَرَهُ بِذَلِكَ۔ [2]

میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مؤذن کو اذان دیتے ہوئے سنا، اس وقت میں لحاف میں تھا، میں نے سوچا کہ کاش وہ یہ کہتے کہ "اپنی اپنی قیام گاہ میں نماز ادا کرلو، تو جب وہ "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" پر پہنچے تو کہا "اپنی قیام گاہ میں نماز ادا کرلو" پھر میں نے بعد میں ان سے پوچھا کہ کیا حضور نے ایسا کہنے کا حکم دیا تھا؟ تو انھوں نے کہا: ہاں! حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کا حکم فرمایا تھا۔

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے:

إِنَّهُ قَالَ لِمُؤَذِّنِهِ فِي يَوْمٍ مَطِيرٍ: إِذَا قُلْتَ: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ،

([1]) صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر...، ح:۶۳۲)

([2]) مسند احمد (۲۹/۴۵۳، ح:۱۷۹۳۳) مصنف عبد الرزاق، کتاب الصلاۃ (۱/۵۰۱، ح:۱۹۲۶)

أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ الله، فَلَا تَقُلْ: حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، قُلْ: صَلُّوا فِي بُيُوتِكُمْ. قَالَ: فَكَأَنَّ النَّاسَ اسْتَنْكَرُوا ذَاكَ، فَقَالَ:أَتَعْجَبُونَ مِنْ ذَا، قَدْ فَعَلَ ذَا مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِنِّي، إِنَّ الْجُمُعَةَ عَزْمَةٌ، وَإِنِّي كَرِهْتُ أَنْ أُحْرِجَكُمْ فَتَمْشُوا فِي الطِّينِ وَالدَّحْضِ[1]

حضرت عبداللہ بن عباس نے بارش کے دن اپنے مؤذن سے کہا: کہ جب تم أَشْهَدُ أن لَّآإِلٰه إِلَّا اللهُ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ الله کہنا تو اس کے بعد حَيَّ عَلَى الصَّلَاة مت کہنا، بلکہ اس کی جگہ صَلُّوْا فِی بُیُوتِکُمْ کہنا۔ لوگوں کو یہ بات عجیب لگی، تو آپ نے فرمایا: تم لوگ تعجب کر رہے ہو؟ ایسا انھوں نے کیا ہے جو مجھ سے بہتر تھے۔ ہر چند کہ جماعت سے نماز ادا کرنا سنت مؤکدہ ہے، لیکن میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ تم لوگ مٹی اور کیچڑ میں چل کر آؤ۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صَلُّوْا فِی رِحَالِکُمْ کا اضافہ حی علی الصلاۃ کی جگہ پر ہونا چاہیے اور ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اضافہ اذان ختم ہونے کے بعد ہونا چاہیے۔

علامہ عینی نے فرمایا ہے کہ دونوں جائز ہے لیکن دوسری صورت افضل ہے[2] لیکن میرے خیال میں پہلی صورت ہی افضل ہے اور اس کا حی علی الصلاۃ کی جگہ پر ہونا ہی زیادہ بہتر ہے۔ کیوں کہ دوسری صورت پر غور کریں کہ اس کے مطابق مؤذن حی علی الصلاۃ کے ذریعے نماز کی جماعت کی طرف بلائے اور پھر اذان کے بعد صَلُّوْا فِی رِحَالِکُمْ کہہ کر جماعت کی طرف آنے سے منع کرے، ظاہر ہے پہلی صورت کے بالمقابل یہ غیر مناسب ہے۔ بہر حال ان روایتوں کی روشنی میں یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ یہ اذان میں

([1]) صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب الصلاۃ فی الرحال فی المطر (ح:۱۶۳۷)

([2]) الأمران جائزان وبعد الفراغ أحسن (عمدۃ القاری، کتاب الاذان، باب الکلام فی الاذان (۱۲۸/۵)

اضافہ کیا گیا تھا، جو بہرکیف ایک مناسب امر تھا۔

اس قدر اذان میں تبدیلی ہونے سے یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ اذان کا مقصود صرف نماز کی اطلاع ہے، اس لیے اس میں حسب ضرورت ردوبدل کیا جاسکتا ہے جس سے اس کا مقصد حاصل ہو اور خواہ مخواہ لوگ بددل نہ ہوں۔

اذان ثانی کا اضافہ:

آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے عہد مبارک میں دیگر نمازوں کی طرح جمعہ کے لیے بھی صرف ایک اذان ہی ہوتی تھی، بلکہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کی ابتدا میں بھی ایک ہی اذان ہوتی تھی لیکن جب آپ نے دیکھا کہ لوگوں کی تعداد زیادہ ہوچکی ہے اور لوگ صحیح وقت پر جمعہ کی نماز میں نہیں پہنچ پارہے ہیں، تو آپ نے لوگوں کی آسانی اور پیشگی اطلاع کے لیے مزید ایک اذان کا اضافہ فرمایا، تاکہ لوگ وقت پر جمعہ کی جماعت میں بہ آسانی شریک ہوجائیں۔ یہ وجہ معقول بھی ہے اس لیے کہ اس سے پہلے اذان جمعہ کے معًا بعد خطبہ شروع ہوتا تھا اور خطبہ کے اختتام کے ساتھ ہی جمعہ کی نماز شروع ہوجاتی تھی، ظاہر ہے کہ خطبہ کا دورانیہ اتنا طویل نہیں ہوتا کہ اس بیچ سارے لوگ آجائیں۔ حضرت عثمان سے پہلے جب جذبۂ دین نسبتًا زیادہ تھا، لوگ اسی مختصر وقت میں مسجد میں آجاتے رہیں ہوں گے لیکن جب حضرت عثمان نے دیکھا کہ لوگوں کو مسجد پہنچنے کے لیے وقت کم ہے، اس لیے اس سے پہلے اعلان عام کے لیے مقام زوراپر ایک اذان کا اضافہ کیا۔

بخاری کی روایت ہے، حضرت سائب بن یزید فرماتے ہیں:

كَانَ النِّدَاءُ يَوْمَ الجُمُعَةِ أَوَّلُهُ إِذَا جَلَسَ الإِمَامُ عَلَى المِنْبَرِ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ ،وَأَبِي بَكْرٍ،وَعُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا،فَلَمَّا كَانَ عُثْمَانُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ،وَكَثُرَ النَّاسُ زَادَالنِّدَاءَالثَّالِثَ عَلَى الزَّوْرَاءِ قَالَ أَبُوعَبْدِاللهِ: ”الزَّوْرَاءُ“

مَوْضِعٌ بِالسُّوقِ بِالْمَدِينَةِ [1]

جمعہ کے دن نبی ﷺ کے عہد میں اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے عہد میں اذان اس وقت ہوتی تھی جب امام منبر پر بیٹھتا تھا۔ جب حضرت عثمان غنی کا عہد خلافت آیا اور لوگوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تو حضرت عثمان غنی نے مقام "زوراء" پر تیسری اذان کا اضافہ کردیا، امام بخاری نے کہا: "الزوراء" مدینہ کے بازار میں ایک جگہ ہے۔

اس حدیث میں تیسری اذان سے مراد وہ اذان ہے جو جمعہ کے دن سب سے پہلے مسجد سے باہر دی جاتی ہے، چوں کہ اقامت کو بھی اذان کہہ دیا جاتا ہے، اس لیے کل تین اذانیں ہوگئیں، ایک اقامت اور دو اذان۔

تثویب کا اضافہ:

اذان کے ذریعہ نماز کی اطلاع دینے کے بعد دوبارہ کسی کلمے کے ذریعہ نماز کی اطلاع دینے کو تثویب کہتے ہیں، مثلاً "الصلاۃ، الصلاۃ" کہنا، یا "اذان ہوگئی" یا اس کے مثل دوسرے الفاظ جن سے نماز کی اطلاع مل جاتی ہو۔ یہ تمام متاخرین فقہا کے نزدیک جائز ہے۔

ردالمحتار میں ہے:

(وَيُثَوِّبُ) بَيْنَ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ فِي الْكُلِّ لِلْكُلِّ بِمَا تَعَارَفُوهُ... إلَّا فِي الْمَغْرِبِ [2] مغرب کے علاوہ ہر نماز کے لیے اذان و اقامت کے درمیان تثویب کہنی چاہیے، ان کلمات کے ذریعہ جن سے لوگ واقف ہوں۔

عنایہ میں ہے: وَأَحْدَثَ الْمُتَأَخِّرُونَ التَّثْوِيبَ بَيْنَ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ عَلَى حَسَبِ مَا تَعَارَفُوهُ فِي جَمِيعِ الصَّلَوَاتِ سِوَى الْمَغْرِبِ [3]

([1]) صحیح بخاری، کتاب الجمعۃ، باب الاذان یوم الجمعۃ، ح: ۹۱۲)
([2]) ردالمحتار، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (۱/۳۸۹)
([3]) عنایہ شرح ہدایہ، باب الاذان (۱/۲۴۶)

متاخرین فقہا نے مغرب کے علاوہ ہر نماز کے لیے اذان واقامت کے درمیان لوگوں کے عرف کے مطابق تثویب کوایجاد کیاہے۔

عنایہ کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ تثویب کا رواج پہلے نہ تھا، فقہائے متاخرین نے مصلحت کی بنا پر اس کو رائج کیا۔

اذان کی ابتدا کا واقعہ، جمعہ کے دن مزید ایک اذان کا اضافہ اور پھر تثویب کا اضافہ، ان سب پر غور کرنے سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ اذان و اقامت کا مقصود لوگوں کو نماز کی اطلاع دینا ہے اور اذان کو بھی اذان اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہی ''خبر دینا، آگاہ کرنا'' ہوتے ہیں۔ اس لیے صحابہ کرام اور فقہائے عظام اپنے اپنے زمانے کے تقاضے کے مطابق اس میں اس کے مقاصد کے پیش نظر ترمیم کرتے رہے ہیں اور اس طرح ہر زمانے میں بھی اس کے مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے حذف واضافہ کیا جاسکتا ہے۔

قبل اذان واقامت درود شریف کا اضافہ:

اس آخری دور میں بھی اذان سے پہلے ایک اضافہ رونما ہوا کہ بعض مسجدوں میں اذان واقامت سے پہلے درود شریف کا اضافہ کیا جانے لگا ہے۔ علمانے اس کو جائز کہا ہے، مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اس کو اذان و اقامت سے بالکل متّصل یا جہر کے ساتھ نہ پڑھا جائے تاکہ سننے والے اس کو اذان و اقامت کا جزنہ سمجھ لیں، جیسا کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی اپنے فتاوی میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

سوال ہوتا ہے کہ ''کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید اقامت کے قبل درود شریف بآواز بلند پڑھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اقامت یعنی تکبیر شروع کر دیتا ہے کہ جس سے عوام کو معلوم ہوتا ہے کہ درود شریف اقامت کا جزء ہے اور عمرو درود شریف نہیں پڑھتا صرف اقامت کہتا ہے تو زید کو یہ فعل اس کا ناپسند آتا ہے اور اصرار

سے اس کو پڑھنے کو کہتا ہے اس صورت میں درود شریف جہر سے پڑھنا اور زید کا اصرار کرنا کیسا ہے؟ بینوا توجروا

الجواب درود شریف قبل اقامت پڑھنے میں حرج نہیں مگر اقامت سے فصل چاہئے یا درود شریف کی آواز آوازِ اقامت سے ایسی جدا ہو کہ امتیاز رہے اور عوام کو درود شریف جزوِ اقامت (اقامت کا حصہ) نہ معلوم ہو، رہا زید کا عمرو پر اصرار کرنا وہ اصلا کوئی وجہ شرعی نہیں رکھتا، یہ زید کی زیادتی ہے واللہ تعالی اعلم۔ [1]

لیکن آج اذان و اقامت سے بالکل متّصل جہر کے ساتھ درود شریف پڑھا جاتا ہے، جو سراسر اذان مسنون کے خلاف ہے۔ فاضل بریلوی کی اس تنبیہ کے باوجود افسوس کہ بہت سارے لوگوں نے اس تنبیہ کو مکمل طور سے نظر انداز کر دیا ہے بلکہ بعض علاقوں میں اذان و اقامت سے متّصل بلند آواز سے درود پڑھنے کا ایسا رواج چل پڑا ہے کہ اس کے خلاف ورزی موذنین کے لیے مہنگی پڑ جاتی ہے۔ بعض علاقوں میں اسے نہ صرف اقامت کا حصہ بلکہ سنیت کا شعار بھی بنانے کی ہوڑ چل پڑی ہے۔ اذان و اقامت کا یہ طریقہ نہ عہد رسالت مآب ﷺ میں تھا، نہ بعد کے ادوار میں اس کا کوئی رواج ہوا۔ اسی لیے معاصر محقق علامہ غلام رسول سعیدی اس حوالے سے اپنا دوٹوک موقف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر اذان و اقامت سے قبل فصل کر کے درود شریف جہر کے ساتھ دائما پڑھا جائے تو درود شریف پڑھنے کے استحباب کے عمومی دلائل کی بنا پر اس کو ناجائز یا بدعت سیئہ کہنا تو باطل ہے اور اس کے جواز اور استحباب میں بھی کوئی شک نہیں ہے، لیکن اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے مدینہ منورہ میں دس سال اذان دی جاتی رہی، خلفاے راشدین کے دور میں تیس سال اذان دی جاتی رہی

([1]) فتاوی رضویہ (۳۸۶/۵)

اور سو سال تک عہد صحابہ اور تابعین میں اذان دی جاتی رہی اور کسی دور میں بھی اذان سے پہلے یا بعد فصل کرکے جہراً درود شریف نہیں پڑھا گیا اور آٹھ صدیوں تک مسلمان اسی طریقہ سے اذان دیتے رہے تو آیا اذان دینے کا افضل طریقہ وہ ہے جس طریقہ سے عہد رسالت اور عہد صحابہ میں اذان دی جاتی تھی یا وہ افضل طریقہ ہے جو آٹھویں صدی میں ایجاد ہوا؟

اگرچہ اذان کا مروجہ طریقہ بھی ناجائز یا بدعت سیئہ نہیں ہے لیکن ہم پوری امانت اور دیانت اور شرح صدر کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ اذان دینے کا افضل طریقہ وہی ہے جو رسول ﷺ نے بتایا ہے جس طریقہ سے آپ کے سامنے اذان دی جاتی رہی۔"[1]

علامہ سعیدی صاحب کے اس موقف سے یہ بات تو سمجھ میں آگئی کہ اس کی ایجاد بعد میں ہوئی، جو اپنے دلائل کی بنا پر جائز تو ہے لیکن ساتھ ہی یہ سنت نبوی، سنت صحابہ و تابعین اور طریقہ مسلمین کے خلاف ہے، لیکن آج ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اس کو نہ صرف جواز کے دائرہ میں رکھتے ہیں بلکہ اب ہم اس کو "شعار اہل سنت" میں داخل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہیں اور جمعہ کے دن خطبہ کی اذان جس کو دوسری صدی کی ابتدا سے لے کر اب تک کے علما، فقہا اور مشائخ بشمول غوث الثقلین شیخ عبد القادر جیلانی، مسجد کے اندر دیتے ہوئے آرہے ہیں، اس کو ہم خلاف سنت کہہ کر مسجد کے باہر دلوانے پر پوری قوت صرف کر رہے ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں کہ اسے کوئی سنت سمجھے، مسئلہ یہ ہے کہ کوئی امت کے اِس عظیم توارث کو بدعت، ضلالت، خلافِ سنت، موضوعِ اصلاح و دعوت اور عنوانِ جبر و وحشت سمجھے۔

اللہ تعالی ہمیں امت وسط کی خوبیوں سے آراستہ فرمائے۔

([1]) شرح صحیح مسلم (۱۰۹۴/۳)

اذان کا محل: احادیث کی روشنی میں

اذان کہاں دی جائے؟ اس کا محل کیا ہو؟ اس حوالے سے احادیث میں چند الفاظ ملتے ہیں، جن سے محلِ اذان کی تعیین ہوتی ہے، لیکن اس میں جو چیز قدر مشترک ہے وہ یہ ہے کہ اذان ایسی جگہ ہونی چاہئے جہاں سے آواز دور دور تک پہنچے۔

سنن ابوداؤد کی حدیث ہے:

عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ، عَنْ امْرَأَةٍ مِنْ بَنِي النَّجَّارِ، قَالَتْ: كَانَ بَيْتِي مِنْ أَطْوَلِ بَيْتٍ حَوْلَ الْمَسْجِدِ وَكَانَ بِلَالٌ يُؤَذِّنُ عَلَيْهِ الْفَجْرَ[1]

حضرت عروہ بن زبیر، بنی نجار کی ایک عورت سے روایت کرتے ہیں۔ وہ بیان کرتی ہے: مسجد نبوی کے قریب میرا گھر سب گھروں میں اونچا تھا، اس لیے حضرت بلال اسی پر فجر کی اذان دیتے تھے۔

دوسری حدیث مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے:

إِنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ زَيْدٍ الْأَنْصَارِيَّ جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! رَأَيْتُ فِي الْمَنَامِ كَأَنَّ رَجُلًا قَامَ وَعَلَيْهِ بُرْدَانِ أَخْضَرَانِ عَلَى جِذْمَةِ حَائِطٍ فَأَذَّنَ[2]

حضرت عبد اللہ بن زید انصاری حضور ﷺ کی بارگاہ میں آئے اور عرض

([1]) سنن ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، باب الاذان، ح:۵۱۹) سنن کبری، کتاب الصلاۃ، ۱/۴۲۵، ح:۱۸۴۶

([2]) مصنف ابن ابی شیبۃ، کتاب الاذان والاقامۃ، ح:۲۱۱۸) مسند احمد، ۳۶/۳۵۵، ح:۲۲۰۲۷) مصنف عبد الرزاق، کتاب الصلاۃ، ۱/۴۶۱، ح:۱۷۸۸) سنن دارقطنی، کتاب الصلاۃ، ح:۹۳۷)

کیا: یارسول اللہ ﷺ! میں نے خواب میں ایک شخص کو دیکھا جس پر دو سبز چادریں ہیں، وہ دیوار پر چڑھا اور اذان دی۔

بعض روایتوں میں سقف المسجد یا سطح المسجد کا لفظ آیا ہے۔[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ مسجد کے اوپر اذان کہی۔

ابو برزہ اسلمی فرماتے ہیں:

مِنَ السُّنَّةِ الْأَذَانُ فِي الْمَنَارَةِ وَالْإِقَامَةُ فِي الْمَسْجِدِ[2]

منارہ پر اذان دینا اور مسجد میں اقامت کہنا سنت ہے۔

ان تمام روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ اذان اونچے گھر، دیوار، مسجد کی چھت اور منارہ پر دی جانی چاہیے اور ان جگہوں پر اذان دینے کا مقصد یہ ہے کہ اذان کی آواز دور تک جائے، کیوں کہ اس سے مقصود لوگوں کو نماز کے وقت ہونے کی اطلاع دینا ہے اور یہ اطلاع بدرجہ اتم اسی وقت ہوگی جب اذان کی آواز دور تک جائے، لہٰذا یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ اذان مسجد کی چھت پر یا مسجد سے باہر ہی کسی بلند جگہ پر ہونی چاہیے۔ اس حکمت بالغہ کا اعلان سراج امت امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے سنیے:

امام محمد نے امام ابو حنیفہ سے عرض کیا: فَأَيُّهُمَا أحبُّ إِلَيْك أَن يُؤَذنَ الْمؤَذّن على المنارة أَو فِي صحن الْمَسْجِد؟ آپ کے نزدیک اذان دینا کہاں مستحب ہے، منارہ پر یا صحن مسجد میں؟

آپ نے فرمایا: أحبُّ ذَلِك إِلَيَّ أَن يكونَ أَسْمَعَهُ للْقَوْم وَالْجِيرَان وكُلُّ ذَلِك حَسَن۔ اذان ایسی جگہ ہونی چاہیے جہاں سے لوگوں اور پڑوسیوں کو زیادہ سنائی دے اور یہ دونوں جگہیں مناسب ہیں۔[3]

([1]) ابن سعد/الطبقات الکبری (۱/۲۴۷) سیوطی/جمع الجوامع؛ مسند عبداللہ بن زید (۲۰/۵۷۶) بحوالہ ابوالشیخ

([2]) سنن کبری، کتاب الصلاۃ، باب الاذان فی المنارۃ (۱/۴۲۵، ح: ۱۸۴۶)

([3]) المبسوط کتاب الصلاۃ، باب من نسی صلاۃ وذکرھا من الغد (۱/۱۳۷)

امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے اس قول سے سمجھ میں آتا ہے کہ آپ کا مذہب یہ ہے کہ اذان خواہ کہیں سے بھی دی جائے درست ہے، لیکن ایسی جگہ سے دی جائے جہاں سے لوگوں کو زیادہ سنائی دے۔ اس لیے آپ کے نزدیک مسجد کے اندر اذان دینا بھی جائز ہے، چنانچہ امام محمد اپنی کتاب ''الاصل'' میں فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہ سے عرض کیا: اَرَاَیْتَ الْمؤَذّن إِذا لم يكن لَهُ مَنَارَة وَالْمُسْجِد صَغِير أَيْن أحب إِلَيْك أَن يُؤذن أيخرج من الْمُسْجِد فَيُؤذن حَتَّى يسمع النَّاس أَو يُؤذن فِي الْمُسْجِد؟ آپ بتائیں کہ مسجد چھوٹی ہو اور منارہ نہ ہو تو مؤذن مسجد سے باہر نکل کر اذان دے تاکہ لوگ سن سکیں یا مسجد کے اندر ہی اذان دے دی جائے؟ آپ نے فرمایا: أحب ذَلِك الي أَن يُؤذن خَارِجا من الْمُسْجِد وَإِذا أذن فِي الْمُسْجِد أجزاه[1]

میں پسند کرتا ہوں کہ مسجد سے باہر نکل کر اذان دے اور اگر مسجد کے اندر ہی دے دی جائے تب بھی کافی ہے۔

امام اعظم کے اس قول پر بھی غور کریں کہ آپ فرما رہے ہیں کہ مسجد کے اندر بھی اذان دے دی جائے تب بھی کافی ہے، لہٰذا یہ کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے کہ آپ کے نزدیک مطلقاً کوئی اذان مسجد کے اندر دینا درست نہیں ہے۔

بلکہ اصل بات یہ ہے کہ آپ کے نزدیک اذان مسجد کے اندر یا باہر ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں، آپ کے نزدیک اذان کا مقصود صرف یہ ہے کہ اذان کی آواز زیادہ سے زیادہ لوگ سنیں لیکن جب مسجد چھوٹی ہو گی تو اذان خواہ اندر دی جائے یا باہر، آواز کو جہاں تک پہنچنا ہو گا وہیں تک پہنچے گی۔

([1]) الاصل المعروف بالمبسوط للشيباني، كتاب الصَّلَاة، بَاب من نسي صَلَاة ذكرهَا من الْغَد (١٤١/١)

اذان ثانی کا محل: حدیث کی روشنی میں

یہ اذان بھی عہد رسالت مآب ﷺ میں مسجد کے باہر ہی ہوتی تھی، جیسا کہ ابوداؤد کی حدیث میں ہے: حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

كَانَ يُؤَذَّنُ بَيْنَ يَدَيْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا جَلَسَ عَلَى الْمِنْبَرِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ عَلَى بَابِ الْمَسْجِدِ، وَأَبِي بَكْرٍ، وَعُمَرَ[1]

جب رسول اللہ ﷺ جمعہ کے دن منبر پر جلوہ افروز ہوتے، اس وقت آپ کے سامنے مسجد کے دروازہ پر اذان دی جاتی تھی، اسی طرح حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی تھا۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر اذان خطبہ دنیا کی تمام مساجد میں منبر کے قریب مسجد کے اندر کیوں ہوتی ہے؟ تو اس حوالے سے عرض کردیں کہ جب ہشام بن عبد الملک (عہد حکومت: ۱۲۵-۱۰۵ھ) والی مقرر ہوا تو اس نے وہ اذان جس کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مقام "زورا" پر دلوائی تھی، منارہ پر کردیا اور ایک ہی مؤذن تھا جو وقتِ زوال کے بعد اذان دیتا تھا اور اس اذان کو جو عہد رسالت مآب ﷺ حضرت ابوبکر، وعمر اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے ابتدائی زمانے میں منارہ پر ہوتی تھی، خطیب کے سامنے کردیا۔[2]

چونکہ وہ ایک حکمراں تھا، اس لیے اس نے اس کو ہر جگہ نافذ کردیا اور اس کے

([1]) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب النداء یوم الجمعۃ (ح:۱۰۸۸) طبرانی/معجم کبیر (۱۴۵/۷، ح:۶۶۴۲)

([2]) ابن الحاج/المدخل، الکرسی الکبیر الذی یعملونہ فی الجامع (۲۹۶،۲۹۷/۲)

بعد پھر یہی طریقہ رائج ہو گیا، جیسا کہ ’’عنایہ شرح ہدایہ‘‘ میں ہے:

(وَإِذَاصَعِدَ الْإِمَامُ الْمِنْبَرَجَلَسَ وَأَذَّنَ الْمُؤَذِّنُونَ بَيْنَ يَدِي الْمِنْبَرِ) بِذَلِكَ جَرَى التَّوَارُثُ وَلَمْ يَكُنْ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ إِلَّا هَذَا الْأَذَانُ[1]

جب امام منبر پر بیٹھ جائے تو مؤذن منبر کے سامنے اذان دے، یہی امت کا توارث ہے۔ حضور ﷺ کے زمانے میں صرف یہی اذان تھی۔

فقہائے کرام نے منبر کے سامنے اذان ہونے پر کوئی تعرض نہیں کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اذان سے جو مقصد لوگوں کو نماز کی اطلاع دینا ہے وہ منارہ پر دی جانے والی اذان سے حاصل ہو جاتا ہے اور اذان ثانی سے صرف خطبہ کا اعلان ہے، لہٰذا مقصود حاصل ہو گیا، اس لیے پوری امت نے اسی کو اختیار کر لیا۔ پھر یہ کہ اذان مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ وہ نماز کی اطلاع کے لیے مشروع ہوئی ہے، اسی لیے مختلف اوقات میں اس میں تبدیلیاں ہوتی رہیں، اور اس تبدیلی سے بھی شریعت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس لیے بعد کے فقہا نے بھی اس کو جاری رکھا اور اپنی اپنی کتابوں میں اسی صورت کو لکھا ہے۔ البحر الرائق میں ہے:

(فَإِذَا جَلَسَ عَلَى الْمِنْبَرِ أُذِّنَ بَيْنَ يَدَيْهِ وَأُقِيمَ بَعْدَ تَمَامِ الْخُطْبَةِ) بِذَلِكَ جَرَى التَّوَارُثُ[2]

جب امام منبر پر بیٹھ جائے تو اس کے سامنے اذان دی جائے اور بعد خطبہ اقامت کہی جائے، اسی پر توارث ہے۔

مذکورہ باتوں سے یہ واضح ہو گیا کہ عہد رسالت اور عہد شیخین میں اذان ثانی مسجد کے اندر ہوتی تھی لیکن جب یہ اذان عہدِ ہشام میں اندر ہونے لگی تو پھر عنایہ اور بحر کے مطابق اسی پر تورث قائم ہو گیا جو آج تک جاری ہے۔

([1]) العنایۃ شرح الھدایۃ (۲/۴۱۷)

([2]) البحر الرائق، باب صلاۃ الجمعۃ (۲/۱۶۹)

اذان ثانی کا محل: ائمہ مجتہدین کے نزدیک

حضرت امام مالک

علامہ ابن عبد البر (۳۶۸-۴۶۳ھ) لکھتے ہیں:

والأذان الواجب لها إذا جلس الإمام على المنبر فإن أذن مؤذن في صومعة وأذن غيره بين يدي الإمام فلا بأس لأنه قد عمل به قديما في المدينة ... وقال مالك: الأذان بين يدي الإمام ليس من الأمر القديم[1]

جب امام منبر پر بیٹھ جائے تو جمعہ کے لیے اذان دینا واجب ہے، اگر ایک مؤذن منارہ سے اذان دے اور دوسرا امام کے سامنے سے اذان دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیوں کہ مدینہ منورہ کا قدیم معمول یہی ہے۔

کچھ سطور کے بعد لکھتے ہیں: لیکن امام مالک فرماتے ہیں: امام کے سامنے اذان دینا قدیم معاملہ نہیں ہے۔

امام دار الہجرۃ حضرت مالک رضی اللہ عنہ کے اس قول سے یہ واضح ہوا کہ امام کے سامنے مسجد کے اندر اذان دینا اگرچہ عہد رسالت میں نہیں تھا لیکن ان کے زمانے میں یہی مدینہ کا معمول بن گیا تھا۔ کیوں کہ امام مالک کے اس قول: بين يدي الإمام میں مواجہت کا معنی لیا جائے اور یہ کہا جائے کہ اس کا مطلب امام کے سامنے خارج مسجد یا باب مسجد پر اذان ہے تو پھر ان کے دوسرے جملے: ليس من الأمر القديم کا کوئی

([1]) الکافی فی فقہ اھل المدینۃ: باب صلاۃ الجمعۃ (۱/۲۵۰)

مطلب نہیں رہ جائے گا۔ کیوں کہ یہ مسلم ہے کہ پہلے ایک اذان ہوتی تھی جس سے مقصود مصلیوں کو نماز کے لیے پکارنا تھا اور وہ مسجد سے باہر ہوتی تھی۔ واضح رہے کہ امام کی پیدائش ۹۳ھ میں اور وفات ۱۷۹ھ میں ہوئی تھی۔

حضرت امام شافعی

یہ بیان ہوچکا کہ اموی دور میں اذان خطبہ مسجد کے اندر دینے کی شروعات ہوئی لیکن اس کے ساتھ ایک دوسری بدعت بھی شروع ہوئی کہ ایک ساتھ مسجد کے مختلف زاویے سے کئی اذانیں ہوتیں، ائمہ نے اس کو ناپسند کیا، اس لیے وہ بدعت رک گئی، پہلی بدعت یعنی اذان عند المنبر پر کسی نے کچھ نہیں کہا، وہ متوارث ہوگئی، امام محی الدین نووی (۶۷۶ھ) نے ان دونوں مسئلوں کے بارے میں امام شافعی (۲۰۴ھ) کا قول نقل کیا ہے، امام شافعی ائمہ مجتہدین میں سے ہیں اور علما نے انھیں دوسری صدی کا مجدد بھی تسلیم کیا ہے، آپ فرماتے ہیں:

أُحِبُّ أَنْ يَكُونَ لِلْجُمُعَةِ أَذَانٌ وَاحِدٌ عِنْدَ الْمِنْبَرِ وَيُسْتَحَبُّ أَنْ يَكُونَ الْمُؤَذِّنُ وَاحِدًا[1]

امام شافعی نے فرمایا کہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ جمعہ کے لیے منبر کے پاس [کئی اذانوں کی جگہ] ایک ہی اذان ہو اور [اذان و اقامت کے لیے] مستحب ہے کہ مؤذن بھی ایک ہی ہو۔

شافعی مذہب کے زبردست محدث اور فقیہ علامہ ابن حجر عسقلانی نے بھی اس اذان کے اندر ہونے کا قول کیا ہے، آپ لکھتے ہیں:

لَمَّا زِيدَ الْأَذَانُ الْأَوَّلُ كَانَ لِلْإِعْلَامِ وَكَانَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيِ الْخَطِيبِ

([1]) المجموع شرح المهذب، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (۱۲۴/۳)

لِلْإِنْصَاتِ[1] یعنی جب اذانِ اول کا اضافہ ہوا تو وہ اعلان کے لیے ہو گئی اور جو خطیب کے سامنے دی جاتی تھی وہ انصات کے لیے ہو گئی۔

اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ شافعیہ کے یہاں یہ اذان مسجد کے اندر ہوتی تھی۔

حضرت امام احمد بن حنبل

فقہ حنبلی کے مستند اور زبردست فقیہ علامہ ابن قدامہ حنبلی اپنے مشہور زمانہ کتاب "المغنی" میں فرماتے ہیں: وَقَدْ يَكُونُ النِّدَاءُ بَيْنَ يَدَيْ الْمِنْبَرِ، فَلَا يَسْمَعُهُ إلَّا مَنْ فِي الْجَامِعِ[2]

یعنی کبھی اذان منبر کے سامنے ہوتی ہے تو اس اذان کو صرف وہی سنتے ہیں جو مسجد میں ہوتے ہیں۔

اسی طرح فقہ حنبلی کی مشہور کتاب "کشاف القناع عن متن الاقناع" میں ہے: (وَالْأَفْضَلُ) أَنْ يَكُونَ الْأَذَانُ بَيْنَ يَدَيْ الْخَطِيبِ (مِنْ مُؤَذِّنٍ وَاحِدٍ) لِعَدَمِ الْحَاجَةِ إلَى الزِّيَادَةِ لِأَنَّهُ لِإِعْلَامِ مَنْ فِي الْمَسْجِدِ وَهُمْ يَسْمَعُونَهُ.[3]

یعنی خطیب کے سامنے ایک ہی مؤذن کا اذان دینا افضل ہے، مزید کی کوئی حاجت نہیں ہے؛ کیوں کہ اس کے ذریعہ سے انہی کو باخبر کرنا ہے جو مسجد میں موجود ہیں اور وہ لوگ ایک مؤذن کی آواز سن رہے ہیں۔

ان مذکورہ عبارتوں سے معلوم ہوا کہ حنابلہ کے نزدیک بھی اذان ثانی مسجد کے اندر ہوتی تھی۔

حضرت امام اعظم

امام محمد کی ظاہر الروایۃ میں سب سے اہم اور مشہور کتاب مبسوط ہے، اس میں

([1]) فتح الباری، باب الاذان یوم الجمعۃ (۳/۳۱۸)

([2]) المغنی، کتاب صلاۃ الجمعۃ، فصل: مقدار البعد الذی تلزم فیہ الجمعۃ (۲/۲۱۴)

([3]) کشاف القناع عن متن الاقناع، باب صلاۃ الجمعۃ، فصل یسن ان یغتسل للجمعۃ (۲/۴۲)

اذان ثانی کا ذکر چار جگہ آیا ہے، تین جگہ ”عندالمنبر“ کا لفظ ہے اور ایک جگہ علی المنبر کا لفظ ہے جس سے امام اعظم کے نزدیک بھی اس اذان کا مسجد کے اندر ہونا سمجھ میں آتا ہے، مبسوطِ سرخسی (۴۹۰ھ) میں ہے:

فَكَانَ الطَّحَاوِيُّ يَقُولُ هُوَ الْأَذَانُ عِنْدَ الْمِنْبَرِ بَعْدَ خُرُوجِ الْإِمَامِ ... فَكَانَ الْحَسَنُ بْنُ زِيَادٍ يَقُولُ الْمُعْتَبَرُ هُوَ الْأَذَانُ عَلَى الْمَنَارَةِ لِأَنَّهُ لَوْ انْتَظَرَ الْأَذَانَ عِنْدَ الْمِنْبَرِ يَفُوتُهُ أَدَاءُ السُّنَّةِ وَسَمَاعُ الْخُطْبَةِ وَرُبَّمَا تَفُوتُهُ الْجُمُعَةُ إذَا كَانَ بَيْتُهُ بَعِيدًا عَنْ الْجَامِعِ وَالْأَصَحُّ أَنَّ كُلَّ أَذَانٍ يَكُونُ قَبْلَ زَوَالِ الشَّمْسِ فَذَلِكَ غَيْرُ مُعْتَبَرٍ وَالْمُعْتَبَرُ أَوَّلُ الْأَذَانِ بَعْدَ زَوَالِ الشَّمْسِ سَوَاءٌ كَانَ عَلَى الْمِنْبَرِ أَوْ عَلَى الزَّوْرَاءِ-(مبسوط، ۱ / 136)

(المبسوط، کتاب الصلاۃ، باب الأذان(۱/۱۳۴)

امام طحاوی (۴۹۰ھ) فرماتے ہیں کہ [خرید و فروخت کی ممانعت اور ذکر کی طرف سبقت کے سلسلے میں] اس اذان کا اعتبار ہوگا جو امام کے خطبہ کے لیے نکلتے وقت منبر کے پاس دی جاتی ہے... اور حسن بن زیاد (۲۰۴ھ) فرماتے ہیں کہ اس اذان کا اعتبار ہوگا جو منارہ پر ہوتی ہے، کیوں کہ اگر اس اذان کا انتظار کیا جائے جو منبر کے پاس ہوتی ہے تو ہو سکتا ہے کہ سنت کی ادائیگی اور خطبہ سننا بھی فوت ہو جائے، بسا اوقات نماز جمعہ بھی فوت ہو سکتی ہے، جب گھر مسجد سے دور ہو۔ اصح یہ ہے کہ جو اذان زوال سے پہلے ہو وہ معتبر نہیں ہے بلکہ معتبر وہ پہلی اذان ہے جو زوال کے بعد ہوتی ہے خواہ منبر پر ہو یا مقام زوراء پر۔

یہاں یہ قول حسن بن زیاد کی طرف منسوب ہو کر بیان کیا گیا ہے جب کہ یہی قول ”البنایہ فی شرح الہدایہ“ میں حضرت حسن بن زیاد کی روایت سے امام ابو حنیفہ کی

طرف منسوب ہے۔[1]

بہرحال اس مذکورہ بالا عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ اس بات میں اختلاف ہے کہ سعی کا وجوب اور خرید و فروخت کی حرمت کس اذان پر ثابت ہوگی۔ امام طحاوی فرماتے ہیں کہ منبر کے پاس دی جانے والی اذان سے سعی کا وجوب اور خرید و فروخت کی حرمت ثابت ہوگی اور امام حسن بن زیاد امام ابو حنیفہ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس اذان سے سعی کا وجوب اور خرید و فروخت کی حرمت ثابت ہوگی جو منارہ پر دی جاتی ہے؛ کیوں کہ منبر کے پاس اذان سے اگر سعی کو واجب کریں گے تو سنت وغیرہ کی ادائیگی فوت ہو جائے گی۔

اسی طرح معتکف کے بارے میں ہے کہ اگر اسے کسی دوسرے مسجد میں جمعہ کی نماز کے لیے جانا ہو تو وہ اپنی مسجد سے کب نکلے گا تو اسے حکم ہے کہ وہ ایسے وقت میں نکلے کہ مسجد پہنچ کر منبر کے پاس اذان ہونے سے پہلے چار رکعت نماز ادا کر سکے، مبسوط کی عبارت یہ ہے: يَخْرُجُ فِي وَقْتٍ يُمْكِنُهُ أَنْ يَأْتِيَ الْجَامِعَ فَيُصَلِّيَ أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ قَبْلَ الْأَذَانِ عِنْدَالْمِنْبَرِ[2]

یعنی وہ ایسے وقت میں نکلے جس میں جامع مسجد پہنچ کر منبر کے پاس اذان ہونے سے پہلے چار رکعات نماز ادا کر سکے۔

مبسوط کی مذکورہ عبارتوں سے پتہ چلتا ہے کہ احناف بھی اس اذان کے اندرون مسجد ہونے کے قائل ہیں، کیوں کہ کہیں بھی اس اذان کے لیے "عند الباب" یا اس کے ہم معنی کلمات نہیں آئے ہیں، بلکہ ہر جگہ عند المنبر یا علی المنبر ہی کے کلمات آئے ہیں، جو منبر سے قریب اذان دیے جانے پر صریح ہے، اس پر مزید قیل و قال کی گنجائش ہی ختم ہو جاتی ہے، اس لیے کہ یہاں واضح طور پر عند کا لفظ موجود ہے۔

([1]) البنایۃ شرح الھدایۃ، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعۃ (۳/۹۰)
([2]) المبسوط للسرخسی ۳/۱۱۸)

اذان عند المنبر پر امت کا توارث

سنت اور تواتر و توارث میں فرق:

سنت کے لغوی معانی طریقہ، دستور، طبیعت، عادت اور شریعت کے ہیں اور اصطلاح شرع میں اس کی تعریف کئی طرح سے کی جاتی ہے:

علامہ ابن عابدین شامی سنت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

مَا ثَبَتَ بِقَوْلِهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ أَوْ بِفِعْلِهِ وَلَيْسَ بِوَاجِبٍ وَلَا مُسْتَحَبٍّ [1] جو رسول اللہ ﷺ کے قول یا فعل سے ثابت ہو اور واجب و مستحب بھی نہ ہو۔

علامہ علاؤالدین بخاری حنفی (۷۳۰ھ) نے سنت کی تعریف میں مزید وسعت پیدا کی ہے، آپ فرماتے ہیں:

وَحَدُّ السُّنَّةِ هُوَ الطَّرِيقَةُ الْمَسْلُوكَةُ فِي الدِّينِ مِنْ غَيْرِ افْتِرَاضٍ، وَلَا وُجُوبٍ [2] سنت دین میں اس رائج طریقے کو کہتے ہیں جو فرض و واجب نہ ہو۔

توارث؛ قرنا بعد قرن امت کے تعامل کا نام ہے۔ [3]

تعامل: یہ باب تفاعل کا مصدر ہے اور "عمل" سے بنا ہے، اس کا لغوی معنی دو

([1]) رد المحتار مع الدر المختار، کتاب الطھارۃ، سنن الوضوء (۱۰۴/۱)

([2]) کشف الاسرار شرح اصول البزدوی (۳۰۲/۲)

([3]) فتاوی رضویہ (۲۳۸/۲۸)

یا دو سے زائد لوگوں کا شریک ہونا اور اصطلاح شرع میں تعامل اسے کہتے ہیں جس پر کثرت سے لوگ عمل پیرا ہوں۔

البحر الرائق میں ہے: التَّعَامُلُ هو الْأَكْثَرُ اسْتِعْمَالًا [1]

تعامل وہ ہے جس پر کثرت سے عمل ہو رہا ہو۔

"تعامل و توارث" اور اسی طرح "عرف" فقہی اعتبار سے سب ایک ہی حکم رکھتے ہیں۔ اگر یہ تعامل و توارث اور عرف عہد رسالت سے ہو تو یہ سنتِ تقریری بھی ہے اور تعامل و توارث بھی۔ اسی لیے اس کو سنتِ متواترہ یا سنتِ متوارثہ کہتے ہیں، یہ سنت قطعیت کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے لیے کسی خاص سند کی حاجت نہیں۔

اسی طرح سے صحابہ کرام یا بعد کے کسی دور میں کسی امر کا تعامل و توارث ہو گیا ہو وہ بھی حجت شرعیہ کی ایک قسم ہے، اس سے بھی احکام ثابت ہوتے ہیں، کیوں کہ ہر زمانے میں پوری امت کا کسی غیر شرعی حکم پر متفق ہونا محال ہے، ارشاد نبوی ہے:

لَا يَجْمَعُ اللهُ هَذِهِ الْأُمَّةَ عَلَى الضَّلَالَةِ أَبَدًا [2]

اللہ تعالیٰ اِس امت کو کبھی بھی گمراہی پر متفق نہیں کرے گا۔

لیکن اگر یہ تعامل کسی نص صریح کے حکم کو ختم کر رہا ہو تو اسے بلا کسی علت و سبب کے دلیل شرعی نہیں بنائیں گے۔ علامہ ابن عابدین شامی اس کی حجیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

إِنَّ الْعُرْفَ الْعَامَ لَا يُعْتَبَرُ إِذَا لَزِمَ مِنْهُ تَرْكُ الْمَنْصُوْصِ وَ إِنَّمَا يُعْتَبَرُ إِذَا لَزِمَ مِنْهُ تَخْصِيْصُ النَّصِّ [3] عرف عام اس وقت حجت ہوتا ہے جب اس سے نص کا ترک لازم نہ آئے، ہاں! اگر اس سے صرف نص کی تخصیص لازم آتی ہو تو اس

([1]) البحر الرائق (۲۱۹/۵)

([2]) حاکم/المستدرک، کتاب العلم (۲۰۰/۱، ح:۳۹۲)

([3]) رسائل ابن عابدین شامی، الرسالۃ الاولی (ص:۴۸)

سے اس کی حجیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس کی ایک مثال البحر الرائق میں ہے کہ خلفائے راشدین اور عمین کریمین رضی اللہ عنہم کا ذکر جمعہ کے خطبہ میں نہ تھا لیکن یہ مسلمانوں کے تعامل و توارث کی وجہ سے جائز قرار دیا گیا ہے، چنانچہ صاحب بحر رقم طراز ہیں: وَذِكْرُ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ مُسْتَحْسَنٌ بِذَلِكَ جَرَى التَّوَارُثُ وَيَذْكُرُ الْعَمَّيْنِ.اه[1]

یعنی خلفائے راشدین اور عمین کریمین حضرت امیر حمزہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم کا ذکر جمعہ کے خطبہ میں مستحسن ہے، کیوں کہ اس پر مسلمانوں کا توارث ہے۔

اسی طرح اعلی حضرت فاضل بریلوی ذکر ولادت کے موقع پر کھڑے ہو کر صلاۃ وسلام پڑھنے کو تعامل سے ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مولا عز و جل توفیق دے تو منصف غیر متعصب کے لیے اسی قدر کافی کہ یہ فعل اعنی قیام وقت ذکر ولادت حضور خیر الانام علیہ وعلی آلہ افضل الصلاۃ والسلام صدہا سال سے بلاد دار الاسلام میں رائج و معمول اور اکابر علما میں مقرر و مقبول[2]

ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ زمانہ رسالت مآب ﷺ سے دوسری صدی کے اوائل تک اذانِ خطبہ یعنی اذان ثانی مسجد کے باہر ہی ہوتی تھی لیکن منبر کے سامنے مسجد کے اندر اذان دینے کا عمل ہشام بن عبد الملک کے زمانے سے شروع ہوا، یہ ۱۰۵ھ میں خلیفہ ہوا پھر اس کے بعد سے آج تک پوری امت کا عمل اسی پر ہوتا رہا ہے۔

سیدنا شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ (۴۷۰-۵۶۱ھ) اپنی کتاب ''الغنية'' میں فرماتے ہیں: يجتنب البيع والشراءبعد الأذان عند المنبر لقوله تعالى وهذا هو الأذان الذي كان على عهد رسول الله ﷺ، وهوواجب عندنا ولغيرهذه الصلاة فرض علي الكفايةوروي عنه أنه

([1])البحر الرائق (۲/۱۶۰)

([2])فتاوی رضویہ (۲۶/۵۰۴)

سنة.وأما أذان المنارة أمر به عثمان بن عفان رضي الله عنه في زمانه لمصلحة عامة، وهي إعلام الغائبين عن الأمصار والقري فلايبطل البيع والشراء[1]

خرید وفروخت منبر کے پاس دی جانے والی اذان سے حرام ہوجاتی ہے، کیوں کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ (الجمعۃ:۹) (اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن اذان ہوجائے تو ذکر الٰہی کی طرف چل پڑو اور خرید وفروخت یک لخت بند کردو۔) حضور ﷺ کے زمانے میں صرف یہی ایک اذان تھی، یہ ہمارے نزدیک واجب ہے اور اس نماز کے علاوہ اذان فرض کفایہ ہے اور یہ بھی مروی ہے کہ اذان سنت ہے۔ اور رہ گئی [جمعہ کے دن] منارہ پر دی جانے والی اذان تو یہ وہ اذان ہے جس کا حکم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں ایک مصلحت عامہ کی وجہ سے دیا تھا اور وہ یہ تھا کہ اس اذان کے ذریعہ شہر اور قصبہ سے دور لوگوں کو بھی جمعہ کی خبر ہوجائے، لہٰذا اس اذان سے خرید وفروخت حرام نہیں ہوگی۔

آپ کے اس ارشاد سے پتا چلتا ہے کہ آپ کے زمانے میں بھی اذانِ خطبہ مسجد کے اندر منبر کے پاس ہی ہوتی تھی، جیسا کہ عند المنبر کے الفاظ سے اس کی

([1]) الغنیۃ لطالبی الحق عزوجل، القسم الرابع فی فضائل الاعمال، (فصل) اما صلاۃ الجمعۃ (۲/۲۱۳)

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ کتاب غوث الثقلین شیخ عالم پیر دستگیر شہنشاہ بغداد قدس اللہ سرہ کی نہیں ہے لیکن ان لوگوں کے اس نظریہ پر بعض علما نے کلام کیا ہے ہے جیسے: علامہ عبد الحی لکھنوی فرنگی محلی اپنی کتاب "الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل" میں اس کتاب کی نسبت حضور غوث پاک کی طرف ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: علامہ ابن حجر اور اکابر علما کی کتابوں میں اس کی نسبت ان ہی کی طرف مذکور ہے۔ لہٰذا ان کی تصنیفات کی فہرست سے اسے سرے سے خارج کردینا قابل قبول نہیں ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ جو بھی اس کتاب کا اول تا آخر گہرائی سے مطالعہ کرے گا اس پر قطعی طور پر منکشف ہوجائے گا کہ یہ کتاب ان ہی کی تصنیف کردہ ہے۔ (الرفع والتکمیل، ص: ۳۸۰) اعلی حضرت فاضل بریلوی بھی اسی طرف مائل ہیں کہ یہ کتاب حضور غوث پاک کی ہے۔ ملاحظہ کریں: فتاوی رضویہ (۲۹/۲۲۲)

صراحت ہورہی ہے۔

حضرت علامہ شیخ یوسف بن سعید بن اسماعیل نے حاشیہ سفطی میں اذان ثانی کے متعلق لکھاہے:و الحاصل أن البيع حرام عند الأذان الثانی سواء كان الأذان علي المنارة كما كان في الزمن القديم وعليه أهل المغرب إلي الآن أو كان بين يدي الامام كما هو في بلادناالآن[1]یعنی حاصل گفتگو یہ ہے کہ خرید و فروخت اذان ثانی کے وقت حرام ہے خواہ وہ منارہ پر ہو جیسا کہ قدیم زمانے میں ہوتی تھی اور اہل مغرب آج تک اس کو منارہ پر ہی دے رہے ہیں یا امام کے سامنے ہو جیسا کہ ہمارے ملکوں میں ہوتی ہے۔

اس حاشیہ میں جہاں یہ بات کہی گئی ہے کہ اہل مغرب آج تک اس اذان کو منارہ پر ہی دے رہے ہیں وہیں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ ”ہمارے ملکوں میں یہ اذان مسجد کے اندر ہوتی تھی“ اور صاحب حاشیہ علامہ شیخ یوسف بن سعید بن اسماعیل (متوفی: ۱۱۹۳ھ) مصر کے رہنے والے تھے، گویا کہ مصر میں یہ اذان مسجد کے اندر ہوتی تھی، آج بھی وہاں ہر چھوٹی بڑی مسجد میں یہ اذان مسجد کے اندر ہی بالکل منبر کے سامنے ہوتی ہے۔

یہ تو عالم عرب کی بات ہوئی کہ وہاں آج بھی یہ اذان مساجد اہل سنت میں مسجد کے اندر ہی ہوتی ہے۔

اور برصغیر میں اعلی حضرت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی کی تحقیق کے بعد جہاں ان کے متبعین ہوئے اور ان کا فتوی نافذ کیا گیا آج صرف وہیں اذان خطبہ مسجد کے باہر ہوتی ہے اور جن علمی و روحانی مراکز نے اپنے اسلاف کے توارث کی حفاظت کی، وہاں آج بھی اذان ثانی داخل مسجد عند المنبر ہی ہوتی ہے۔

([1]) حاشیۃ السفطی علی شرح ابن ترکی علی العشماویۃ، باب صلاۃ الجمعۃ، ص: ۱۵۳)

ہندوستان کے اندر ماضی میں اس سلسلے میں اہل اسلام کا توارث کیا تھا؟ اس تعلق سے اعلی حضرت فاضل بریلوی کے دو اقتباسات پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

آپ اپنے مکتوب بنام شاہ محمد حمد اللہ کمال [1] میں لکھتے ہیں:

''اذان ثانی کا مسئلہ نیاز مند کے یہاں ۳۵ ربرس سے جاری ہے۔ اکابر علما آئے اور دیکھا اور انکار نہ کیا۔ بارہ برس ہوئے کہ 'تحفہ حنفیہ' [عظیم آباد] میں اس بارے میں فقیر کا فتوی چھپا۔ بعض بلاد میں جب ہی سے اس پر عمل شروع ہوا اور جہاں نہ ہوا، فقیر نے کوئی تعرض نہ کیا کہ زمانہ کثرت جہل، شیوع فتن کا ہے۔ مگر بحمد اللہ کسی طرف سے کوئی صدائے مخالفت ہے نہ آئی۔''

آپ اپنے ایک اور مکتوب بنام حضرت مولانا انوار اللہ فاروقی [2] میں لکھتے ہیں:

''حضرت کو معلوم ہو کہ فقیر کا یہ فتوی ۲۲ [۱۳] ھ میں 'تحفہ حنفیہ' میں چھپ کر ملک میں شائع ہو چکا۔ نہ علما نے انکار فرمایا، نہ جہال نے شور مچایا''

فاضل بریلوی کے ان دونوں مکتوبات سے صاف واضح ہے کہ آپ کے فتوی سے پہلے ہندوستان کے تمام شہروں میں اذان ثانی مسجد کے اندر ہی ہوتی تھی، ورنہ ان کے اپنے خیال کے مطابق علما کے انکار اور جہال کے شور مچانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فاضل بریلوی کی اس تحریر کے بین السطور سے یہ بالکل واضح ہے کہ ان کا مذکورہ فتوی ہندوستان میں رائج تعامل و توارث کے خلاف تھا۔

اذان ثانی کے داخل مسجد ہونے کی حکمت:

اس پوری مدت میں امت کے جلیل القدر فقہا و علما اور مشائخ گزرے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے اِس اذان کو مسجد سے باہر دلوانے پر اصرار نہیں کیا، بلکہ ہر صدی

([1]) یہ مکتوب ۲۳ جمادی الاولی ۱۳۳۲ھ میں لکھا گیا، یہ قلمی مکتوب غیر مطبوع ہے اور ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی کی ملکیت میں ہے۔ (ماہنامہ سنی دعوت اسلامی، ممبئی اگست ۲۰۱۶ء)

([2]) مکتوبات امام احمد رضا بریلوی، ص:۹۷، از مولانا محمود احمد قادری

میں مصلحین زماں اور احیاے سنت کے علم بردار آتے رہے، سب نے اپنے زمانے میں دین میں در آنے والی بے شمار بدعات و خرافات کو دور کیا اور اپنی نادر و نایاب تحقیق سے سنت کو زندہ کیا، لیکن اس مسئلے میں کسی نے بھی کوئی قدم نہیں اُٹھایا بلکہ مسجد کے اندر ہی اذان ثانی کو جاری رکھا، اس کی وجہ یہی تھی کہ اس اذان سے مقصود اب صرف یہ رہ گیا تھا کہ جو لوگ مسجد میں آچکے ہیں اور وہ نماز یا دیگر اوراد و وظائف میں مشغول ہیں، انھیں یہ اطلاع دے دی جائے کہ اب وہ لوگ خطبہ سننے کی طرف متوجہ ہوں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

قَالَ الْمُهَلَّبُ: الْحِكْمَةُ فِي جَعْلِ الْأَذَانِ فِي هَذَا الْمَحَلِّ لِيَعْرِفَ النَّاسُ بِجُلُوسِ الْإِمَامِ عَلَى الْمِنْبَرِ فَيُنْصِتُونَ لَهُ إِذَا خَطَبَ كَذَا قَالَ، وَفِيهِ نظر، فَإِن فِي سِيَاق بن إِسْحَاقَ عِنْدَ الطَّبَرَانِيِّ وَغَيْرِهِ عَنْ الزُّهْرِيِّ فِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنَّ بِلَالًا كَانَ يُؤَذِّنُ عَلَى بَاب الْمَسْجِد فَالظَّاهِرُ أَنَّهُ كَانَ لِمُطْلَقِ الْإِعْلَامِ لَا لِخُصُوصِ الْإِنْصَاتِ نَعَمْ لَمَّا زِيدَ الْأَذَانُ الْأَوَّلُ كَانَ لِلْإِعْلَامِ وَكَانَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيِ الْخَطِيبِ لِلْإِنْصَاتِ.

مہلب نے کہا: داخل مسجد اذان دینے کی حکمت یہ ہے کہ لوگوں کو امام کے منبر پر جلوہ افروز ہونے کا علم ہو جائے تاکہ وہ خطبہ کی سماعت کے لیے خاموش ہو جائیں۔ ایسا ہی کہا ہے، لیکن اس حکمت پر اعتراض ہے، کیوں کہ امام طبرانی وغیرہ نے جو ابن اسحاق سے روایت کیا ہے اور انھوں نے زہری سے روایت کیا ہے، اس میں یہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ مسجد کے دروازے پر اذان دیتے تھے۔ اس سے یہی ظاہر ہے کہ وہ مطلق اعلام کے لیے تھا نہ کہ صرف خاموش کرانے کے لیے۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ جب اذان اول کا اضافہ ہوا تو وہ اعلام کے لیے ہو گیا اور جو اذان

خطیب کے سامنے دی جاتی تھی اب وہ لوگوں کو خاموش کرنے کے لیے ہوگئی۔[1]

اسی طرح ''کشاف القناع عن متن الاقناع'' میں ہے:

(وَالْأَفْضَلُ) أَنْ يَكُونَ الْأَذَانُ بَيْنَ يَدَيْ الْخَطِيبِ (مِنْ مُؤَذِّنٍ وَاحِدٍ) لِعَدَمِ الْحَاجَةِ إلَى الزِّيَادَةِ لِأَنَّهُ لِإِعْلَامِ مَنْ فِي الْمَسْجِدِ وَهُمْ يَسْمَعُونَهُ۔[2]

یعنی خطیب کے سامنے ایک ہی مؤذن کا اذان دینا افضل ہے، مزید کی کوئی حاجت نہیں ہے؛ کیوں کہ اس کے ذریعہ سے انہی کو باخبر کرنا ہے جو مسجد میں موجود ہیں اور وہ لوگ ایک مؤذن کی آواز سن رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج وہ لوگ بھی جو اس اذان کو مسجد کے باہر دینے پر مصر ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ باہر والوں کے لیے اعلام ہے وہ بھی آج مائک کے زمانے میں بھی مائک سے اذان ثانی نہیں دیتے، گویا کہ یہ بھی اِس اذان کو عملاً اندر والوں ہی کے لیے مانتے ہیں اور اگر ان کو اب بھی اسی بات پر اصرار ہے کہ یہ باہر والوں کے لیے ہی دی جاتی ہے تو اسے چاہیے کہ اس اذان کو بھی مائک سے دیں کیوں کہ اعلامِ کامل اسی صورت میں ہوگا جب کہ یہ اذان بھی مائک سے دی جائے جیسا کہ اور اذانیں دی جاتی ہیں۔

خارج مسجد اذان کے قائلین علما اور ان کے دلائل:

اذان خطبہ کے مسجد سے باہر ہونے کے قائلین کچھ علما رہے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا ذکر ان کے دلائل کے ساتھ کیا جاتا ہے اور پھر ان دلائل کا تجزیہ کیا جائے گا۔

([1]) فتح الباری، باب الاذان یوم الجمعۃ (۳۱۸/۳)

([2]) کشاف القناع عن متن الاقناع، باب صلاۃ الجمعۃ، فصل یسن ان یغتسل للجمعۃ (۴۲/۲)

ان میں پہلا نام ابن رشد قرطبي مالکی (۵۲۰ھ)[1] کا ہے، آپ لکھتے ہیں:

والأذان بين يدي الإمام في الجمعة مكروه؛ لأنه محدث[2]

جمعہ کے دن خطیب کے سامنے اذان دینا مکروہ ہے کیوں کہ یہ بدعت ہے۔

دوسرا نام علامہ ابو عبد اللہ محمد بن محمد عبدري فاسي معروف بہ ابن الحاج مالکی (۷۳۷ھ) کا ہے، جنھوں نے مسجد کے اندر اذان خطبہ کو بدعت قرار دیا ہے، آپ لکھتے ہیں: أَنَّ فِعْلَ ذَلِكَ فِي الْمَسْجِدِ بَيْنَ يَدَيْ الْخَطِيبِ بِدْعَةٌ... مِمَّا أَحْدَثَهُ هِشَامُ بْنُ عَبْدِ الْمَلِكِ... ثُمَّ تَطَاوَلَ الْأَمْرُ عَلَى ذَلِكَ حَتَّى صَارَ بَيْنَ النَّاسِ كَأَنَّهُ سُنَّةٌ مَعْمُولٌ بِهَا[3]

اذان کا مسجد کے اندر ہونا بدعت ہے... اس کے موجد ہشام بن عبد الملک ہیں... پھر اس بدعت کا رواج اس قدر ہو گیا گویا کہ یہی سنت متوارثہ ہو۔

واضح رہے کہ علامہ ابن الحاج مالکی کی وفات ۷۳۷ھ میں ہوئی ہے اور ہشام کی وفات ۱۲۵ھ میں ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بقول علامہ ابن الحاج دوسری صدی سے آٹھویں صدی تک لوگ اذان خطبہ کو مسجد کے اندر اس طرح دیتے تھے جیسے وہی سنت متوارثہ ہو۔

تیسرا نام علامہ ابراھیم بن موسی بن محمد معروف بہ شاطبي (۷۹۰ھ) کا ہے، یہ بھی مالکی عالم دین ہیں۔ اصولي اور حافظ حدیث ہیں، آپ کا تعلق غرناطہ سے ہے۔

---

(1) ابن رشد نام کے دو عالم گزرے ہیں: (۱) جن کا پورا نام ابو الولید محمد بن احمد بن رشد قرطبی (۵۲۰ھ) یہ ابن رشد جد (دادا) کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی تصانیف میں البیان والتحصیل، المقدمات الممھدات مشہور ہیں۔ (۲) ابو الولید محمد بن احمد بن محمد بن احمد بن رشد قرطبی (۵۹۵ھ) یہ ابن رشد حفید (پوتا) کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی معروف کتابیں "بدایۃ المجتھد ونھایۃ المقتصد، کتاب النفس، حرکۃ الفلک" وغیرہ ہیں۔

(2) البیان والتحصیل، کتاب الصلاۃ (۱/۲۴۳)

(3) المدخل لابن الحاج، فصل الکرسی الکبیر الذی یعملونہ فی الجامع (۲/۲۰۸)

آپ فرماتے ہیں:

وَنَقْلُ الْأَذَانِ يَوْمَ الْجُمْعَةِ مِنَ الْمَنَارِ وَجَعْلُهُ قُدَّامَ الْإِمَامِ.[1]

اذان خطبہ کو منارے سے منتقل کرکے امام کے سامنے کردینا بدعت ہے۔

چوتھا نام علامہ ابوالحسنات عبدالحی انصاري فرنگی محلی (۱۳۰۴ھ) کا ہے، آپ لکھتے ہیں:

[وإذا جلس على المنبر أذن ثانيا بين يديه] أى مستقبل الإمام فى المسجد كان أو خارجه والمسنون هو الثانى۔[2]

[جب امام منبر پر بیٹھ جائے اس وقت اس کے سامنے اذان دی جائے] یعنی امام کے سامنے اذان دی جائے مسجد کے باہر یا اندر۔ اور باہر دینا مسنون ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ فرنگی محلی، اذان ثانی کے صرف باہر مسنون ہونے کے قائل ہیں لیکن مسجد کے اندر ہونے کو بلا کراہت جائز سمجھتے ہیں۔

پانچواں نام اعلی حضرت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی (۱۳۴۰ھ) کا ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق آپ پہلے حنفی عالم ہیں جو مسجد کے اندر اذان ثانی کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں: ''مسجد میں اذان [ثانی] مکروہ ہے''[3]

اور آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوستان میں اس اذان کو باہر کروانے والا میں ہی ہوں۔ ان کی عبارت یہ ہے:

الحمد للہ! یہاں اس سنتِ کریمہ کا احیاء رب عزوجل نے اس فقیر کے ہاتھ پر کیا، میرے یہاں مؤذنوں کو مسجد میں اذان دینے سے ممانعت ہے، جمعہ کی اذانِ ثانی بحمد اللہ تعالی منبر کے سامنے دروازہ مسجد پر ہوتی ہے جس طرح زمانہ اقدس حضور پر

([1]) الاعتصام للشاطبی، الباب الخامس فی احکام البدع الحقیقیۃ والاضافیۃ والفرق بینھما (۴۹۱/۱)
([2]) عمدۃ الرعایہ علی شرح الوقایۃ، کتاب الجمعہ (۳۳۳/۲)
([3]) فتاوی رضویہ (۵۰۲/۸)

نور سید عالم ﷺ و خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم میں ہوا کرتی تھی۔[1]

فاضل بریلوی کی اس عبارت سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ نے اس سنت کریمہ کا احیا فرما کر سب سے پہلے اپنی مسجد سے اس امر کی شروعات کی جس پر آپ سے پہلے نہ آپ کے آباواجداد کا عمل تھا اور نہ آپ کے مشائخ کا۔

آپ سے پہلے مالکی علما میں علامہ ابن رشد، علامہ ابن الحاج اور علامہ شاطبی اگرچہ اس بات کے قائل تھے کہ یہ بدعت ہے لیکن ان میں سے کسی کے حوالے سے ہمیں یہ نہیں ملتا کہ انھوں نے اذان ثانی کے خارج مسجد کرانے کی تحریک چلائی ہو اور خارج مسجد رائج کرنے کی کوشش کی ہو۔

اس سیاق میں چھٹا نام معاصر سلفی محقق ناصر الدین البانی (۱۴۲۰ھ) کا ہے۔ اہل ظواہر، سلفی جماعت کے سرخیل و ناشر شمار کیے جاتے ہیں، سلف صالحین، مشائخ صوفیہ اور ائمۂ احناف کے مسائل و رسومات کو بدعات قرار دینا اس جماعت کا وتیرہ ہے، ان ہی مسائل میں سے اذان ثانی بھی ہے، جس کو دوسری صدی ہجری کے اوائل سے اہل ایمان "حسن" سمجھ کر مسجد کے اندر دے رہے تھے اس کو انھوں نے بدعت میں شامل کیا اور پھر اس کی تردید کی، شیخ البانی لکھتے ہیں:

ولا في المسجد عند المنبر فإنه بدعة أموية[2]

منبر کے پاس مسجد کے اندر اذان دینا امویوں کی ایجاد کی ہوئی بدعت ہے۔

دلائل کا تجزیہ:

اب ہم ان لوگوں کے دلائل کا تجزیہ کرتے ہیں۔

توارث و عرف بہ مقابلہ احیاے سنت:

اذان ثانی کو داخل مسجد مکروہ قرار دینے والوں کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے

([1])فتاوی رضویہ (۵۰۱/۸)

([2])لاجوبۃ النافعۃ عن اسئلۃ لجنۃ مسجد الجامعۃ (ص:۲۸)

کہ عہد رسالت وصحابہ میں کبھی بھی کوئی اذان اندر نہیں دی گئی۔ اس لیے اندر اذان دینا مکروہ ہے۔

اس پر عرض یہ ہے کہ اگر درایت، مقصد شرع اور توارث و عرف کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اور اہل ظواہر کی عینک سے دیکھا جائے تو یہ کہنا ہی صحیح ہوگا کہ داخل مسجد اذان دینا بدعت ہے اور خارج مسجد سنت ہے۔

لیکن اگر اذان کی مقصدیت کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اذان میں سنت یہ ہے کہ اس کے ذریعے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو وقت کے داخل ہونے اور جماعت قائم کرنے کی خبر دی جائے، اس لیے حدیث میں اذان دینے کے لیے کوئی جگہ خاص نہیں کی گئی ہے بلکہ حدیث سے صرف اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ اذان ایسی جگہ دی جائے جہاں سے دور دور تک آواز پہنچ سکے، اسی حکمت کے پیش نظر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ایک اذان بازار میں دلوائی تھی تاکہ دور دراز سے لوگ جمعہ میں حاضر ہوسکیں۔

اوائل قرن ثانی میں یہ محسوس کرلیا گیا کہ اب جمعہ کے دن پہلی اذان سے دور دور تک آواز پہنچ جاتی ہے، اسی لیے دوسری اذان کو مسجد کے اندر کر دی گئی تاکہ حاضرین سنن ونوافل ترک کرکے خطبہ سننے کے لیے تیار ہوجائیں، یہی وجہ ہے کہ آج لاؤڈ اسپیکر کے زمانے میں بھی خطبہ کی اذان لاؤڈ اسپیکر سے نہیں دی جاتی ہے، جس سے فریقین پر واضح ہے کہ اب اِس اذان کا مقصود دور تک آواز پہنچانا نہیں رہا۔ اور جب یہ اذان صرف مسجد کے اندر موجود لوگوں ہی کے لیے رہ گئی تو اب اندر اذان دینا مکروہ نہیں ہوگا، جیسا کہ علامہ ابن عابدین شامی ''امداد'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

إِذَا كَانَ التَّفْوِيتُ لِأَمْرٍ عَامٍّ فَالْأَذَانُ فِي الْمَسْجِدِ لَا يُكْرَهُ لِانْتِفَاءِ الْعِلَّةِ.

جب کسی امر عام کی وجہ سے لوگوں کی نماز فوت ہوجائے تو مسجد میں اذان دینا

مکروہ نہیں ہوگا کیوں یہاں مکروہ ہونے کی علت مفقود ہے۔[1]

علامہ شامی کا مقصود یہ ہے کہ داخل مسجد اذان ہونے کی جو علت تھی وہ صورت مذکورہ میں مفقود ہے۔ داخل مسجد اذان کی کراہیت کی علت یہ تھی کہ اگر اذان داخل مسجد ہوگی تو اس کی آواز دور دور تک نہیں پہنچے گی اور اس طرح جو اس کا مقصود ہے- لوگوں کو جماعت کی اطلاع دینا- وہ مقصود فوت ہوجائے گا لیکن مذکورہ بالا صورت میں جب کہ کسی امر عام کے سبب سب کی نماز قضا ہوگئی ہے اور جن کی نماز قضا ہوئی ہے وہ سب مسجد میں ہی موجود ہیں، یہاں کسی کو بلانا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف اذان کی سنت کو ادا کرنا مقصود ہے تو اگر یہ اذان خارج مسجد دی جائے تو دوسرے لوگ اس سے خلجان اور شک و شبہ میں پڑ جائیں گے اس لیے اس اذان کو داخل مسجد دینا ہی بہتر ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب کسی امر پر علما و مشائخ عمل کرنے لگیں تو اگرچہ بعض لوگ اسے مکروہ کہیں پھر بھی صوفیہ علما و مشائخ کے توارث ہی پر عمل کرتے ہیں جیسا کہ مخدوم شیخ سعد الدین خیر آبادی قدس سرہ (۹۲۲ھ) دعائے استفتاح کے بارے میں فتاوی صوفیہ کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں:

بعض نے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے انبیا پر اس دعا کے بعض الفاظ کے اطلاق کو مکروہ سمجھتے ہوئے اس سے ان الفاظ کو حذف کر دیا لیکن اہل تصوف- اللہ ان کی جماعت میں اضافہ فرمائے- اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح اہل بیت نبی سے مروی ہے اور جس طرح سے یہ امام ابو عبداللہ جعفر صادق سے منقول ہے کیوں کہ اس پر توارث ہے اور توارث، تواتر کی طرح ہے۔[2]

اسی طرح سے مولانا نعیم الدین مرادآبادی [صراط مستقیم] کی تفسیر میں تعامل اور تراث مشائخ صوفیہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

([1]) ردالمحتار مع الدر المختار، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (۳۹۱/۱)
([2]) مجمع السلوک (۲۱۱/۲)

صراط مستقیم سے طریق مسلمین مراد ہے اس سے بہت سے مسائل حل ہوتے ہیں کہ جن امور پر بزرگان دین کا عمل رہا ہو وہ صراط مستقیم میں داخل ہے۔[1]

خاص اذان ثانی کے باب میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

لِأَنَّ الْمُتَوَارَثَ لَا يَكُونُ مَكْرُوهًا وَكَذَلِكَ نَقُولُ فِي الْأَذَانِ بَيْنَ يَدَيْ الْخَطِيبِ فَيَكُونُ بِدْعَةً حَسَنَةً إذْ مَا رَآهُ الْمُؤْمِنُونَ حَسَنًا فَهُوَ حَسَنٌ.[2]

توارث مکروہ نہیں ہوتا جیسے اذان خطبہ مسجد کے اندر خطیب کے سامنے دینا بدعت حسنہ ہے کیوں کہ جسے مومنین اچھا جانیں وہ اچھا ہے۔

علامہ ابن عابدین کا خطیب کے سامنے خطبہ کی اذان کو بدعت حسنہ کہنا یہ ثابت کرتا ہے کہ بین یدی الخطیب سے ان کی مراد مسجد کے اندر اذان کا ہونا ہے ورنہ بدعت کہنا لغو ہو جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اذان مسجد کے اندر دینا مومنین وصالحین کی سنت ہے، امت کا متوارث عمل ہے، اگر بدعت ہے بھی تو بدعت حسنہ ہے، اسے وہی لوگ مکروہ یا بدعت سیئہ سمجھیں گے جو اہل سنت ومشائخ وصوفیہ کے بے شمار معمولات ورسومات سے ہاتھ اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔ ہاں یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ یہ عہد رسالت وزمانہ صحابہ کی سنت نہیں ہے۔

امت کے توارث اور اہل حق کے تعامل کی کیا حیثیت ہے، اس کا ادراک اعلی حضرت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی کی اس تحریر سے ہوتا ہے۔ آپ ذکر ولادت کے موقع پر کھڑے ہو کر صلاۃ وسلام پڑھنے کو تعامل سے ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مولا عزوجل توفیق دے تو منصف غیر متعصب کے لیے اسی قدر کافی کہ یہ فعل اعنی قیام وقت ذکر ولادت حضور خیر الانام علیہ وعلی آلہ افضل الصلاۃ والسلام صدہا

([1]) خزائن العرفان فی تفسیر القرآن، سورۃ الفاتحۃ:۵ (ص:۳)

([2]) رد المحتار مع الدر المختار، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (۱/۳۹۰)

سال سے بلاد دارالاسلام میں رائج و معمول اور اکابر علما میں مقرر و مقبول[1] بلکہ عہد رسالت اور عہد شیخین کی بات کریں تو جمعہ کے لیے دو اذان ہی سرے سے بدعت ہے۔ جنھیں احیائے سنت کا دعوی ہے وہ جمعہ کی دواذانوں میں سے ایک اذان کو ہی سرے سے حذف کرنے کا بیڑا اٹھائیں، اہل ظاہر اور بالخصوص سلفیہ کا استدلال یہی ہے کہ ہر وہ عمل جو عہد رسالت میں نہیں تھا وہ بدعت ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ تعامل و توارث نص کے خلاف ہے کیوں کہ حدیث میں علی باب المسجد آیا ہے جو اس بات پر دلیل ہے کہ اذان ثانی مسجد کے باہر ہونی چاہیے۔ اس حوالے سے عرض ہے کہ مسلمانوں کا یہ تعامل و توارث نص کے خلاف اس لیے نہیں ہے کہ حدیث میں مسجد کے اندر اذان دینے کی ممانعت پر کوئی نص نہیں ہے۔ لہٰذا یہ کیوں کر کہنا درست ہوگا کہ یہ نص کے خلاف ہے!

اگر ہم اس کو بالفرض مان بھی لیں کہ یہ زمانہ نبوی کے خلاف ہے، تب بھی یہ تعامل و توارث نص کے خلاف نہیں ہے کیوں کہ جب حکم زمانہ کی تبدیلی کی وجہ سے بدل جائے اور اس پر مسلمان عمل کرنے لگیں تو وہ سنت کے خلاف نہیں ہوتا بلکہ سنت کے موافق ہی ہوتا ہے اور اسی پر عمل بھی کیا جائے گا، چنانچہ اس حوالے سے فاضل بریلوی لکھتے ہیں:

ایک استثنائی صورت البتہ ہے کہ وہ بات ہے تو عہد رسالت کے بعد کی اور بظاہر مخالف سنت بھی ہے لیکن زمانہ کی تبدیلی کی وجہ سے اس کا حکم شرعی بدل گیا اور اس تبدیلی پر تمام مسلمانوں کا عمل در آمد جاری و ساری ہو گیا۔ جیسے حضور ﷺ کے عہد پر نور میں عورتیں مسجد میں جاتی تھیں لیکن بعد میں ان کو عام طور سے مسجد میں حاضر ہونے

([1])فتاوی رضویہ (۵۰۴/۲۶)

سے روک دیا گیا۔ یہ حقیقت میں سنت ثابتہ کے مخالف نہیں، بلکہ موافق ہے۔[1]

بین یدی الخطیب/المنبر کا مفہوم:

بعض لوگ بین یدی الخطیب/ المنبر کے الفاظ کے حوالے سے یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد صرف ''مواجہت'' ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ اذانِ خطبہ بالکل خطیب اور منبر کے سامنے دروازہ پر ہونی چاہیے کیوں کہ ''بین یدیہ'' کے معنی صرف ''قرب'' ہی کے نہیں ہوتے بلکہ ''مواجہت'' کے بھی ہوتے ہیں، لہٰذا فقہا کی عبارات میں جہاں جہاں ''بین یدیہ'' کا لفظ آیا ہے وہاں ''مواجہت'' مراد ہے۔

ہم یہاں یہ عرض کر دیں کہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، کیوں کہ فقہا کی عبارات میں لفظ بین یدیہ سے صرف مواجہت کا معنی مراد لینا اس لیے درست نہیں ہے کہ بعض کتابوں میں لفظ عند المنبر اور بعض میں لفظ علی المنبر کی صراحت ہے جیسا کہ ماقبل میں گزرا۔ یہ عبارتیں قطعی طور پر بین یَدیہ سے قرب کے معنی متعیّن کرتی ہیں۔ بین یدیہ سے مواجہت کے ساتھ قرب کے معنی مراد لینے پر دوسری سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ پوری امت خواہ حنفیہ ہوں یا مالکیہ، شافعیہ یا حنبلیہ سب کا عمل قرب ہی کے معنی پر رہا ہے، یعنی سب لوگ خطبہ کی اذان منبر کے سامنے مسجد کے اندر ہی دیتے رہے ہیں جس کی تفصیل ابھی گزری۔ اگر بین یدیہ سے صرف مواجہت کے معنی مراد ہوتے تو اس پر عمل بھی ہوتا، جب کہ ایسا نہیں ہے۔

میں اپنی گفتگو کو اس بات پر ختم کرتا ہوں کہ آج کے دور میں اذان کہاں ہو؟ یہ سوال ہی ختم ہو گیا ہے کیوں کہ اذان کا مقصد اعلان ہے اور مائیک سے دی جانے والی اذان خواہ وہ کہیں سے ہو وہ اپنے ہدف کو بدرجہ اتم حاصل کر لیتی ہے۔ دوسری طرف یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ اذان خطبہ کا مقصد مسجد سے باہر والوں کو مطلع کرنا نہیں ہے، اس

([1])فتاوی رضویہ(۲۴۲/۲۸)

لیے اس کو مسجد سے باہر کرانے کی ضد بھی فضول ہے اور اگر بالفرض کوئی یہ کہتا ہے کہ اذانِ خطبہ کا مقصود بھی قریب و بعید سب لوگوں کو مطلع کرنا ہے تو اسے چاہیے کہ اس زمانے میں اذان خطبہ مسجد سے باہر کرانے کی تحریک کی بجائے اسے مائک پر دیے جانے کی تحریک چلائے، کیوں کہ اعلان عام کا کامل مقصد اذان کو مسجد سے باہر کرانے میں حاصل نہیں ہوتا، بلکہ مائک سے کرانے سے حاصل ہوتا ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود اذانِ خطبہ کو مسجد کے باہر ہی دینے پر اگر کوئی مصر ہے اور اس کے خلاف کرنے والے پر بدعت وضلالت کا حکم لگاتا ہے اور عالم گیریت کے اس دور میں اپنی چند مسجدوں کے جدید تعامل کو بنیاد بنا کر اسے سنیت کا شعار قرار دیتا ہے، تو ایسے شخص سے گزارش ہے کہ وہ اپنے نظریے پر دوبارہ غور کریں، مقاصد شریعت کو پیش نظر رکھیں، اور اس مسئلہ کی مشروعیت کا جائزہ لیں اور عہد رسالت سے لیکر اب تک اس میں کس طرح کی تبدیلیاں ہوئی ہیں ان پر ایک نظر ڈالیں تاکہ مسئلہ کی پوری حقیقت سمجھ میں آجائے، ورنہ امت کی اجتماعیت کو تار تار کرنے کے علاوہ اسے کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔

لایؤذن فی المسجد سے استدلال کا علمی جائزہ:

بعض حضرات فقہا کی ان عبارتوں سے استدلال کرتے ہیں جو عام اذان کے داخل مسجد دیے جانے کی ممانعت کے سلسلے میں ہے، فقہا کا مقصود یہ ہے کہ عام اذانیں اگر مسجد میں دی جائیں گی تو ان کی آواز دور تک نہیں پہنچے گی، اس طرح اذان کا جو مقصود ہے باہر والوں کو اطلاع دینا، وہ فوت ہو جائے گا۔ ان عبارتوں سے استدلال کرتے ہوئے بعض حضرات ان کا انطباق اذان خطبہ پر بھی کرتے ہیں، جو درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ اذان خطبہ سے مقصود باہر والوں کو اطلاع دینا نہیں ہے، کیوں کہ اگر باہر والوں کو اطلاع دینا مقصود ہوتا تو اذان خطبہ ہندوستان کے مساجد میں مائک

پر دی جاتی جو کہ نہیں دی جاتی ہے۔ بہر کیف اس سیاق میں فقہا کی بعض عبارتیں نقل کی جاتی ہیں اور ان سے غلط استدلالات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

البحر الرائق میں ہے:

وَفِي السِّرَاجِ الْوَهَّاجِ، وَيَنْبَغِي لِلْمُؤَذِّنِ أَنْ يُؤَذِّنَ فِي مَوْضِعٍ يَكُونُ أَسْمَعَ لِلْجِيرَانِ وَيَرْفَعَ صَوْتَهُ وَلَا يُجْهِدَ نَفْسَهُ؛ لِأَنَّهُ يَتَضَرَّرُ بِذَلِكَ، وَفِي الْخُلَاصَةِ :وَلَا يُؤَذَّنُ فِي الْمَسْجِدِ[1]

"سراج وہاج" میں ہے کہ مؤذن کے لیے بہتر ہے کہ کسی بلند جگہ پر اذان دے جس کو پڑوس میں رہنے والے لوگ بخوبی سن سکیں اور اپنی آواز بلند کرے لیکن آواز بلند کرنے میں پوری طاقت نہ جھونک دے کہ اس سے ضرر لاحق ہو اور "خلاصہ" میں ہے کہ مسجد میں اذان نہ دی جائے۔

"حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح" میں ہے:

واختلف في أذان المغرب والظاهر أنه يؤذن في مكان عال أيضا كما في السراج ويكره أن يؤذن في المسجد كما في القهستاني عن النظم، فإن لم يكن ثمة مكان مرتفع للأذان يؤذن في فناء المسجد كما في الفتح.[2]

یعنی مغرب کی اذان کے بارے میں اختلاف ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ بھی کسی بلند جگہ دی جائے جیسا کہ "سراج" میں ہے۔ اور مسجد میں اذان دینا مکروہ ہے جیسا کہ "نظم" سے منقول "قہستانی" میں ہے اور اور اگر وہاں بلند جگہ نہ ہو تو صحن مسجد میں اذان دی جائے جیسا کہ "فتح" میں ہے۔

اسی طرح "فتح القدیر" میں ہے:

وَأَمَّا الْأَذَانُ فَعَلَى الْمِئْذَنَةِ فَإِنْ لَمْ يَكُنْ فَفِي فِنَاءِ الْمَسْجِدِ وَقَالُوا لَا

([1]) البحر الرائق، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (۱/۲۶۸)

([2]) حاشیۃ الطحطاوی علی المراقی، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (ص:۱۹۷/۱۹۸)

يُؤَذَّنُ فِي الْمَسْجِدِ[1] اذان، اذان خانے میں ہو، اگر اذان خانہ نہ ہو تو صحن مسجد میں ہو اور فقہانے فرمایا ہے کہ مسجد میں اذان نہ دی جائے۔

اس قسم کی عبارتوں سے لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خطبہ کی اذان بھی مسجد میں نہ دی جائے۔ جب کہ سیاق کلام ہی سے یہ متبادر ہو رہا ہے کہ یہ پنج وقتہ اذان کے بارے میں ہے؛ کیوں کہ عبارات مذکورہ میں یہ کہا گیا ہے کہ اذان ایسی جگہ سے دی جائے کہ پڑوسیوں کو بھی سنائی دے، تاکہ وہ نماز کے لیے آسکیں اور ظاہر ہے پڑوسیوں کو بلانا پنج وقتہ نماز ہی میں ہوتا ہے یا پھر جمعہ کی اذان اول میں۔ جمعہ کی اذان ثانی میں تو سب لوگ آ ہی چکے ہوتے ہیں، لہٰذا پھر پڑوسیوں کو خبر کرنا چہ معنی دارد؟

دوسری بات یہ ہے کہ اگر فقہا کی عبارت کا یہی مطلب ہو تا کہ کوئی بھی اذان مسجد میں نہ دی جائے خواہ پنج وقتہ ہو یا اذان خطبہ، تو پھر یہ کیسے متصور ہو سکتا ہے کہ فقہا ایک طرف مسجد میں اذان دینے سے روک رہے ہیں اور دوسری طرف خود ہی سارے فقہا، علما اور مشائخ دوسری صدی سے لے کر اب تک مسجد میں اذان بھی دے رہے ہیں، لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اس حکم میں اذان خطبہ شامل نہیں ہے۔ اگر اس توضیح کو تسلیم نہ کیا جائے تو تمام فقہا، علما اور مشائخ پر فعل مکروہ کے ارتکاب کا اور قول و عمل کے تضاد کا الزام عائد ہو گا۔

مذکورہ فقہی عبارات پر ایک بار پھر غور کریں اور جو حضرات ان عبارتوں کو داخل مسجد اذان خطبہ کو روکنے کے لیے پیش کرتے ہیں وہ بھی غور کر لیں، جو لوگ داخل مسجد اذان خطبہ کو روکتے ہیں وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اذان خطبہ امام اور منبر کی سیدھ میں ٹھیک سامنے ہو، مذکورہ عبارت میں اس کا کہیں سے کہیں تک ذکر نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس مذکورہ عبارتیں یہ کہتی ہیں کہ اذان منارہ، مئذنہ، بلند جگہ

([1]) فتح القدیر، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (۱/۲۴۶)

اور یہ بھی نہ ہو تو صحن مسجد میں دی جائے۔ اب ان عبارتوں سے اگر اذان خطبہ پر استدلال درست ہوگا تو پھر یہ کہا جانا چاہیے کہ اذان خطبہ مئذنہ، منارہ یا کسی بلند جگہ پر ہو، یہ نہ ہو تو صحن مسجد میں ہو، داخل مسجد میں نہ ہو، ظاہر ہے اس قسم کا استدلال کرنے کی جرأت کوئی نہیں کر سکتا۔ اس سے آفتاب نیم روز کی طرح روشن ہو گیا کہ اس قسم کی عبارتیں عام اذانوں سے متعلق ہیں، جن کا مقصود دور تک آواز پہنچانا ہوتا ہے، اذان خطبہ ان عبارتوں سے قطعی طور پر مستثنیٰ ہے۔

مسجد میں ذکر بالجہر کی ممانعت:

بعض حضرات مسجد کے اندر خطبہ کی اذان کو اس لیے بھی منع کرتے ہیں کہ ان کے مطابق مسجد میں ذکر بالجہر ممنوع ہے اور اذان بھی ذکر بالجہر کی ایک قسم ہے، لہٰذا اس کی بھی ممانعت ہوگی، جب کہ ایسا خیال روایت و درایت اور علم و تحقیق کے بالکل خلاف ہے؛ کیوں کہ مطلقاً مسجد کے اندر ذکر بالجہر کی ممانعت ہرگز نہیں ہے بلکہ مسجد میں مطلقاً ذکر سے روکنے والوں کو قرآن نے ظالم کہا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا -

''اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ کی مسجدوں میں اس کے نام کا ذکر کیے جانے سے روک دے اور انہیں ویران کرنے کی کوشش کرے۔'' (البقرۃ:۱۱۴)

اس آیت کریمہ میں یہ کہا گیا ہے کہ جو لوگ مسجد میں اللہ کا نام ذکر کیے جانے سے روکتے ہیں وہ ظالم ہیں اور اس میں ذکر عام ہے جو ذکر جہری اور ذکر سری دونوں کو شامل ہے۔

مزید یہ کہ احادیث سے بھی ذکر بالجہر کا ثبوت ملتا ہے، ان میں سے چند ملاحظہ ہوں۔

صحیح بخاری میں ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

إِنَّ رَفْعَ الصَّوْتِ بِالذِّكْرِ حِينَ يَنْصَرِفُ النَّاسُ مِنَ الْمَكْتُوبَةِ كَانَ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ، وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: كُنْتُ أَعْلَمُ إِذَا انْصَرَفُوا بِذَلِكَ إِذَا سَمِعْتُهُ[1]

فرض نماز سے فراغت کے بعد بلند آواز سے ذکر کرنا حضور ﷺ کے زمانے میں رائج تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما مزید فرماتے ہیں: جب میں ذکر سنتا تب مجھے نماز کے ختم ہونے کا علم ہوجاتا۔

اس طرح کی متعدّد احادیث کریمہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے اندر ذکر بالجہر جائز ہے۔

اب میں اس حوالے سے فقہا کی عبارتیں نقل کرتا ہوں۔

ردالمحتار میں ہے: قَالَ بَعْضُ أَهْلِ الْعِلْمِ: إِنَّ الْجَهْرَ أَفْضَلُ، لِأَنَّهُ أَكْثَرُ عَمَلًا، وَلِتَعَدِّي فَائِدَتِهِ إِلَى السَّامِعِينَ، وَيُوقِظُ قَلْبَ الذَّاكِرِ فَيَجْمَعُ هَمَّهُ إِلَى الْفِكْرِ، وَيَصْرِفُ سَمْعَهُ إِلَيْهِ، وَيَطْرُدُ النَّوْمَ، وَيَزِيدُ النَّشَاطَ. اه-[2]

بعض اہل علم نے کہا ہے کہ بلند آواز سے ذکر کرنا افضل ہے کیوں کہ اس میں محنت زیادہ ہے اور اس کا فائدہ سننے والوں تک پہنچتا ہے۔ یہ ذکر کرنے والے کے دل کو بیدار کرتا ہے، اس کے خیال کو جمع کرتا ہے، کانوں کو اس طرف متوجہ کرتا ہے، اس کی نیند بھگاتا ہے اور اس کے ذوق و شوق میں اضافہ کرتا ہے۔

ردالمحتار ہی میں ہے: وَفِي حَاشِيَةِ الْحَمَوِيِّ عَنْ الْإِمَامِ الشَّعْرَانِيِّ: أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ سَلَفًا وَخَلَفًا عَلَى اسْتِحْبَابِ ذِكْرِ الْجَمَاعَةِ فِي الْمَسَاجِدِ وَغَيْرِهَا إِلَّا أَنْ يُشَوِّشَ جَهْرُهُمْ عَلَى نَائِمٍ أَوْ مُصَلٍّ أَوْ قَارِئٍ إِلَخْ[3]

([1]) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب الذکر بعد الصلاۃ، ح: ۸۴۱)

([2]) ردالمحتار مع الدر المختار، کتاب الصلاۃ، باب مایفسد الصلاۃ ومایکرہ فیھا (۱/۶۶۰)

([3]) ردالمحتار مع الدر المختار، کتاب الصلاۃ، باب مایفسد الصلاۃ ومایکرہ فیھا (۱/۶۶۰)

''حاشیۃ الحموی'' میں امام شعرانی سے منقول ہے کہ سلفا، خلفا تمام علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ مسجد کے اندر یا دوسری جگہ اجتماعی ذکر بالجہر مستحب ہے۔ ہاں اگر اس سے سونے والے یا کسی نمازی یا کسی تلاوت کرنے والے کو خلل ہو تو پھر درست نہیں ہے۔

قرآن کریم احادیث نبویہ اور اقوال فقہا کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ ذکر بالجہر مسجد کے اندر جائز ہے۔ ہاں اگر ذکر بالجہر سے کسی نمازی، سونے والے یا کسی قاری قرآن کو خلل ہو تو پھر ذکر بالجہر درست نہیں ہے۔

فتاوی رضویہ میں بھی اس مسئلہ کی وضاحت ہے:

''جہاں کوئی نماز پڑھتا ہو یا سوتا ہو کہ بآواز پڑھنے سے اس کی نماز یا نیند میں خلل آئے گا وہاں قرآن مجید و وظیفہ ایسی آواز سے پڑھنا منع ہے۔ مسجد میں جب اکیلا تھا اور بآواز پڑھ رہا تھا جس وقت کوئی نماز کے لیے آئے فوراً آہستہ ہو جائے۔''[1]

آپ دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''درود شریف خواہ کوئی وظیفہ بآواز نہ پڑھا جائے جب کہ اس کے باعث کسی نمازی یا سوتے یا مریض کی ایذا ہو یا رِیا آنے کا اندیشہ ہو۔ اور اگر کوئی محذور نہ موجود ہو، نہ مظنون تو عند التحقیق کوئی حرج نہیں، تاہم اخفا افضل ہے۔ لما فی الحدیث، خیر الذکر الخفی - واللہ تعالی أعلم''[2]

ایک اور جگہ آپ فرماتے ہیں: حدیث صحیح میں قرآن مجید بآواز ایسی جگہ پڑھنے سے جہاں لوگ نماز پڑھ رہے ہوں ممانعت فرمائی ہے۔ اور قرآن عظیم نے حکم فرمایا ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے کان لگا کر سنو اور چپ رہو۔ تو ایسی جگہ جہر سے پڑھنا ممنوع ہے اور دو یا زیادہ آدمیوں کا بآواز پڑھنا اور شدید ممنوع کہ مخالف حکم قرآن اور قرآن عظیم کی بے حرمتی ہے۔ ان لوگوں کو چاہیے کہ آہستہ پڑھیں۔ اور نفل پڑھنے

([1])فتاوی رضویہ (۸/۱۰۰)

([2])فتاوی رضویہ (۶/۲۳۳)

والے نفل سے نہیں روکے جاسکتے ہیں۔ نفل نماز مستحب تلاوت سے افضل ہے کہ اس میں تلاوت بھی ہے، رکوع سجود بھی۔[1]

فاضل بریلوی کی اس عبارت سے بھی معلوم ہوگیا کہ اگر ذکر بالجہر سے لوگوں کو تکلیف ہورہی ہو یا کسی کی نماز یا تلاوت میں خلل پڑرہا ہو تو اس کی ممانعت ہے، ورنہ اس کی اجازت ہے۔

مذکورہ بالا حوالوں کی روشنی میں یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اذان خطبہ بھی ایک ذکر ہے جو مسجد کے اندر بلا شبہ جائز ہوگی، جیسا کہ ذکر بالجہر کی دیگر صورتیں جائز ہیں۔ اس کو صرف ذکر بالجہر ہونے کی بنا پر مسجد سے خارج نہیں کیا جا سکتا؛ کیوں کہ لوگ اس سے خلل میں مبتلا نہیں ہوتے، بلکہ اس کے ذریعہ لوگوں کو سماع خطبہ کے لیے آمادہ کرنا اور اوراد و وظائف اور نوافل کو موقوف کرنے کے لیے متنبہ کرنا ہی مقصود ہے جو حاصل ہے، خواہ اذان مسجد کے اندر ہو یا باہر۔

اگر برسبیل تنزل مان بھی لیں کہ اذان ''ذکر بالجہر'' ہے لہٰذا اس کو باہر ہی ہونا چاہیے تو ایسے لوگوں کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ اذان مسجد کے باہر دروازہ پر دینے کی صورت میں بھی تو آواز مسجد کے اندر جائے گی، کیوں کہ یہ متصور ہی نہیں کہ اذان مسجد کے دروازہ پر ہو اور آواز اندر نہ جائے، بلکہ خطبہ کی اذان کو مسجد کے اندر پہنچانا ضروری بھی ہے تاکہ مسجد کے لوگ سماع خطبہ کے لیے تیار ہوسکیں۔

لہٰذا صرف اس بنا پر اذان خطبہ کو مسجد کے اندر دینے سے روکنا کہ مسجد میں آواز بلند ہوگی عقلاً و نقلاً دونوں لحاظ سے درست نہیں ہے۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اذان خالص ذکر نہیں ہے لہٰذا اس کو مسجد میں دینا درست نہیں، یہ بھی ناقابل فہم بات ہے، کیوں کہ کلمات اذان سب کے سب ذکر ہی پر مشتمل ہیں، کیوں کہ ان کلمات میں اللہ کی حمد و ثنا، اس کی وحدانیت اور اس کے

([1])فتاوی رضویہ (۳۳۸/۶)

رسول کی رسالت کی گواہی اور لوگوں کو اللہ کی بارگاہ کی طرف بلانا ہی تو ہے۔ اگر صرف اس کو اس بنا پر مسجد سے خارج کر دیا جائے کہ اس میں لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا ہے اور یہ ذکر نہیں ہے تو پھر مسجد سے دعوت و تبلیغ ،وعظ و نصیحت ،مسائل فقہ کی مشق و ممارست، نکاح خوانی، صلاۃ و سلام وغیرہ کو بھی خارج کر دینا چاہیے، جب کہ یہ ساری چیزیں مسجد میں درست ہیں ۔اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ اذان ذکر کے ساتھ اعلان بھی ہے تو جواب ہوگا کہ یہ مقصود بھی اذان خطبہ مسجد کے اندر دینے سے حاصل ہے، کیوں کہ داخل مسجد اذان خطبہ سے تمام حاضرین تک آواز پہنچ جاتی ہے اور اس سے مقصود حاضرین کو ہی مطلع کرنا ہے۔ اور اگر کوئی اسے غائبین کے لیے بھی اعلان سمجھتا ہے تو اسے چاہیے کہ خطبے کی اذان بھی مئذنہ میں اور مائک کے ذریعہ کرائے۔

یہاں یہ بات بھی ہمارے ذہنوں میں ہونی چاہیے کہ ہم اس اذان کو خارج مسجد ہونے پر شدید اصرار کرتے ہیں کہ مسجد کے اندر آواز بلند نہ ہو اور ساتھ ہی مسجد کے اندر چیخ چیخ کر صلاۃ و سلام بھی پڑھتے ہیں، جب کہ بہت سے لوگ نماز میں مشغول ہوتے ہیں۔ میں اپنے گھر پر جہاں میں پنج وقتہ نمازیں ادا کرتا ہوں وہاں میں ہر روز دیکھتا ہوں کہ نماز فجر میں کچھ لوگوں کی ایک دو رکعت چھوٹ جاتی ہے، وہ لوگ اپنی رکعت بھی مکمل نہیں کر پاتے کہ ادھر امام صاحب بلند آواز سے صلاۃ و سلام پڑھنے لگتے ہیں۔ اب وہ بے چارے جن کی رکعت چھوٹی ہوتی ہے وہ بھی جیسے تیسے نماز مکمل کر کے صلاۃ و سلام پڑھنے لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح نماز عصر اور نماز جمعہ میں بھی ہوتا ہے۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے کہ آج کل اہل سنت کی بہت سی مسجدوں میں ایسا ہی ہونے لگا ہے۔

اس سلسلے میں اعلی حضرت فاضل بریلوی کے ایک فتوی سے ہمیں یہی رہنمائی ملتی ہے کہ مسجد میں بالجہر درود و سلام اسی وقت پڑھنا درست ہے، جب کسی نمازی کو خلل واقع نہ ہو۔ موصوف اپنے ایک فتوی میں لکھتے ہیں: ”درود شریف ذکر ہے، ذکر

بالجہر جائز ہے جبکہ نہ ریا ہو نہ کسی نمازی یا مریض یا سوتے کی ایذا، نہ کسی اور مصلحت شرعیہ کا خلاف، یوہیں درود شریف بھی جہراً جائز و مستحب ہے جس کے جواز پر دلیل اجماع، کہ قرات حدیث و ذکر نام اقدس میں سلفا خلفا تمام ائمہ و علما و مسلمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اسی آواز سے کہتے ہیں جتنی آواز سے قرأت حدیث و کلام کر رہے ہیں اور یہ جہر ہے -واللہ تعالی اعلم "[1]

یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ محض "حي علی الصلاۃ يا حي علی الفلاح " جیسے الفاظ کی وجہ سے اذان کو مسجد سے باہر کیے جانے پر اصرار ہے جب کہ ان کلمات سے خیر کی دعوت مقصود ہے۔میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایسے لوگوں کے نزدیک ان مشاعروں اور محفلوں کے مسجد کے اندر ہونے کا جواز کس طرح ہوگا جو ہر دوسرے دن مسجد میں منعقد ہوتی ہیں، نذرانوں پر آنے والے خطبا اور شعرا کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جسے نہ دین پر عمل سے مطلب ہے نہ دین کی صالح دعوت اور معاشرے کی اصلاح سے غرض، لفظوں کی بازی گری، مقابلہ آرائی، اپنے حریفوں کی ہجوگوئی اور بے ہنگم چیخ پکار اور نعرہ و غوغا سے مسجد کی در و دیوار کو ہلا ڈالنے کی سعی نامشکور، یہ کون سا ذکر خالص اور ذکر صالح ہے جس کے لیے ہماری پیشانیوں پر بل نہیں پڑتے اور جب مسجد کے اندر اذان خطبہ ہو جائے تو مسجد کا تقدس پامال ہو جاتا ہے .ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

([1])فتاوی رضویہ (۲۳۴/۶)

مسئلہ اقامت

اقامت کا لغوی و اصطلاحی معنی

اقامت کا لغوی معنی

قَامَ یقوم قِیاماً کے معنی کھڑا ہونا، ٹھہرنا، سیدھا ہونا اور نماز شروع کرنا- وغیرہ- کے ہوتے ہیں، اور أقامَ یُقیم إقامةً کے معنی کھڑا کرنا، سیدھا کرنا اور نماز کے لیے ندا دینا- وغیرہ- کے ہوتے ہیں۔

الجوھرۃ النیرۃ میں ہے: والإقامة لإعلام افتتاح الصلاة[1]

یعنی ''اقامت'' نماز شروع ہونے کی خبر دینا ہے۔

اقامت کا اصطلاحی معنی

اصطلاح شرع میں ''إعلامٌ بالقیام إلی الصلاة بألفاظ مخصوصة'' یعنی مخصوص الفاظ کے ذریعہ نماز شروع ہونے کی خبر دینا اقامت کہلاتا ہے۔

اقامت اذان ہی کی طرح ہے، اس کی بھی تعلیم صحابیٔ رسول حضرت عبد اللہ بن زید کو خواب میں اذان کے ساتھ ہی دی گئی تھی، جیسا کہ باب الاذان میں تفصیل سے گذر چکا۔

اور جس طرح اذان سنت مؤکدہ ہے اسی طرح اقامت بھی سنت مؤکدہ ہے، نور الایضاح میں ہے: الإقامة سنة مؤكدة للفرائض [2]

فرض نمازوں کے لیے اقامت سنت مؤکدہ ہے۔

([1]) الجوھرۃ النیرۃ (۱/۱۸۳)

([2]) نور الایضاح (ص:۳۹)

مسئلۂ اقامت کی شرعی حیثیت

پچھلی کئی دہائیوں سے بالخصوص جماعت اہل سنت کے درمیان یہ فتنہ ظہور پذیر ہوا کہ فرائض وواجبات کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی اور مستحبات ومباحات پر اس قدر سختی کی جاتی ہے کہ انھیں ضروریات دین یا ضروریات اہل سنت کا درجہ دے دیا جاتا ہے اور پھر انھیں مسلک کا نشان امتیاز قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس سے بھی اپنی ہوس کی پیاس نہیں بجھتی تو سادہ لوح مسلمانوں پر بدعت وگمرہی کا جبری حکم لگا دیا جاتا ہے اور ظلم وتشدد کے پہاڑ ڈھائے جانے لگتے ہیں۔

اس حوالے سے جب ہم ماضی کا جائزہ لیتے ہیں تو اہل سنت کے یہاں اس طرح کی مثال کہیں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ آج ہمارے دور کا یہ سب سے بڑا فتنہ ہے جس سے ہم سب دوچار ہیں، حالاں کہ شریعت مطہرہ کے اندر احکام شرع کی درجہ بندی کی گئی ہے اور اسی درجہ کے مطابق بندے کو احکام کا مکلف بھی بنایا گیا ہے۔

ہمارے فقہائے کرام نے اس درجہ بندی کی توضیح وتنقیح اور تعریف کرکے احکام شرع کو مکمل طور سے واضح کر دیا ہے۔ متقدمین فقہا نے احکام شرع کو پانچ قسموں میں منقسم کیا ہے اور بعد کے فقہا نے ان کو سات قسموں میں بانٹا ہے، بعد میں اس میں اور اضافہ ہوا اور نو قسموں تک پہنچا دیا گیا۔ پھر اس میں اور وسعت دی گئی اور احکام شرع کو گیارہ قسموں تک پہنچایا گیا اور وہ یہ ہیں:

فرض، واجب، سنت مؤکدہ، سنت غیر مؤکدہ، مستحب، حرام، مکروہ تحریمی،

اساءت، مکروہ تنزیہی، خلاف اولی اور مباح۔

ان تمام کی تعریفات اور احکامات کتب فقہ میں مذکور ہیں۔اگر ہم ان احکامات کے مطابق عمل پیرا ہو جائیں تو ہمارے ماحول میں پیدا بہت ساری فتنہ سامانیاں اور نفرتیں خود بخود ختم ہو جائیں گی، لیکن ہمارا ایک بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم دوسروں کی بات سننے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوتے، بلکہ اپنی ہی بات کو قولا نہ سہی عملا "وحی" کا درجہ دے دیتے ہیں، اور اس کے خلاف کرنے والے کو کافر و مشرک اور بدعتی و گمراہ تک بنا دیتے ہیں۔

سر دست دونوں مسئلوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اذان و اقامت دونوں مسئلے فرعی و استحبابی ہیں۔ پہلے مسئلے کی پوری نوعیت واضح کی جا چکی ہے۔

اب رہا مسئلۂ اقامت تو یہ مسئلہ بھی تمام فقہا کے نزدیک استحباب اور عدم استحباب سے تعلق رکھتا ہے۔

در مختار میں ہے:

(وَلَهَا آدَابٌ) تَرْكُهُ لَا يُوجِبُ إسَاءَةً وَلَا عِتَابًا كَتَرْكِ سُنَّةِ الزَّوَائِدِ، لَكِنَّ فِعْلَهُ أَفْضَلُ (نَظَرُهُ إلَى مَوْضِعِ سُجُودِهِ حَالَ قِيَامِهِ، وَإِلَى ظَهْرِ قَدَمَيْهِ حَالَ رُكُوعِهِ ...(وَالْقِيَامُ) لِإِمَامٍ وَمُؤْتَمٍّ (حِينَ قِيلَ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ)[1]

نماز کے چند آداب ہیں، جن کا ترک نہ "اساءت" کا موجب ہے اور نہ کسی "عتاب" کا۔ان آداب کا چھوڑ دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ "سنن زوائد" کا چھوڑ دینا، لیکن ان کا کرنا افضل ہے، جیسے نماز میں قیام کی حالت میں سجدہ گاہ پر نظر رکھنا اور رکوع کی حالت میں قدم کی پشت کو دیکھنا، وغیرہ... ان ہی آداب میں سے امام اور مقتدی کا حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا بھی ہے۔

([1])الدر المختار مع شرحہ، کتاب الصلاۃ، باب صفۃ الصلاۃ (۱/۴۷۷-۴۷۹)

علامہ حسن بن عمار بن علی وفائی شرنبلالی علیہ الرحمہ (۱۰۶۹ھ) نے بھی اپنی کتاب "نور الإیضاح "میں اس مسئلہ کو آداب نماز سے شمار کیا ہے، آپ فرماتے ہیں:

فصل في آداب الصلاة... من آدابها...والقيام حين قيل حي على الفلاح وشروع الإمام مذ قيل قد قامت الصلاة[1]

نماز کے آداب میں سے یہ ہے کہ حی علی الفلاح پر کھڑا ہو اور قد قامت الصلاۃ پر نماز شروع کردے۔

علامہ امجد علی اعظمی نے بھی "بہار شریعت "میں اس مسئلے کو مستحبات سے شمار کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

جب مکبر حی علی الصلاۃ کہے تو امام و مقتدی سب کا کھڑا ہونا... جب مکبر قد قامت الصلاۃ کہہ لے تو نماز شروع کر سکتا ہے، مگر بہتر یہ ہے کہ اقامت پوری ہونے پر شروع کرے۔[2]

علامہ موصوف نے مستحب کی یہ تعریف کی ہے:

ہر وہ شئ جو نظر شرع میں پسند ہو مگر ترک پر کچھ ناپسندی نہ ہو، خواہ خود حضور اقدس ﷺ نے اسے کیا یا اس کی ترغیب دی یا علمائے کرام نے پسند فرمایا، اگر چہ احادیث میں اس کا ذکر نہ آیا، اس کا کرنا ثواب اور نہ کرنے پر مطلقا کچھ نہیں۔[3]

خلاصہ یہ کہ صاحب در مختار کا اس مسئلہ کو سنن زوائد کی مثل بتانا اور علامہ امجد علی اعظمی کا اس کو مستحبات سے شمار کرکے "مستحب "کی تعریف میں یہ کہنا کہ "نظر شرع میں پسند ہو مگر ترک پر کچھ ناپسندی نہ ہو...اس کا کرنا ثواب اور نہ کرنے پر مطلقا کچھ نہیں "اس کی حیثیت اور نوعیت کو واضح کرتا ہے۔ اب اس کے باوجود اس کے تارک پر

([1]) نور الایضاح، کتاب الصلاۃ، فصل فی آداب الصلاۃ (ص:۵۹)

([2]) بہار شریعت، جلد اول حصہ سوم، ص:۵۳۸

([3]) بہار شریعت، جلد اول، حصہ دوم، ص:۲۸۳

لعن طعن کرنا، اس کے ساتھ دست وگریباں ہونا، اس کو بے ادب اور گستاخ تک کہہ دینا اور اس فرعی مسئلے کو بنیاد بنا کر کسی بھی خانقاہ یا شخصیت کو بدنام کرنا، ان سے قطع تعلق روا رکھنا اور جماعت اہل سنت میں انتشار کو ہوا دینا کسی بھی باشعور اور دین وسنیت کے ہمدرد کے نزدیک اصولی اور فکری کسی بھی اعتبار سے روا نہیں، بلکہ اجتماعیت کو تار تار کرنا اور امت مسلمہ کے شیرازہ کو بکھیرنا ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمانوں کے جان وایمان کے لالے پڑے ہیں۔ اس طرح کی باتیں کرنا لاشعوری طور پر غیروں کا ساتھ دینا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے مشکلات پیدا کرنا ہے۔ العیاذ باللہ!

اس حوالے سے ماضی قریب کے زبردست محقق علامہ غلام رسول سعیدی نے نہایت معتدل رائے کا اظہار کیا ہے، آپ رقم طراز ہیں: حی علی الصلاۃ پر کھڑا ہونا مستحب ہے، اس لئے اس سے پہلے کھڑا ہونا مستحب کے خلاف ہے، اور حاشیہ طحطاوی اور اسی طرح عالم گیری میں جو اس کو مکروہ لکھا ہے اس سے مراد مکروہ تنزیہی ہے اور در اصل یہ خلاف اولی ہے۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ مستحب کے ترک پر ملامت نہیں کی جاتی، اس لیے جو لوگ اقامت کے وقت پہلے سے کھڑے ہو جائیں ان کو ملامت نہیں کرنا چاہیے اور مستحب کے ساتھ واجب کا معاملہ نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ کسی مستحب کو ترک کرنے میں اتنی قباحت نہیں، جتنی کسی مستحب کو واجب قرار دینے میں قباحت ہے، اور کچھ لوگ حی علی الفلاح پر اٹھنے والوں کو ملامت کریں کہ یہ دیر سے اٹھتے ہیں اور ان کو اقامت کی ابتدا میں کھڑا ہونا چاہیے تھا تو یہ اور زیادہ مذموم ہے۔[1]

([1]) شرح صحیح مسلم، ۱/۱۱۰۱)

مسئلۂ اقامت: احادیث کی روشنی میں

احکام کے باب میں مسئلہ اقامت کی نوعیت و حیثیت کے واضح ہوجانے کے بعد اب ہم احادیث نبویہ کی روشنی میں یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ اس مسئلے میں آپ ﷺ کا عمل یا ارشاد کیا رہا ہے۔ اس باب میں تین طرح کی روایتیں موجود ہیں:

(۱) ابتدائے اقامت کے وقت کھڑے ہونا

(۲) وسط اقامت یعنی قد قامت الصلاۃ کے وقت کھڑے ہونا

(۳) اقامت کے وقت کھڑے ہونے کا کوئی متعیّن وقت مقرر نہیں

ذیل میں ان مختلف روایات کو نقل کیا جاتا ہے۔ پھر شارحین حدیث کے حوالے سے ان روایات کے مطالب و مقاصد، جمع و تطبیق اور تشریحات پر بھی اجمال کے ساتھ گفتگو قلم بند کی جائے گی، تاکہ احادیث کی روشنی میں مسئلۂ اقامت کی اصل حیثیت سامنے آسکے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ، فَقُمْنَا، فَعَدَّلْنَا الصُّفُوفَ، قَبْلَ أَنْ يَخْرُجَ إِلَيْنَا رَسُولُ اللهِ فَأَتَى رَسُولُ اللهِ ﷺ حَتَّى إِذَا قَامَ فِي مُصَلَّاهُ قَبْلَ أَنْ يُكَبِّرَ، ذَكَرَ فَانْصَرَفَ، وَقَالَ لَنَا: مَكَانَكُمْ، فَلَمْ نَزَلْ قِيَامًا نَنْتَظِرُهُ حَتَّى خَرَجَ إِلَيْنَا، وَقَدِ اغْتَسَلَ يَنْطُفُ رَأْسُهُ مَاءً، فَكَبَّرَ فَصَلَّى بِنَا.[1]

نماز کی اقامت کہی گئی اور ہم نے رسول اللہ ﷺ کے تشریف لانے سے

([1]) صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب متی یقوم الناس للصلاۃ، ح:۶۰۵)

پہلے کھڑے ہوکر صفیں برابر کرنی شروع کردیں۔ آپ ﷺ تشریف لائے اور اپنے مصلے پر کھڑے ہوگئے، تکبیر کہنے سے پہلے آپ کو غسل کرنا یاد آیا، آپ لوٹ گئے اور ہم سے فرمایا: اپنی اپنی جگہ لیے رہو، ہم آپ ﷺ کے انتظار میں کھڑے رہے، حتی کہ آپ تشریف لائے۔ اس وقت آپ کے سر اقدس سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے، پھر آپ نے تکبیر کہہ کر ہم کو نماز پڑھائی۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے تشریف لانے سے قبل ہی اقامت کہہ دی گئی تھی اور صحابہ کھڑے ہوکر اپنی اپنی صفوں میں جگہ لے چکے تھے۔

امام بزار اپنی ''مسند'' میں، اور امام ہیثمی ''مجمع الزوائد'' میں سیدنا عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا قَالَ بِلَالٌ: قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ نَهَضَ فَكَبَّرَ (1)

جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ اقامت میں ''قد قامت الصلاۃ'' کہنے لگتے تو رسول اللہ ﷺ اٹھ کھڑے ہوتے۔ پھر اللہ اکبر کہتے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ''قد قامت الصلاۃ'' کے وقت کھڑے ہوتے تھے اور تکبیر کہتے تھے۔

صحیح مسلم ہی کی ایک روایت یہ بھی ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ تُقَامُ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ، فَيَأْخُذُ النَّاسُ مَصَافَّهُمْ، قَبْلَ أَنْ يَقُومَ النَّبِيُّ ﷺ مَقَامَهُ (2)

نماز کی اقامت آپ ﷺ کی تشریف آوری پر کہی جاتی تھی اور لوگ آپ کے مصلی پر کھڑے ہونے سے پہلے اپنی اپنی صفوں میں جگہ لے لیتے تھے۔

---

(1) مجمع الزوائد منبع الفوائد، کتاب الصلاۃ، باب مایفعل اذا اقیمت الصلاۃ ح:۱۹۲۰) مسند البزار، ح:۳۳۷۱

(2) صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب متی یقوم الناس للصلاۃ، ح:۶۰۵)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے آنے پر اقامت کہی جاتی تھی، اور اقامت ہوتے ہی لوگ اپنی اپنی صفوں میں جگہ لے لیتے تھے، اس کے بعد آپ ﷺ مصلی پر کھڑے ہوتے اور نماز پڑھاتے تھے۔

ایک حدیث حضرت جابر بن سمرہ سے مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

كَانَ بِلَالٌ يُؤَذِّنُ إِذَا دَحَضَتْ، فَلَا يُقِيمُ حَتَّى يَخْرُجَ النَّبِيُّ ﷺ، فَإِذَا خَرَجَ أَقَامَ الصَّلَاةَ حِينَ يَرَاهُ. [1]

حضرت بلال رضی اللہ عنہ آفتاب ڈھلنے کے بعد اذان کہتے تھے، اور اقامت اس وقت تک نہیں کہتے تھے جب تک حضور کو تشریف لاتے نہ دیکھ لیتے۔

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ اقامت آپ کے آنے کے بعد ہی کہی جاتی تھی۔

ترمذی کی حدیث ہے۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

كَانَ مُؤَذِّنُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُمْهِلُ فَلَا يُقِيمُ، حَتَّى إِذَا رَأَى رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ خَرَجَ أَقَامَ الصَّلَاةَ حِينَ يَرَاهُ[2]

رسول اللہ ﷺ کے مکبر تکبیر کہنے میں تاخیر کرتے تھے اور اس وقت تک اقامت نہیں کہتے جب تک آپ کو دیکھ نہ لیتے جب دیکھتے اس وقت اقامت کہتے تھے۔

صحیح بخاری میں ہے، حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ، فَلَا تَقُومُوا حَتَّى تَرَوْنِي[3]

جب اقامت کہی جائے تو اس وقت تک مت کھڑے ہو جب تک مجھے نہ دیکھ لو۔

([1]) صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب متی یقوم الناس للصلاۃ، ح:۶۰۶)

([2]) سنن الترمذی، ابواب الصلاۃ، باب ماجاء ان الامام احق بالاقامۃ، ح:۲۰۲)

([3]) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب: متی یقوم الناس، اذا رأوا الامام عند الاقامۃ، ح:۶۳۷)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کو دیکھنے سے پہلے کھڑا ہونا منع ہے اور آپ کو دیکھتے ہی کھڑا ہو جانا ہے، خواہ تکبیر شروع ہوتے ہی حضور کو دیکھ لیا جائے یا حی علی الصلاۃ یا حی علی الفلاح یا ختم تکبیر پر حضور کو دیکھا جائے، ہر صورت میں کھڑا ہونا جائز ہے۔

ان احادیث کے درمیان بظاہر تضاد نظر آتا ہے، اس تضاد کو امام نووی، حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ بدر الدین عینی نے ختم کرنے کی کوششیں کی ہیں۔

امام محی الدین نووی (۶۷۶ھ) لکھتے ہیں:

يُجْمَع بَيْن مُخْتَلَف هَذِهِ الْأَحَادِيث بِأَنَّ بِلَالًا -رضی اللہ عنہ- كَانَ يُرَاقِبُ خُرُوجَ النَّبِيّ ﷺ مِنْ حَيْثُ لَا يَرَاهُ غَيْره أَوْ إِلَّا الْقَلِيل ، فَعِنْد أَوَّل خُرُوجه يُقِيم ، وَلَا يَقُوم النَّاس حَتَّى يَرَوْهُ ، ثُمَّ لَا يَقُوم مَقَامه حَتَّى يَعْدِلُوا الصُّفُوف . وَقَوْله فِي رِوَايَة أَبِي هُرَيْرَة رضی اللہ عنہ: (فَيَأْخُذ النَّاس مَصَافّهمْ قَبْل خُرُوجه) . لَعَلَّهُ كَانَ مَرَّة أَوْ مَرَّتَيْنِ ، وَنَحْوهمَا ، لِبَيَانِ الْجَوَاز أَوْ لِعُذْرٍ ، وَلَعَلَّ قَوْله ﷺ (فَلَا تَقُومُوا حَتَّى تَرَوْنِي) كَانَ بَعْد ذَلِكَ ، قَالَ الْعُلَمَاء : وَالنَّهْي عَنْ الْقِيَام قَبْل أَنْ يَرَوْهُ لِئَلَّا يَطُول عَلَيْهِمْ الْقِيَام ، وَلِأَنَّهُ قَدْ يَعْرِض لَهُ عَارِض فَيَتَأَخَّر بِسَبَبِهِ.[1]

ان تمام مختلف احادیث کے درمیان تطبیق کی صورت یہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی آمد پر نظر گڑائے رہتے تھے، اس لیے صرف حضرت بلال یا ان کے علاوہ کچھ لوگ ہی آپ ﷺ کو نکلتے دیکھ پاتے تھے۔ آپ ﷺ کے نکلتے ہی حضرت بلال رضی اللہ عنہ اقامت شروع کر دیتے تھے اور صحابہ بھی آپ ﷺ کو دیکھتے ہی کھڑے ہو جاتے تھے، پھر حضور ﷺ پہلے صفیں درست کراتے اور اس کے بعد اپنے مصلے پر تشریف لے جاتے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی

([1]) شرح النووی علی مسلم، کتاب الصلاۃ، باب متی یقوم الناس للصلاۃ (۵/۱۰۳)

روایت میں جو یہ ہے کہ لوگ حضور ﷺ کے نکلنے سے پہلے ہی اپنی اپنی صفوں میں جگہ لے لیتے تھے، تو ہوسکتا ہے کہ یہ ایک یا دو مرتبہ کا واقعہ ہو، یا بیان جواز کے لیے ہو یا کسی عذر کی بنا پر ایسا ہو۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد کہ "مت کھڑے ہو یہاں تک کہ مجھے دیکھ لو" اس واقعہ کے بعد کا ہو۔ علما نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ کو دیکھنے سے پہلے کھڑے ہونے کی ممانعت اس لیے تھی تاکہ لوگوں پر قیام طویل نہ ہوجائے اور اس لیے بھی کہ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ کو کوئی عارضہ پیش آجائے جس کی وجہ سے نکلے میں تاخیر ہوجائے۔

علامہ بدر الدین عینی حنفی مصری (۸۵۵ھ) نے بھی عمدۃ القاري شرح صحیح البخاري (۲۱۲/۸) میں یہی توضیح و تطبیق ان ہی الفاظ سے فرمائی ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی "فتح الباری" میں ایک واضح توضیح اس طرح لکھتے ہیں:

لَا تَقُومُوا: نَهْيٌ عَنْ الْقِيَام، وَقَوْله: "حَتَّى تَرَوْنِي" تَسْوِيغٌ لِلْقِيَامِ عِنْدَ الرُّؤْيَة، وَهُوَ مُطْلَقٌ غَيْرُ مُقَيَّدٍ بِشَيْءٍ مِنْ أَلْفَاظ الْإِقَامَة.

لاتقوموا کے ذریعہ قیام سے منع کیا گیا ہے، جب کہ دیکھنے کے بعد قیام کی اجازت دی گئی ہے اور یہ اجازت مطلق ہے، اقامت کے کسی مخصوص کلمہ پر اس حکم کو مقید نہیں کیا گیا ہے۔[1]

مذکورہ بالا احادیث کریمہ اور محدثین کی تشریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دین میں اقامت کے وقت کھڑے ہونے کا کوئی متعیّن وقت مقرر نہیں ہے اور نہ ہی کلمات اقامت میں سے کسی کلمے کی ایسی تحدید کی گئی ہے کہ اس کلمے پر ہی کھڑا ہونا ضروری ہے، البتہ بعض دفعہ صحابہ کرام حضور کے تشریف لانے سے پہلے ہی کھڑے ہوگئے اور اپنی اپنی صفیں درست کرلیں تو اس کا جواب محدثین نے یہ دیا ہے کہ یہ جواز کی

([1]) فتح الباری، ابن حجر (۱۱۹/۲)

صورت ہے یا کسی عذر کی بنا پر ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ کبھی کبھی ایسا بھی کر سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا احادیث و تشریحات سے یہ بھی واضح ہوا کہ عہد رسالت میں اذان کا وقت متعیّن تھا، اقامت کا وقت متعیّن نہیں تھا، اقامت اس وقت ہوتی جب سرکار علیہ السلام مسجد میں تشریف لے آتے۔ آپ کو دیکھ کر ہی حضرت بلال اقامت شروع کرتے اور آپ کو دیکھنے کے بعد ہی صحابہ کھڑے ہوتے اور حضرت بلال کے دیکھنے اور صحابہ کے دیکھنے میں کتنے لمحات کا فاصلہ ہوتا ہوگا، اس کا تصور کیا جاسکتا ہے اور اسی سے مکبر اور مقتدیوں کے کھڑے ہونے کا مسنون وقت بھی معلوم کیا جاسکتا ہے، اصل سنت اور دائمی سنت یہی ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ وقتی یا کسی علت کے سبب ہے، جیسا کہ تشریحات کے ضمن میں مذکور ہوا۔ یہ بھی ذہن نشیں رہنا چاہیے کہ سرکار علیہ السلام حجرے میں ہوتے، مسجد میں نہ ہوتے۔ آپ کا معمول یہی تھا۔ اقامت کے وقت کھڑے ہونے کے سلسلے میں فقہا کی جزئیات اور تفریعات دیکھنے کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی جو یہ اصل سنت اور معمول ہے وہ ہمارے ذہنوں سے محو نہیں ہونا چاہیے۔

مذکورہ روایات و تشریحات کی روشنی میں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حدیث میں ابتدا سے کھڑے ہونے کی ممانعت صرف اس صورت میں ہے جب امام مسجد میں نہ ہو اور مقتدی امام کے انتظار میں کھڑے ہو جائیں، جیسا کہ حدیث میں بیان ہوا کہ صحابہ کرام حضور کے تشریف لانے سے پہلے ہی کھڑے ہو جاتے تھے تو آپ نے فرمایا کہ جب تک مجھے دیکھ نہ لو اس وقت تک کھڑے مت ہوا کرو۔ اس ممانعت کی وجہ محدثین یہ بتاتے ہیں کہ تاکہ ان کو دیر تک کھڑے ہونے کی مشقت نہ اٹھانی پڑے، گویا یہ منعِ تکریم و تسہیل ہوا نہ کہ منع تحریم، یعنی ایسا نہیں کہ صحابہ کوئی ناجائز و حرام کام کرتے تھے جس سے آپ نے روکا بلکہ وہ یک گونا مشقت میں پڑ رہے تھے، اس لیے رحمت

عالم ﷺ نے ازراہ شفقت منع فرمادیا۔

خلاصہ یہ کہ حدیث کی رو سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مقتدی کا امام کے انتظار میں کھڑا ہونا منع ہے، وہ بھی اس لیے تاکہ اسے دیر تک انتظار کی مشقت نہ اُٹھانی پڑے، وہ بھی منع حرمت کے لیے نہیں بلکہ منع تیسیر وتسہیل کے لیے ہے، اس کے علاوہ کسی اور صورت میں مقتدیوں کے لیے کھڑے ہونے کی ممانعت حدیث میں مذکور نہیں، بلکہ صحابہ کرام کی محبت اور بارگاہ نبوی کے آداب کو مدنظر رکھا جائے تو یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ابتدائے اقامت میں کھڑا ہونا ہی اولیٰ ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ احادیث میں یہ صراحت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''لاتقوموا حتی ترونی '' مجھے دیکھنے سے قبل کھڑا مت ہوا کرو۔ اب سوال ہے کہ صحابہ کا عام معمول اقامت کہنے کا کیا رہا ہوگا۔ بعض روایتیں ایسی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ کے نکلنے سے پہلے ہی صحابہ اقامت کہہ دیتے اور کھڑے بھی ہوجایا کرتے لیکن شارحین حدیث نے فرمایا کہ ایسا ایک دو دفعہ ہوا ہوگا، عام معمول یہ تھا کہ حضرت بلال نبی کریم ﷺ کی آمد پر نظر گڑائے رہتے تھے اور جوں ہی آپ کی آمد کی آہٹ محسوس کرتے تکبیر شروع کردیتے، غالباً حجرۂ اقدس جو مسجد سے متّصل تھا اس کا پردہ جوں ہی ہلتا ہوگا یا اور کسی طرح سے حضرت بلال محسوس کرتے ہوں گے کہ سرکار نکل رہے ہیں فوراً اقامت شروع کردیتے رہے ہوں گے، سرکار جوں ہی مسجد میں قدم رکھتے سارے صحابہ کھڑے ہوجاتے، اس عمل میں حضرت بلال اور دوسرے صحابہ کے کھڑے ہونے میں بمشکل چند ثانیے کا فرق ہوتا ہوگا۔ یہ نہیں کہ حضور آکر کھڑے رہتے ہوں گے اور صحابہ بیٹھے رہتے ہوں گے، اور حی علی الصلاۃ یا قد قامت الصلاۃ پر سب کھڑے ہوتے ہوں گے۔ روایتوں پر نظر کرنے سے یہی واضح ہوتا ہے کہ سرکار کو دیکھتے ہی سب کھڑے ہوجاتے، سرکار صفوں کو

درست کراتے اور جب صفیں سیدھی ہوجاتیں، تب اپنے مصلی پر پہنچتے اور نماز شروع کرتے۔ یہاں یہ گمان غلط اوراحترام رسالت کے منافی ہے کہ مذکورہ روایتوں کو رد کرتے ہوئے کوئی یہ کہے کہ صحابہ حضور کے نکلنے سے پہلے از خود اقامت شروع کردیتے اور حضور ﷺ حی علی الصلاۃ پر باہر آتے؛ کیوں کہ نبی کریم ﷺ کے آنے سے پہلے تکبیر کہنا ایک طرح سے نبی دوجہاں ﷺ کو گھر سے باہر نکلنے کے لیے آواز دینا ہے جس کی صحابہ سے توقع نہیں کی جاسکتی، یہ قرآن کے مطابق آداب بارگاہ نبوی کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ، وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ(الحجرات:۵،۴)

جولوگ آپ کو گھر کے باہر سے آواز دیتے ہیں ان میں سے اکثر لوگ عقل نہیں رکھتے۔ اگر وہ لوگ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ ﷺ خود ہی باہر تشریف لے آتے تو یہ ان کے لیے زیادہ بہتر تھا، اللہ مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس کی مزید تائید ان روایتوں سے بھی ہوتی ہے جن کے مطابق کبھی کبھی صحابہ انتظار کرکے تھک جاتے، یہاں تک کہ بعض سونے لگتے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

كَانَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْتَظِرُونَ الْعِشَاءَ الْآخِرَةَ حَتَّى تَخْفِقَ رُءُوسُهُمْ، ثُمَّ يُصَلُّونَ وَلَا يَتَوَضَّئُونَ[1]

رسول اللہ ﷺ کے اصحاب عشا کا انتظار کرتے تھے، تو [انتظار طویل ہوجانے کی صورت میں] بیٹھے بیٹھے سوجاتے تھے، یہاں تک کہ ان کے سر اوندھ جاتے تھے، پھر بغیر وضو کے ہی نماز ادا کرلیتے تھے۔

([1]) سنن ابی داؤد، کتاب الطھارۃ، باب فی الوضوء من النوم، ح:۲۰۰

ایک دوسری روایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے فرمایا:

أَخَّرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ صَلَاةَ الْعِشَاءِ، ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الْمَسْجِدِ، فَإِذَا النَّاسُ يَنْتَظِرُونَ الصَّلَاةَ، قَالَ: " أَمَا إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِ هَذِهِ الْأَدْيَانِ أَحَدٌ يَذْكُرُ اللهَ هَذِهِ السَّاعَةَ غَيْرُكُمْ "[1]

ایک روز آپ ﷺ نے عشا کی نماز مؤخر فرمادی، پھر جب آپ مسجد پہنچے تو دیکھا کہ لوگ نماز کا انتظار کر رہے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: دینِ خدا کو ماننے والوں میں سے کوئی اس وقت تمھارے علاوہ اللہ کو یاد نہیں کر رہا ہے۔

لہٰذا جن حدیثوں میں یہ آیا ہے کہ مکبر نے حی علی الصلاۃ کہا اس وقت آپ ﷺ نماز کے لیے آئے، یہ اس حدیث کے بھی خلاف ہے جو ترمذی کے حوالے سے گزری، صحابہ کے ادب کے بھی خلاف ہے اور قرآن کے منشا کے بھی خلاف ہے، محدثین نے اس کی توضیح بھی کر دی کہ ایسا ایک یا دو بار ہوا ہوگا، یہاں یہ بات بھی سراسر وسوسہ ہے اگر کوئی یہ سوچے کہ آپ خود سے حجرہ سے نکل کر مسجد میں آکر مصلی پر بیٹھ جاتے اور پھر حی علی الصلاۃ پر کھڑے ہوتے تھے کیوں کہ یہ آپ سے نہ ثابت ہے اور نہ عقلاً بیٹھنے کی کوئی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ صحیح روایتیں اس وسوسے کی تکذیب کرتی ہیں، اس لیے یہ وسوسہ عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے۔

بعض لوگ یہ بھی احتمال نکالتے ہیں کہ حضور ﷺ اپنے حجرۂ مبارکہ سے نکلتے اور تکبیر شروع ہوجاتی لیکن صحابہ کرام حضور ﷺ کو حی علی الفلاح کے وقت دیکھتے تھے، پھر اس کے بعد کھڑے ہوتے تھے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مقتدی کو حی علی الفلاح کے وقت کھڑے ہونا چاہیے۔

([1]) مسند احمد، ح: ۳۷۶۰ (۶/۳۰۴)

یہ احتمال صحیح حدیث کے بالکل خلاف ہے، بخاری میں ہے: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آپ فرماتے ہیں: إِنَّ الْمُسْلِمِينَ بَيْنَا هُمْ فِي صَلاَةِ الفَجْرِ مِنْ يَوْمِ الِاثْنَيْنِ، وَأَبُو بَكْرٍ يُصَلِّي لَهُمْ، لَمْ يَفْجَأْهُمْ إِلَّا رَسُولُ الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ كَشَفَ سِتْرَ حُجْرَةِ عَائِشَةَ، فَنَظَرَ إِلَيْهِمْ وَهُمْ فِي صُفُوفِ الصَّلاَةِ، ثُمَّ تَبَسَّمَ يَضْحَكُ، فَنَكَصَ أَبُو بَكْرٍ عَلَى عَقِبَيْهِ لِيَصِلَ الصَّفَّ، وَظَنَّ أَنَّ رَسُولَ الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُرِيدُ أَنْ يَخْرُجَ إِلَى الصَّلاَةِ، فَقَالَ أَنَسٌ : وَهَمَّ الْمُسْلِمُونَ أَنْ يَفْتَتِنُوا فِي صَلاَتِهِمْ، فَرَحًا بِرَسُولِ الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأَشَارَ إِلَيْهِمْ بِيَدِهِ رَسُولُ الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَنْ أَتِمُّوا صَلاَتَكُمْ ثُمَّ دَخَلَ الحُجْرَةَ وَأَرْخَى السِّتْرَ.[1]

پیر کے دن مسلمان فجر کی نماز پڑھ رہے تھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے کہ اچانک نبی کریم ﷺ نظر آئے۔ آپ حجرۂ عائشہ رضی اللہ عنہا کا پردہ اٹھا کر صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھ رہے تھے۔ صحابہ نماز میں صف باندھے کھڑے تھے۔ نبی کریم ﷺ دیکھ کر ہنس پڑے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹنے لگے تاکہ صف میں آ جائیں۔ آپ نے سمجھا کہ نبی کریم ﷺ نماز کے لیے تشریف لانا چاہتے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، قریب تھا کہ مسلمان اُس خوشی کی وجہ سے جو نبی کریم ﷺ کو دیکھ کر انہیں ہوئی تھی وہ اپنی نماز توڑ دیتے لیکن آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ نماز پوری کر لو، پھر آپ حجرہ کے اندر تشریف لے گئے اور پردہ ڈال لیا۔

آپ غور کریں کہ حضور نے صرف پردہ ہٹایا تو تمام صحابہ نے آپ کو دیکھ لیا، جب کہ اس وقت صحابہ نماز میں تھے، لہٰذا جب صحابہ نماز کے لیے آپ کے انتظار میں بیٹھے ہوں، اس وقت آپ کو حجرہ سے نکلنے کے بعد حی علی الفلاح پر دیکھتے، یہ سمجھ سے باہر ہے۔

([1]) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ، ح:۴۴۴۸) دار طوق النجاۃ

مسئلہ اقامت اور صحابہ و تابعین کا عمل

اب ہم اقامت کے وقت کھڑے ہونے کے سلسلے میں صحابہ و تابعین کے معمولات کا جائزہ لیتے ہیں ، تاکہ عہد رسالت کے بعد زیر بحث مسئلے کے تعلق سے امت کا تعامل کیا تھا، وہ سامنے آسکے۔ لیکن یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ صحابہ اور تابعین کی طرف منسوب ہر بات کو ان کا معمول نہیں کہہ سکتے؛ کیوں کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا کہ وہ حضرات کوئی عمل کسی مصلحت کی بنا پر انجام دے دیتے ہیں حالانکہ وہ ان کا معمول نہیں ہوتا۔ اسی طرح بسا اوقات ان سے کوئی روایت منقول ہوتی ہے جب کہ وہ ان کا مذہب نہیں ہوتا۔

اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب ہم صحابہ اور تابعین کے معمولات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں صحابہ اور تابعین سے دو طرح کی روایتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) قد قامت الصلاۃ پر کھڑے ہونے کا استحباب

(۲) ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کا وجوب

قد قامت الصلاۃ پر کھڑے ہونے کا استحباب:

حضرت ابن المبارک حضرت ابو یعلی سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

رَأَيْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ إِذَا قِيلَ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ قام فوثب[1]

([1]) ابن عبد البر، الاستذکار، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی النداء للصلاۃ (۱/۳۹۱)

میں نے حضرت انس کو دیکھا کہ جب قد قامت الصلاۃ کہا گیا تو آپ فورًا کھڑے ہو گئے۔

امام عبدالرزاق اپنی سند سے امام حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں نقل کرتے ہیں:

أَقَامَ الْمُؤَذِّن بِالصَّلَاةِ، فَلَمَّا قَالَ: قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ، قَامَ حُسَيْنٌ[1]

مؤذن نے نماز کے لیے اقامت کہی تو جب وہ قد قامت الصلاۃ کہنے لگا تو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے۔

امام عبدالرزاق لکھتے ہیں:

عَنْ عَطِيَّةَ قَالَ: كُنَّا جُلُوسًا عِنْدَ ابْنِ عُمَرَ فَلَمَّا أَخَذَ الْمُؤَذِّنُ فِي الْإِقَامَةِ قُمْنَا، فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: " اجْلِسُوا فَإِذَا قَالَ: قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ فَقُوْمُوا "[2]

حضرت عطیہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے تھے، جب موذن نے اقامت کہنا شروع کیا، تو ہم لوگ نماز کے لیے کھڑے ہو گئے، حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ، جب موذن قد قامت الصلاۃ کہنے لگے تب کھڑے ہونا۔

ان روایات سے حضرت انس، حضرت امام حسین اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کا پسندیدہ عمل قد قامت الصلاۃ پر کھڑا ہونا معلوم ہوتا ہے لیکن ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کی ممانعت صرف حضرت ابن عمر کی روایت سے سمجھ میں آتی ہے تو یہ اس صورت پر محمول ہے جب امام مسجد میں موجود نہ ہو، کیوں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے امام کی عدم موجودگی میں کھڑے ہونے سے منع فرمایا تھا، ورنہ اصلاً اس کی ممانعت شرع سے ثابت نہیں ہے۔ بلکہ اقامت کے وقت جلدی کھڑا ہونا یہ تعجیل من

([1]) مصنف عبدالرزاق، کتاب الصلاۃ، باب قیام الناس عند الاقامۃ، ح: ۱۹۳۷)

([2]) مصنف عبدالرزاق، کتاب الصلاۃ، باب قیام الناس عند الاقامۃ، ح: ۱۹۴۰)

الصلاۃ کی قبیل سے ہے اور تعجیل من الصلاۃ سے روکنا شرع میں غیر معقول ہے۔ اور مقدم الذکر دونوں نفوس قدسیہ حضرت انس، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما سے کوئی ایسی روایت منقول نہیں ہے کہ جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ آپ دونوں ابتدا میں کھڑے ہونے کی کراہت کے قائل تھے اور نہ کوئی ایسی روایت ملتی ہے کہ جس میں یہ ہو کہ آپ دونوں ابتدا میں کھڑے نہیں ہوتے تھے بلکہ صرف روایتوں میں یہ ملتا ہے کہ آپ دونوں "قدقامت الصلاۃ" کے وقت کھڑے ہوتے تھے۔ اس سے صرف زیادہ سے زیادہ "قدقامت الصلاۃ" کے وقت کھڑے ہونے کا استحباب ثابت ہوگا، اور اس کے ہم بھی قائل ہیں کہ کھڑے ہونے کا استحباب ابتدا سے لے کر "قدقامت الصلاۃ" تک رہتا ہے، لہٰذا اس درمیان میں جب بھی کھڑا ہوا جائے استحباب ہی پر عمل ہوگا۔ ہاں! اس سے زیادہ تاخیر کرنے سے استحباب ختم ہوجائے گا۔

ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کا وجوب:

امام ابن عبد البر کی "الاستذکار" میں ہے، حضرت عمر بن مہاجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: إِذَا سَمِعْتَ النِّدَاءَ بِالْإِقَامَةِ فَكُنْ أَوَّلَ مَنْ أَجَابَ[1]

جب تم اقامت کی ندا سنو تو سب سے پہلے اس کی بجاآوری کرنے والے بنو۔ عمر بن مہاجر مزید فرماتے ہیں:

رَأَيْتُ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيزِ وَمُحَمَّدَ بْنَ كَعْبٍ الْقُرَظِيَّ وَسَالِمَ بْنَ عَبْدِ اللهِ وَأَبَا قِلَابَةَ وَعِرَاكَ بْنَ مَالِكٍ الْغِفَارِيَّ وَمُحَمَّدَ بْنَ مُسْلِمٍ الزُّهْرِيَّ وَسُلَيْمَانَ بْنَ حَبِيبٍ يَقُومُونَ إِلَى الصَّلَاةِ فِي أَوَّلِ بَدْءِ الْإِقَامَةِ.[2]

میں نے دیکھا کہ عمر بن عبد العزیز، سالم بن عبد اللہ، ابو قلابہ، عراک بن مالک

([1]) ابن عبد البر/الاستذکار، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی النداء للصلاۃ (۱/۳۹۱)

([2]) ابن عبد البر/الاستذکار، کتاب الصلاۃ: باب ماجاء فی النداء للصلاۃ (۱/۳۹۱)

غفاری، محمد بن قرظی اور امام زہری اقامت شروع ہوتے ہی نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے۔

علامہ محمد بن ابراھیم بن منذر نیشاپوري (۲۴۲-۳۱۹ھ) جو ایک زبردست مجتہد اور فقیہ ہیں، آپ کی متعدّد مایہ ناز تصانیف ہیں، ان ہی میں سے ایک ''الاوسط في السنن والاجماع والاختلاف'' ہے، جس میں آپ فرماتے ہیں:

وَكَانَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ، وَمُحَمَّدُ بْنُ كَعْبٍ الْقُرَظِيُّ، وَسَالِمُ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ، وَأَبُو قِلَابَةَ، وَعِرَاكُ بْنُ مَالِكٍ، وَالزُّهْرِيُّ، وَسُلَيْمَانُ بْنُ حَبِيبٍ الْمُحَارِبِيُّ يَقُومُونَ إِلَى الصَّلَاةِ فِي أَوَّلِ بَدْئِهِ مِنَ الْإِقَامَةِ. وَبِهِ قَالَ عَطَاءٌ وَهُوَ مَذْهَبُ أَحْمَدَ، وَإِسْحَاقَ إِذَا كَانَ الْإِمَامُ فِي الْمَسْجِدِ.

عمر بن عبد العزیز، سالم بن عبد اللہ، ابو قلابہ، عراک بن مالک غفاری، محمد بن کعب قرظی اور امام زہری اقامت شروع ہوتے ہی نماز کے لیے کھڑے ہوجاتے تھے۔ یہی امام عطا بن یسار، احمد بن حنبل اور اسحاق بن راھویہ کا مذہب ہے اور یہ اس صورت میں ہے جب امام مسجد میں موجود ہو۔[1]

ابن حجر عسقلانی نے ''فتح الباری'' میں، بدر الدین عینی حنفی نے ''عمدۃ القاری'' میں، ابن عبد البر نے ''الاستذکار'' میں، قاضی عیاض نے ''اکمال المعلم بفوائد المسلم'' میں اور ابن ملقن نے ''التوضیح لشرح الجامع الصحیح'' میں حضرت سعید بن مسیب اور حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہما کا یہ مذہب بیان کیا ہے، آپ فرماتے ہیں:

إِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ اللهُ أَكْبَرُ وَجَبَ الْقِيَامُ وَإِذَا قَالَ حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ عُدِّلَتِ الصُّفُوفُ وَإِذَا قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ كَبَّرَ الْإِمَامُ.

جب مکبر ''اللہ اکبر'' کہے اس وقت نماز کے لیے کھڑا ہونا واجب ہے اور جب

([1]) الاوسط فی السنن والاجماع والاختلاف، کتاب الامامۃ (۴/۱۶۶، ح:۱۹۵۸)

حی علی الصلاۃ کہے، اس وقت صفیں درست کرلی جائیں اور جب ''لاالہ الااللہ کہے'' اس وقت امام نماز کے لیے تکبیر کہہ دے۔[1] ان تمام روایات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں صحابہ اور تابعین کا عمل مختلف ہے، بعض افراد کا معمول قد قامت الصلاۃ پر کھڑے ہونے کا ہے جب کہ بہت سے حضرات کا معمول ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کا ہے اور بقول حضرت سعید بن مسیب اور عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہما کے، ابتدائے اقامت میں کھڑا ہونا واجب ہے۔

مذکورہ بالا روایات وتشریحات کی روشنی میں ایک بات اور سمجھ میں آتی ہے کہ شروع میں کھڑے ہونے کی کراہیت امام کے انتظار کے ساتھ مشروط ہے۔ یعنی امام موجود نہیں ہے اور مقتدی کھڑے ہوکر انتظار کریں، یہ مکروہ ہے، کیوں کہ اس عمل میں خواہ مخواہ مشقت اور تکلف ہے جو دین کی سادگی کے خلاف ہے۔ البتہ ایک طبقہ وہ ہے جو شروع میں کھڑے ہونے کے استحباب کا قائل یا کم از کم عامل ہے اور ایک طبقہ قد قامت الصلاۃ پر کھڑے ہونے کو مستحب سمجھتا ہے۔ ان دونوں میں سے کسی پر بھی عمل کیا جاسکتا ہے۔ البتہ قد قامت الصلاۃ پر کھڑے ہونے میں ایک اشکال یہ ہے کہ اس صورت میں عمل بالاستحباب تو ہو جائے گا جو ایک گروہ کا مذہب ہے لیکن ایک دوسرے گروہ کے مطابق جو شروع میں کھڑے ہونے کو واجب کہتا ہے، اس صورت میں ترک وجوب لازم آئے گا۔ اس لیے جمع وتطبیق اور رفع خلاف کا سب سے اعلی طریقہ یہی ہے کہ شروع میں کھڑا ہوا جائے۔ صوفیہ کا مذہب احتیاط ہے اور احتیاط اسی صورت میں ہے کیوں کہ اس صورت میں صرف ایک مذہب کے مطابق ترک استحباب لازم آئے گا اور دوسری صورت میں ایک مذہب کے مطابق ترک وجوب لازم آئے گا اور ترک استحباب ترک وجوب سے اولی واعلی ہے۔

([1]) ابن حجر، فتح الباری (۴۵۱/۲) عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری (۲۱۱/۸) الاستذکار (۳۹۱/۱) اکمال المعلم بفوائد مسلم (۵۵۷/۲) التوضیح لشرح الجامع الصحیح (۴۰۸/۶)

ایک ضروری تنبیہ:

بعض لوگ اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے ائمہ اعلام اور کبار تابعین پر بھی نشانہ سا دھنے سے نہیں چوکتے، اپنی بات کو مضبوط دلائل سے پیش کرنااور دوسرے موقف کو ضعیف قرار دینا تودرست ہے لیکن خیر القرون کے لوگوں کو قابل اعتنانہ گردانناجسارت ہے، اس سے بچنا چاہیے تاکہ آنے والی نسلوں کو خارجیت کے اثرات سے محفوظ رکھاجاسکے۔

اقامت کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے بعض علمانے ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کے قائلین جیسے حضرت سعید بن مسیب اور عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہما وغیرہ کے موقف کا رد اس طرح بھی کیا ہے کہ "یہ حضرات مجتہد نہیں تھے، اس لیے ان کی بات قابل توجہ نہیں ہے۔" یہ سراسر غلط ہے، کیوں کہ یہ حضرات تابعین و مجتہدین ہیں، بہت سارے مسائل میں اپنی رائے رکھتے ہیں، ہم ذیل میں اختصار کے ساتھ ان جلیل القدر حضرات کے علمی مقام کو اجاگر کرتے ہیں جو ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کے قائلین میں سے ہیں:

حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب کا علمی مقام

آپ کا نام سالم بن عبد اللہ بن عمر بن خطاب تھا۔آپ جلیل القدر تابعی، محدث اور مدینہ منورہ کے مفتی اور فقہائے سبعہ سے تھے۔آپ کے متعلق امام ذہبی لکھتے ہیں:أحد من جمع بين العلم والعمل والزهد والشرف[1] آپ ان میں سے ایک تھے جنہوں نے علم وعمل اور زہد وبزرگی کو ایک ساتھ جمع کرلیا تھا۔

امام مالک بن انس آپ کے بارے میں فرماتے ہیں:

لم يكن أحد في زمانه أشبه منه بمن مضى من الصالحين في

([1])تذکرۃ الحفاظ (۸۸/۱)

الزهد والفضل[1] آپ اپنے زمانے میں سلف صالحین کی طرح زہد وورع اور شرف وبزرگی میں بے مثل تھے۔ آپ کی وفات ۱۰۶ھ مدینہ منورہ میں ہوئی۔

حضرت ابوقلابہ کا علمی مقام

آپ کا نام عبداللہ بن زید، لقب: امام، شیخ الاسلام، آپ جرمی بصری ہیں، اور بڑے تابعین میں سے ہیں۔ آپ کے متعلق حضرت حماد بن زید فرماتے ہیں: میں نے حضرت ایوب کو ابوقلابہ کے بارے میں کہتے ہوئے سنا، آپ فرمارہے تھے کہ "كَانَ أَبُو قِلَابَةَ وَاللهِ مِنَ الْفُقَهَاءِ ذَوِي الْأَلْبَابِ". [2]

یعنی ابوقلابہ گہری فہم رکھنے والے فقیہ تھے۔ اور حلیۃ الاولیا میں ہے، حضرت مسلم بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لَوْ كَانَ أَبُو قِلَابَةَ مِنَ الْعَجَمِ كَانَ مُوبَذَ مُوبَذَانَ[3] اگر ابوقلابہ عجمی ہوتے تو قاضی القضاہ ہوتے۔

اور اسی کتاب میں آپ کے متعلق حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا قول منقول ہے، آپ فرماتے ہیں:

لَنْ تَزَالُوا بِخَيْرٍ يَا أَهْلَ الشَّامِ مَا دَامَ فِيكُمْ هَذَا أَوْ مِثْلُ هَذَا[4]

اے شام والو! جب تک یہ یا ان کے جیسے لوگ تمھارے درمیان رہیں گے تم لوگ بھلائی میں رہوگے۔ آپ کی وفات ۱۰۴/۱۰۶/۱۰۷ھ میں ہوئی۔

حضرت عراک بن مالک غفاری کا مقام

آپ اجلہ تابعین سے تھے، فقیہ اور نہایت متقی تھے، آپ کے متعلق حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ما أعلم أحداً أكثر صلاةً من عراك بن مالك۔[5] میں نے عراک بن مالک سے زیادہ کسی کو نماز ادا کرتے ہوئے نہیں

([1]) تذکرۃ الحفاظ (۸۹/۱)
([2]) سیر اعلام النبلاء (۴۷۰/۴)
([3]) حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء (۲۸۴/۲)
([4]) حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء (۲۸۴/۲)
([5]) الوافی بالوفیات (۳۵۶/۶)

دیکھا۔آپ کی وفات تقریبًا ۱۱۰ھ میں ہوئی۔

حضرت محمد بن کعب قرظی کا علمی مقام

آپ تابعی، محدث اور مفسر تھے،آپ کے متعلق عون بن عبداللہ فرماتے ہیں:

ما رأيت أحدا أعلم بتأويل القرآن من القرظي.[1] میں نے قرظی سے زیادہ کسی کو فہم قرآن کا عالم نہیں دیکھا۔آپ کی وفات ۱۰۸/۱۲۰ھ میں ہوئی۔

حضرت محمد بن مسلم ابن شہاب زہری کا علمی مقام

آپ تابعی، محدث اور فقیہ تھے،آپ کے متعلق امام مالک کا بیان ہے:

ما أدركت بالمدينة فقيها محدثا غير واحد، فقلت له: من هو؟ فقال: ابن شهاب الزهري.[2]

میں نے مدینہ میں ایک شخص کے سوا کسی اور کو محدث اور فقیہ نہیں پایا،آپ سے دریافت کیا گیا کہ وہ کون شخص ہے؟آپ نے فرمایا:ابن شہاب زہری۔آپ کی وفات ۱۲۴ھ میں ہوئی۔

حضرت سلیمان بن حبیب محاربی کا علمی مقام

آپ کا نام سلیمان بن حبیب محاربی دارانی ہے اور کنیت ابو بکر،آپ ثقہ تابعی تھے اور دمشق میں تیس سال منصب قضا پر فائز رہے۔آپ کی وفات ۱۲۰ھ میں ہوئی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا علمی مقام

آپ کا نام عمر بن عبدالعزیز بن مروان بن حکم ہے۔آپ کی پیدائش ۶۱ ہجری میں ہوئی جب کہ وفات ۱۰۱ ہجری میں ہوئی۔آپ خلافت بنوامیہ کے آٹھویں خلیفہ تھے اور سلیمان بن عبدالملک کے بعد مسند خلافت پر بیٹھے۔آپ زہد وورع اور عدل و انصاف کے پیکر اور پہلی صدی کے مجدد تھے۔آپ نے اپنے دور خلافت کو منہاج

([1])سیر اعلام النبلاء(۶۸/۵)

([2])ابن سعد/الطبقات الکبری(۳۸۸/۲)

نبوت پر استوار کیا، اسی وجہ سے آپ کو خلیفہ راشد بھی کہا جاتا ہے۔[1]

آپ کے بارے میں امام ذہبی لکھتے ہیں:

وَكَانَ مِنْ أَئِمَّةِ الاجْتِهَادِ، وَمِنَ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ - رَحْمَةُ اللهِ عَلَيْهِ[2]

آپ امام مجتہد اور خلیفہ راشد تھے۔

مزید امام ذہبی "تذکرۃ الحفاظ" میں لکھتے ہیں:

وكان إماما فقيها مجتهدا عارفا بالسنن كبير الشأن ثبتا حجة حافظا قنتا لله أواها منيبا[3]

حضرت عمر بن عبد العزیز امام، فقیہ مجتہد، سنت نبویہ کے عارف، بڑی شان کے مالک، ثقہ، حجت، حافظ، اللہ کے مطیع، گریہ کناں اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

امام ابن کثیر "البدایۃ والنہایۃ" میں لکھتے ہیں:

فَقَالَ جَمَاعَةٌ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ مِنْهُمْ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ فِيمَا ذَكَرَهُ ابْنُ الْجَوْزِيِّ وَغَيْرُهُ: إِنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيزِ كَانَ عَلَى رَأْسِ الْمِائَةِ الْأُولَى، وَإِنْ كَانَ هُوَ أَوْلَى مَنْ دَخَلَ فِي ذَلِكَ وَأَحَقَّ، لِإِمَامَتِهِ وَعُمُومِ وِلَايَتِهِ، وقيامه واجتهاده فِي تَنْفِيذِ الْحَقِّ[4]

حضرت امام احمد بن حنبل سمیت اہل علم کی ایک جماعت نے کہا ہے جس کو ابن جوزی کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز پہلی صدی کے مجدد تھے، کیوں کہ آپ ہی اپنی انوکھی امامت، حکومت، نظامت اور نفاذ حق میں اجتہادی شان رکھنے کی وجہ سے اس کے زیادہ حق دار تھے۔

([1]) تفصیل کے لیے دیکھئے سیرۃ ومناقب امیر المومنین للابن جوزی، ص: ۵۳-۵۴)

([2]) سیر اعلام النبلاء (۱۱۴/۵)

([3]) تذکرۃ الحفاظ (۹۰/۱)

([4]) البدایۃ والنہایۃ (۲۰۷/۹)

ابن کثیر ''البدایۃ والنہایۃ'' ہی میں ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

قال الإمام أحمد بن حنبل لا أدري قول أحد من التابعين حجة إلا قول عمر بن عبد العزيز[1]

امام احمد بن حنبل نے فرمایا: تابعین میں سے سوائے عمر بن عبد العزیز کے کسی کو میں نہیں جانتا جس کا قول دوسروں کے لیے حجت ہو۔

اس قول کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کا قول دوسرے کے لیے حجت ہوا کرتا تھا۔

اور علامہ عبد القادر محی الدین قرشی حنفی (۷۷۵ھ) فرماتے ہیں:

فَائِدَة: يَقُولُونَ أَصْحَابنَا فِي كتبهمْ فِي مسَائِل الْخلاف :(وَهُوَ قَول عمر الصَّغِير) يُرِيدُونَ بِهِ عمر بن عبد العزيز الإِمَام الْخَلِيفَة الْمَشْهُور۔[2]

اختلافی مسئلے میں ہمارے اصحاب حنفیہ کہتے ہیں ''یہ عمرِ صغیر کا قول ہے'' اور اس سے مراد عمر بن عبد العزیز ہوتے ہیں جو مشہور امام اور خلیفہ ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ احناف کے درمیان جب کسی مسئلے میں اختلاف ہوتا تو بطور استدلال حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کا قول پیش کیا جاتا۔

اب اگر کوئی ان کے قول کو یہ کہہ کر رد کر دے کہ وہ مجتہد نہیں تھے تو اس کا یہ رد کتنا سطحی ہوگا، اس کو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔

حضرت سعید بن مسیب کا علمی مقام:

آپ کا نام سعید بن مسیب بن حزن بن ابی وھب مخزومی ہے، آپ کا لقب عالم اہل المدینۃ اور سید التابعین ہے، آپ کی پیدائش حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ

([1]) البدایۃ والنہایۃ (۱۹۲/۹)

([2]) الجواھر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ (۵۵۲/۴)

خلافت ۱۵ ہجری میں ہوئی اور وفات ۹۴ ہجری میں، آپ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے داماد تھے، آپ اپنے علم اور فقاہت کی وجہ سے صحابہ کی موجودگی ہی میں فتوی دینے لگے تھے۔[1]

ابن شہاب زہری آپ کے متعلق فرماتے ہیں:

كنت أطلب العلم من ثلاثة: سعيد بن المسيب، كان أفقهَ الناس[2]

میں تین لوگوں سے علم حاصل کرتا تھا، ان میں سے ایک سعید بن مسیب ہیں جو سب سے بڑے فقیہ تھے۔

ڈاکٹر وھبہ ذحیلی نے اپنی کتاب ''سعید بن مسیب، سید التابعین'' میں آپ کے فقہ کے متعلق ایک باب باندھا ہے، اس میں لکھتے ہیں:

اشتهر سعيد بن مسيب بالفقه والفتوى، لأنه كان فقيه النفس، واسع العلم، خصب المعرفة، وأعلم الناس بالقضا، حتى قيل له ''فقيه الفقهاء'' وكان أعلم الناس بما تقدمه من الآثار و افقههم فی رأيه[3]

سعید بن مسیب فقہ اور فتاوی میں مشہور تھے، کیوں کہ آپ فقیہ النفس، وسیع النظر، خوب آگہی رکھنے والے اور مسئلہ قضا کو لوگوں میں سب سے زیادہ جاننے والے تھے، اسی لیے آپ کا لقب ''فقیہ الفقہا'' تھا، آپ آثارِ صحابہ کے سب سے بڑے عالم، اور اپنی رائے میں ان کی موافقت کرنے والے تھے۔

ڈاکٹر وھبہ ذحیلی اسی کتاب میں آگے لکھتے ہیں:

قال ابن قتيبة: كان سعيد أفقه أهل الحجاز[4]

ابن قتیبہ فرماتے ہیں: سعید بن مسیب حجاز کے سب سے بڑے فقیہ تھے۔

([1]) صور من حياة التابعين (ص: ۱۹۷)
([2]) اعلام الموقعين عن رب العالمين لابن القيم (۴۰/۲)
([3]) سعید بن مسیب، سید التابعین (ص: ۱۲۶-۱۲۵)
([4]) سعید بن مسیب، سید التابعین (ص: ۱۲۶)

کچھ صفحے بعد ڈاکٹر زہیلی حضرت سعید بن مسیب کے فقہی منہج کے بارے میں لکھتے ہیں:

كان سعيد بن المسيب فى الاجتهاد الفقهى هونفس منهج الصحابة، بالاعتماد على مصادر الفقه الأساسية الأربعة و هى الكتاب و السنة والإجماع والقياس، إذالم يجدحكما للحادثة فى القرآن والسنة والإجماع نظر وتخير من أقوال الصحابة واتبع عن دليل و فكر لا عن تقليد[1]

سعید بن مسیب فقہی اجتہاد میں بعینہ صحابہ کے منہج پر تھے ،فقہ کے جو چار بنیادی ماخذ کتاب و سنت اور اجماع وقیاس ہیں ،ان ہی پر اعتماد کرتے تھے ، جب درپیش مسائل میں کتاب و سنت اور اجماع سے دلیل نہ پاتے تو غور و فکر کے ذریعہ اقوال صحابہ میں سے کسی ایک قول کو اختیار فرماتے اوراس معاملے میں دلیل کی پیروی کرتے، کسی کی تقلید نہیں کرتے۔

مذکورہ حوالوں کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ آپ خود مجتہد تھے اور کثیر صحابہ کی موجودگی میں بھی آپ کی طرف لوگ مسائل میں رجوع فرماتے تھے،اس کے باوجود کوئی ان کی بات یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ وہ مجتہد نہیں تھے، تو ایسے شخص کے بھولے پن پر حیرت ہوتی ہے۔

([1])سعید بن مسیب، سید التابعین (ص:۱۲۸)

مسئلۂ اقامت میں مذاہب اربعہ کا موقف

اقامت کے وقت کھڑے ہونے کے سلسلے میں حضور رسالت مآب، صحابہ اور تابعین کے معمولات کے حوالے سے مختلف روایات اور ان میں تطبیق وترجیح کے بعد اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے کو ائمہ مجتہدین اور مذاہب اربعہ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

امام مالک کا مذہب:

''مؤطا''میں ہے کہ امام مالک سے اقامت کے وقت کھڑے ہونے کے بارے میں پوچھا گیا توآپ نے ارشاد فرمایا:

وَأَمَّا قِيَامُ النَّاسِ، حِينَ تُقَامُ الصَّلَاةُ، فَإِنِّي لَمْ أَسْمَعْ فِي ذَلِكَ بِحَدٍّ يُقَامُ لَهُ، إِلَّا أَنِّي أَرَى ذَلِكَ عَلَى قَدْرِ طَاقَةِ النَّاسِ، فَإِنَّ مِنْهُمُ الثَّقِيلَ وَالْخَفِيفَ، وَلَا يَسْتَطِيعُونَ أَنْ يَكُونُوا كَرَجُلٍ وَاحِدٍ[1]

اقامت کے وقت کھڑے ہونے کی حد کیا ہے ؟اس سلسلے میں میں نے کوئی ایسی بات نہیں سنی جس کی روشنی میں اس کی کوئی متعیّن حد مقرر کی جائے۔البتہ میرے نزدیک یہ مسئلہ لوگوں کی استطاعت پر موقوف ہے،کیوں کہ بعض لوگ بھاری جسم کے ہوتے ہیں اور بعض ہلکے جسم کے ہوتے ہیں،سب لوگ ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے،اس لیے سب ایک ساتھ کھڑے نہیں ہوسکتے۔

([1])مؤطامالک،کتاب الصلاۃ،باب ماجاءفي النداء للصلاۃ(۱/۷۰)

امام شافعی کا مذہب:

امام محی الدین نووی شافعی لکھتے ہیں:

مَذْهَب الشَّافِعِيّ – رَحِمَهُ الله تَعَالَى – وَطَائِفَة : أَنَّهُ يُسْتَحَبّ أَلَّا يَقُوم أَحَد حَتَّى يَفْرُغ الْمُؤَذِّن مِنْ الْإِقَامَة[1]

امام شافعی اور ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ اقامت سے فراغت کے بعد کھڑا ہونا مستحب ہے۔

اس سلسلے میں امام شافعی کا دوسرا قول بھی ہے جس کو امام ابن عبد البر نے ''تمہید'' میں بیان کیا ہے، آپ فرماتے ہیں:

وَقَالَ الشَّافِعِيُّ وَأَصْحَابُهُ وَدَاوُدُ الْبِدَارُ فِي الْقِيَامِ إِلَى الصَّلَاةِ أَوْلَى فِي أَوَّلِ أَخْذِ الْمُؤَذِّنِ فِي الْإِقَامَةِ لِأَنَّهُ بِدَارٌ إِلَى فِعْلِ بِرٍّ وَلَيْسَ فِي ذَلِكَ شَيْءٌ مَحْدُودٌ عِنْدَهُمْ.[2]

امام شافعی، ان کے اصحاب اور امام داؤد نے فرمایا: مکبر کے اقامت شروع کرتے ہی فوراً نماز کے لیے کھڑا ہو جانا اولی ہے، کیوں کہ یہ نیک عمل کی طرف جلدی کرنا ہے اور نیکی میں جلدی کرنے کے سلسلے میں ان کے نزدیک کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

امام احمد بن حنبل کا مذہب:

مقتدی بوقت اقامت کب کھڑے ہوں؟ اس سلسلے میں امام احمد بن حنبل سے بھی دو قول منقول ہیں۔

پہلا قول یہ ہے کہ مقتدی قد قامت الصلاۃ پر کھڑے ہوں۔[3]

دوسرا قول یہ ہے کہ اگر امام مسجد میں موجود ہو تو ابتدائے اقامت میں کھڑے

([1]) شرح النووی علی مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب متی یقوم الناس للصلاۃ (۵/۱۰۳)

([2]) التمھید، حرف میم، تابع لمحمد بن شہاب زہری (۹/۱۹۰)

([3]) شرح النووی علی مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب متی یقوم الناس للصلاۃ (۵/۱۰۳)

ہوں۔[1]

المختصر! تینوں ائمہ حضرت امام مالک، حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد بن حنبل کا اس بات میں اشتراک ہے کہ ابتدائے اقامت میں کھڑا ہونا مستحب ہے، بلکہ مشہور حنفی شارح بخاری علامہ بدر الدین عینی کے مطابق امام مالک اور جمہور علما کے نزدیک ابتدائے اقامت میں کھڑا ہونا مستحب ہے، آپ لکھتے ہیں:

ذهب مَالك وَجُمْهُور الْعلمَاء إِلَى أَنه لَيْسَ لقيامهم حد، وَلَكِن اسْتحبَّ عامتهم الْقيام إِذا أَخذ الْمُؤَذّن فِي الْإِقَامَة.[2]

امام مالک اور جمہور علما کا مذہب یہ ہے کہ کھڑے ہونے کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، پھر ان میں سے اکثر علما کا مذہب یہ ہے کہ اقامت شروع ہوتے ہی کھڑا ہونا مستحب ہے۔

البتہ اس سلسلے میں امام شافعی کا ایک قول یہ بھی ہے کہ اقامت ختم ہونے کے بعد کھڑا ہونا مستحب ہے اور اسی طرح امام احمد کا بھی ایک قول ہے کہ قد قامت الصلوۃ پر کھڑا ہونا مستحب ہے۔

امام ابو حنیفہ کا مذہب:

فقہاے احناف کے نزدیک اقامت کے وقت مقتدیوں کے کھڑے ہونے کے سلسلے میں امام کے مسجد میں ہونے کے وقت الگ حکم ہے اور نہ ہونے کی صورت میں اس کے مسجد میں داخل ہونے کی کیفیت کے لحاظ سے الگ الگ طریقہ مذکور ہے جس کی قدرے تفصیل آنے والے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

([1]) الاوسط فی السنن والاجماع والاختلاف، کتاب الامامۃ، ذکر وقت قیام المامومین الی الصلاۃ (۴/۱۶۷)

([2]) عمدۃ القاري، کتاب مواقیت الصلاۃ، باب متی یقوم الناس إذا رأوا الامام عند الاقامۃ (۸/۲۱۱)

مسئلہ اقامت میں فقہائے احناف کی تفصیل

اور بعض اختلافات میں تطبیق وترجیح کی ممکنہ صورتیں

فقہ حنفی کی نمایاں خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اندر تفصیل وتوضیح اور روایت و درایت کا کمال امتزاج پایا جاتا ہے، اسی طرح شریعت کی حکمت بالغہ، مقاصد شریعت، عرف و عادات اور احوال زمانہ کے سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ اس کے اندر عقل و درایت کا بھرپور استعمال ہوا ہے، اسی کا ایک مظہر ہمیں مسئلہ اقامت میں فقہ حنفی کی تفصیلات میں بھی نظر آتا ہے۔

اقامت کے وقت کھڑے ہونے کی فقہاے احناف نے بطور خاص تین صورتیں بیان کی ہیں؛

پہلی صورت یہ ہے کہ امام صفوں کی طرف سے مسجد میں داخل ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ جس جس صف سے امام گزرتا جائے، اس صف کے لوگ کھڑے ہوتے جائیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ امام اقامت کے وقت محراب کی جانب سے مسجد میں داخل ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ سارے مقتدی امام کو دیکھتے ہی کھڑے ہوجائیں، جیساکہ فتاوی ہندیہ میں ہے:

إِذَا كان الْإِمَامُ خَارِجَ الْمَسْجِدِ فَإِنْ دخل الْمَسْجِدَ من قِبَلِ الصُّفُوفِ فَكُلَّمَا جَاوَزَ صَفًّا قام ذلك الصَّفُّ وَإِلَيْهِ مَالَ شَمْسُ الْأَئِمَّةِ

الْحَلْوَانِيُّ وَالسَّرَخْسِيُّ وَشَيْخُ الْإِسْلَامِ خُوَاهَرْ زَادَهْ وَإِنْ كان الْإِمَامُ دخل الْمَسْجِدَ من قُدَّامِهِمْ يَقُومُونَ كما رَأَى الْإِمَامَ[1]

اگر امام مسجد کے باہر ہو اور مسجد میں صف کی جانب سے داخل ہو تو امام جس جس صف سے گزرتا جائے، اس صف کے لوگ کھڑے ہوتے جائیں، اسی کی طرف شمس الائمہ حلوانی، امام سرخسی اور شیخ الاسلام خواہر زادہ گئے ہیں اور اگر امام مسجد میں آگے سے داخل ہو تو مقتدی امام کو دیکھتے ہی کھڑے ہو جائیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ امام اقامت کے وقت مسجد میں موجود ہو، تو اس کا حکم یہ ہے کہ امام اور مقتدی حی علی الفلاح پر کھڑے ہوں، جیسا کہ امام محمد رحمہ اللہ ''موطا'' میں فرماتے ہیں :

ينبغي للقوم إذا قال المؤذن حي على الفلاح أن يقوموا إلى الصلاة... وهو قول أبي حنيفة - رحمه الله-[2]

مقتدی کے لیے مناسب یہ ہے کہ جب مکبر حی علی الفلاح پر پہنچے اس وقت کھڑے ہوں، یہی امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔

در مختار شرح تنویر الابصار میں ہے:

(والقيام) لإمام ومؤتم (حين قيل حي على الفلاح) خلافا لزفر، فعنده عند حي على الصلاة (إن كان الإمام بقرب المحراب)[3]

یعنی آداب نماز میں سے ہے کہ امام اور مقتدی اس وقت کھڑے ہوں جب مکبر حی علی الفلاح پر پہنچے اور امام زفر کے نزدیک امام اور مقتدی اس وقت کھڑے ہوں جب مکبر حی علی الصلاۃ پر پہنچے، یہ اس وقت ہے جب امام محراب میں ہو۔

([1])الفتاوی الھندیۃ(۱/۵۷)

([2])الموطا- روایۃ محمد بن الحسن(۱/۱۷۲)

([3])الدر المختار شرح تنویر الابصار(ص:۶۶)

علامہ ابوالاخلاص حسن بن عمار بن علی وفائی شرنبلالی (۱۰۶۹ھ) فرماتے ہیں:

من آدابها...والقيام حين قيل حي على الفلاح وشروع الإمام مذ قيل قد قامت الصلاة[1]

آداب نماز سے ہے کہ مقتدی اس وقت کھڑے ہوں جب مکبر حی علی الفلاح پر پہنچے، اور امام نماز اس وقت شروع کرے جب مکبر قد قامت الصلاۃ کہے۔

خلاصہ یہ کہ فقہاے احناف کے نزدیک حی علی الفلاح یا حی علی الصلاۃ پر کھڑا ہونا مستحب ہے۔ اور امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک قد قامت الصلاۃ کہنے کے وقت اور امام ابو یوسف کے نزدیک اقامت ختم ہونے کے بعد، امام کے لیے نماز شروع کر دینا مستحب ہے۔

امام طحطاوی کا موقف:

فقہاے احناف میں سے ایک نامور فقیہ امام طحطاوی (متوفی :۱۲۳۱ ھ) ابتدائے اقامت ہی میں قیام کے قائل ہیں اور درالمختار پر دو حواشی جو مقبول ہوئے ان میں ایک علامہ ابن عابدین شامی کا ہے اور دوسرا آپ کا ہے۔ آپ "در مختار" کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

(والقيام لإمام و مؤتم الخ) مسارعة لامتثال أمره و الظاهر أنه احترازعن التأخير لا التقديم حتى لو قام أول الإقامة لا بأس.[2]

(امام اور مقتدی کا کھڑا ہونا) یعنی مکبر کی آواز پر لبیک کہنا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کو مستحب کہنا یہ تاخیر سے روکنا ہے، نہ کہ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے سے روکنا، لہٰذا کوئی اگر ابتدائے اقامت ہی میں کھڑا ہو جائے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔

([1]) نور الایضاح (ص:۴۷)

([2]) طحطاوی علی الدر المختار (۱/۲۱۵)

امام طحطاوی کی توضیح کی تائید

فتاوی ہندیہ میں ہے: وَيُكَبِّرُ الْإِمَامُ قُبَيْلَ قَوْلِهِ قد قَامَتْ الصَّلَاةُ[1]

یعنی مکبر کے "قد قامت الصلاۃ" کہنے سے کچھ لمحے پہلے امام تکبیر تحریمہ کہہ دیں۔

حی علی الفلاح کے وقت قیام کو مستحب کہنا اگر مسجد میں امام موجود ہو۔اور قد قامت الصلاۃ سے کچھ لمحے پہلے تکبیر تحریمہ کہنے کو مستحب کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ "حی علی الفلاح" کے وقت قیام کرنا' استحباب کا اولِ وقت نہیں ہے کیوں کہ حی علی الفلاح کے بعد اور قد قامت الصلاۃ سے پہلے اتنا وقت نہیں ہے کہ قیام بھی کریں اور تکبیر تحریمہ بھی کہیں، اگر قیام کرتے ہیں تو صف کی درستگی بھی کرنی پڑے گی جو نہایت اہم ہے اور اتنے وقت میں صف کی درستگی نہ ہو پائے گی، معلوم ہوا کہ حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کو مستحب کہنا، تاخیر سے روکنا ہے، نہ کہ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے سے روکنا۔اس کی مزید تائید فاضل بریلوی کے فتاوے سے بھی ہوتی ہے، آپ ایک فتوی کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

اگر وہ [امام] تکبیر ہوتے میں چلا تو اسے بیٹھنے کی بھی حاجت نہیں، مصلے پر جائے اور حی علی الفلاح یا ختم تکبیر پر تکبیر تحریمہ کہے[2]

اعلی حضرت کے اس فتوی سے بھی سمجھ میں آتا ہے کہ حی علی الفلاح کے وقت قیام کرنا، استحباب کا اولِ وقت نہیں ہے، ورنہ حی علی الفلاح پر امام کو تکبیر تحریمہ کہنے کا حکم نہیں دیا جاتا، کیوں کہ اس وقت مقتدی کھڑا ہی ہو رہا ہوگا اور امام نماز شروع کر چکا ہوگا۔

لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتدائے اقامت ہی سے قیام مستحب ہے۔

اسی طرح امام طحطاوی کی توضیح کی توثیق "مضمرات" سے بھی ہوتی ہے، صاحب مضمرات نے حی علی الفلاح کے معنی بتاتے ہوئے لکھتے ہیں: ومعني قوله

([1]) الفتاوی الہندیۃ، کتاب الصلاۃ، ومما یتصل بذلک اجابۃ المؤذن ۱/۵۷)

([2]) فتاوی رضویہ (۵/۴۱۹)

حي علي الفلاح أي أسرعوا إلي ما فيه نجاتكم و سعادتكم فأقيموها لتنجوا من عذابه[1]

یعنی ''حی علی الفلاح'' کے معنی یہ ہیں کہ اس کی جانب تیزی سے بڑھو جس میں تمھارے لیے نجات اور سعادت ہے، تم اس [نماز] کو قائم کرو تاکہ اللہ کے عذاب سے نجات پاسکو۔

صاحب مضمرات نے ''حي'' کی تعبیر ''أسرعوا'' سے کی ہے جس کے معنی کسی چیز کی طرف جلدی کرنے کے ہوتے ہیں، اس سے بھی پتا چلتا ہے کہ ''حی علی الفلاح'' کے وقت قیام کا حکم دینا در اصل تاخیر سے روکنا ہے کہ قیام میں جلدی کرو تاخیر نہ کرو، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شروع سے کھڑے نہیں ہوسکتے۔

احناف کے نزدیک قیام عندالاقامہ کی کراہت اور صاحب مضمرات کا تسامح

عام طور لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ کیا فقہائے احناف کے نزدیک ابتدائے اقامت میں کھڑا ہونا مکروہ ہے؟ اس پر عرض یہ ہے کہ ابھی یہ واضح ہو چکا کہ اقامت کے وقت کھڑے ہونے کے سلسلے میں فقہ حنفی میں تفصیل ہے۔ امام آگے سے آئے تو اسے دیکھتے ہی سب کھڑے ہوجائیں۔ اگر پیچھے سے آئے تو جس صف سے گزرے اور جو لوگ اسے دیکھیں سب کھڑے ہوجائیں۔ ہاں اگر امام پیشگی طور پر مسجد میں موجود ہو تو مقتدیوں کو حی علی الصلاۃ یا حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا چاہیے۔ شارح در مختار امام طحطاوی نے اس میں مزید یہ نکتہ آفرینی فرمائی کہ یہ استحباب کی آخری حد ہے، اس لیے اس سے پہلے بھی کوئی کھڑا ہو تو استحباب باقی رہے گا، البتہ اگر حی علی الصلاۃ یا حی علی الفلاح تک بھی کھڑا نہیں ہو سکا تو ایسا شخص استحباب کے ثواب سے محروم ہو جائے گا۔ امام طحطاوی کے برخلاف بعض فقہائے متاخرین نے حی علی الصلاۃ یا حی علی الفلاح

([1])[جامع المضمرات والمشکلات، کتاب الصلاۃ، ۱/۲۹۹، دار الکتب العلمیۃ]

پر کھڑے ہونے کے استحباب کے ساتھ ایک نئے مسئلے کا اضافہ کیا کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا نہ صرف یہ کہ خلاف استحباب ہے بلکہ مکروہ ہے۔ یہ بعض متاخرین کی غلط فہمی ہے جس کا ازالہ ضروری ہے۔ یہ غلط فہمی نقل در نقل فقہاے متاخرین کے یہاں چلی آرہی ہے، ہم اس سلسلے میں پہلے فقہاے متاخرین کا موقف اور ان کے دلائل ذکر کریں گے، پھر استنباط مسائل میں جو تسامح ہوا ہے، اس کی وضاحت کریں گے۔

متاخرین فقہانے اقامت شروع ہونے کے وقت کھڑے ہونے کو مکروہ لکھا ہے۔

چنانچہ فتاوی ہندیہ میں ہے: إِذَا دخل الرَّجُلُ عِنْدَ الْإِقَامَةِ يُكْرَهُ له الِانْتِظَارُ قَائِمًا وَلَكِنْ يَقْعُدُ ثُمَّ يَقُومُ إذَا بَلَغَ الْمُؤَذِّن قَوْلَهُ حَيَّ على الْفَلَاحِ كَذَا في الْمُضْمَرَاتِ[1]

جب نمازی اقامت کے وقت مسجد میں آئے تو اس کے لیے کھڑے ہوکر انتظار کرنا مکروہ ہے، وہ بیٹھ جائے اور اس وقت کھڑا ہو جب مکبر حی علی الفلاح پر پہنچے، ایسا ہی مضمرات میں لکھا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی علیہ الرحمہ ''ردالمحتار'' میں تحریر فرماتے ہیں:

وَيُكْرَهُ لَهُ الِانْتِظَارُ قَائِمًا، وَلَكِنْ يَقْعُدُ ثُمَّ يَقُومُ إذَا بَلَغَ الْمُؤَذِّن حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ انْتَهَى هِنْدِيَّةٌ عَنْ الْمُضْمَرَاتِ[2]

یعنی نمازی کے لیے کھڑے ہوکر انتظار کرنا مکروہ ہے، وہ بیٹھ جائے، پھر اس وقت کھڑا ہو جب مکبر حی علی الفلاح پر پہنچے، ہندیہ کی عبارت ختم ہوئی، یہ مسئلہ ''مضمرات'' سے ماخوذ ہے۔

ان کے علاوہ دوسرے فقہاے متاخرین نے بھی ''مضمرات'' کے حوالے سے ابتداے اقامت کے وقت کھڑے ہونے کو مکروہ لکھا ہے، اور صاحب مضمرات یوسف

([1]) الفتاوی الھندیۃ، کتاب الصلاۃ، الفصل الثانی فی کلمات الاذان والاقامۃ (۱/۵۷)

([2]) ردالمحتار مع الدر المختار، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (۳/۲۴۰)

بن عمر صوفی کی وفات ۸۳۲ھ میں ہوئی ہے۔[1] اس سے واضح ہوا کہ کراہت کا یہ قول

([1]) صاحب مضمرات اور صاحب فتاوی صوفیہ کی تاریخ وفات کی تحقیق

صاحب مضمرات کی تاریخ وفات کی تحقیق

صاحب مضمرات حضرت علامہ یوسف بن عمر بن یوسف صوفی الکادوری شریعت وطریقت کے جامع تھے۔ آپ کی کتاب ''جامع المضمرات والمشکلات'' فقہ حنفی میں فروعی مسائل پر ایک بہترین کتاب ہے جو مختصر القدوری کی شرح ہے۔ (الفوائد البہیۃ، امام لکھنوی، ص:۲۳۰)

آپ امام، فقیہ، اصولی اور مقتدر اور ہنمائے راہ طریقت صاحب فتاوی صوفیہ فضل اللہ محمد بن ایوب ماجوی کے استاذ تھے۔ صاحب فتاوی صوفیہ نے علم شریعت آپ سے حاصل کیا جب کہ علم طریقت شیخ رکن الدین بن شیخ صدر الدین بن شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی سے حاصل کیا۔ صاحب فتاوی صوفیہ نے اپنی کتاب ''الفتاوی الصوفیۃ فی طریق البھائیۃ'' میں جابجا آپ کی مشہور زمانہ کتاب ''جامع المضمرات'' کا حوالہ پیش کیا ہے۔

امام لکھنوی کے مطابق اور فتاوی صوفیہ کے مطالعے سے اتنا پتا چلتا ہے کہ آپ حضرت فضل اللہ ماجوی کے استاذ تھے کیوں کہ انھوں نے بار بار اپنی کتاب ''فتاوی صوفیہ'' میں آپ کے استاذ ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن ان کے علاوہ آپ کے دیگر شاگردوں اور استاذوں کا کسی کتاب میں ذکر نہیں ملتا، سب نے صرف نام، ولدیت، جامع المضمرات کا انتساب اور آپ کی تاریخ وفات بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ عام تذکرہ نگاروں نے اپنی کتابوں میں آپ کی تاریخ وفات ۸۳۲ھ لکھی ہے، یہ باعث تشویش ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آپ کے شاگرد شیخ فضل اللہ محمد بن ایوب ماجوی کی کتاب ''فتاویٰ صوفیہ'' جو ۷۵۷ھ سے پہلے کی تصنیف ہے، اس میں آپ کی کتاب ''جامع المضمرات'' کا حوالہ بکثرت موجود ہے۔ اسی طرح فتاوی تاتار خانیہ جو ۷۸۶ھ سے پہلے کی تصنیف ہے، اس میں بھی آپ کی کتاب کا حوالہ موجود ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی تاریخ وفات ۸۳۲ھ نہیں ہوگی، کیوں کہ اس سے لازم یہ آئے گا کہ آپ کی کتاب ''جامع المضمرات'' آپ کی وفات سے ۷۵/ سال پہلے بلاد و امصار میں پھیل گئی تھی اور ایسا ہونا بظاہر بعید معلوم ہوتا ہے، اس لیے قرین قیاس یہ ہے کہ آپ کی وفات ۷۳۲ھ رہی ہوگی جو کسی کے تسامح سے ۸۳۲ھ ہوگئی۔ واللہ اعلم۔

صاحب فتاوی صوفیہ کی تاریخ وفات کی تحقیق

صاحب فتاوی صوفیہ شیخ فضل اللہ محمد بن ایوب ماجوی قدس سرہ بیک وقت صاحب خرقہ صوفی بھی تھے اور اپنے وقت کے عظیم فقیہ بھی۔ آپ کے بارے میں ہندوستان کے ممتاز محدث و فقیہ علامہ عبد الحی فرنگی محلی (۱۳۰۴ھ) نے '' إماماً فقیهاً أصولیاً سید أرباب الحقیقة و أسوة أرباب

الطریقة" کے الفاظ لکھے ہیں۔ علامہ فرنگی محلی نے آپ کو صاحب مضمرات علامہ یوسف بن عمر صوفی کا شاگرد اور شیخ رکن الدین ملتانی (۷۳۵ھ) کا مرید بتایا ہے۔

آپ کی کتاب فتاوی صوفیہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے جو عرفان و تصوف اور فقہ و فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ ہندوستان کے ممتاز صوفی فقیہ شیخ سعد الدین خیر آبادی (۹۲۲ھ) کی کتاب مجمع السلوک میں اس کے حوالے کثرت سے موجود ہیں۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ معروف حنفی فقیہ صاحب در مختار علامہ علاء الدین حصکفی (۱۰۸۸ھ) نے اس کی تلخیص مختصر الفتاویٰ الصوفیہ کے نام سے تیار کی ہے۔ لیکن مقام افسوس یہ ہے کہ آپ کی اتنی عظیم شخصیت ہونے کے باوجود کتب تاریخ میں آپ کا تذکرہ تفصیل سے نہیں ملتا۔ آپ کے استاذ ہی کی طرح آپ کی بھی تاریخ وفات واضح نہیں ہے۔

ایضاح المکنون، معجم المؤلفین، ھدیۃ العارفین میں آپ کی تاریخ وفات ۷۳۵ ہجری درج ہے جب کہ الاعلام للزرکلی اور کشف الظنون میں ۶۶۶ ہجری مذکور ہے۔ بعض محققین نے ۶۶۶ھ کو صحیح قرار دے کر ۷۳۵ھ کو غلط ثابت کیا ہے حالانکہ آپ کی دونوں تاریخ وفات ۶۶۶ھ اور ۷۳۵ھ کئی وجوہ سے محل نظر ہے:

۱۔ فتاوی صوفیہ میں خود آپ کا بیان ہے کہ شیخ رکن الدین ابوالفتح قدس سرہ نے آپ کو ماہ رجب بروز جمعہ بوقت اشراق ۷۱۶ھ میں خرقہ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ (الفتاوی الصوفیۃ فی طریق البھائیۃ، الباب الثانی، فی بیان نسبۃ الخرقۃ)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ۷۱۶ھ تک بہ قید حیات تھے لہٰذا ۶۶۶ھ آپ کی وفات نہیں ہو سکتی۔

۲۔ اسی کتاب میں آپ نے خود لکھا ہے کہ آپ اپنے شیخ حضرت رکن الدین ابوالفتح قدس سرہ کے ہمراہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ میں شریک تھے اور آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت خواجہ قدس سرہ کی وفات ۱۸ / ربیع الآخر بروز بدھ ۷۲۵ھ میں ہوئی۔ (الفتاوی الصوفیۃ فی طریق البھائیۃ، الباب الستون، فی التلقین عند الموت وبعد الدفن) اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ۷۲۵ھ تک زندہ تھے۔

۳۔ آپ کی تاریخ وفات ۷۳۵ھ بھی نہیں ہو سکتی کیوں کہ فتاویٰ صوفیہ میں آپ لکھتے ہیں: [قال الجامع: قد وقع لي المسافرة إلى حضرة دهلي حرسها الله مع نواحيها وأدركت الإمام العالم كمال الدين السامانی هذا وسألته عن هذه المسألة مشافهة، فقال رأيت بعيني في نسخة الهداية الموثوقة للإمام شرف الدين القوشجي لفظ وبركاته في هذا السلام. وكان هذا المعنى في محضر من العلماء في دهليز بيته يوم الثلثاء وقت الضحى في العاشر من ربيع الأول سنة سبع وخمسين وسبع مائة، وكان معي كتابي هذا يعني الفتاوى الصوفية وأخذه بيده فقال: بسيار زحمت ديده.]

نویں صدی ہجری سے متعلق ہے، اس سے پہلے شروع اقامت میں کھڑے ہونے کے سلسلے میں کراہت کا قول نہیں ملتا، لیکن خود صاحب مضمرات کو اس مسئلے کے استنباط میں تسامح ہوا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب مضمرات نے اس مسئلے کو جس دلیل سے مستنبط کیا ہے، اس دلیل سے یہ مسئلہ ثابت نہیں ہوتا، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

فإذا دخل الرجل عند الإقامة يكره له الانتظار والقيام ولكن يقعد ثم يقوم إذا بلغ المؤذن قوله حي على الفلاح هكذا جاء الأثر عن علي[1]

جب نمازی اقامت کے وقت مسجد میں داخل ہو تو اس کے لیے کھڑا ہو کر انتظار کرنا مکروہ ہے، وہ بیٹھ جائے، پھر اس وقت کھڑا ہو جب مکبر حی علی الصلاۃ پر پہنچے، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی "اثر" میں ہے۔

اس اثر کو امام ابن ابی شیبہ نے "مصنف" میں ذکر کیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

یعنی مجھے دہلی شریف جانے کا اتفاق ہوا۔ اللہ تعالیٰ اسے اور اس کے اطراف کو محفوظ رکھے۔ تو میں نے امام علامہ کمال الدین سامانی سے ملا اور ان سے براہ راست یہ مسئلہ دریافت کیا کہ جس سلام کے ذریعے نماز سے نکلتے ہیں اس میں لفظ "وبرکاتہ" کا اضافہ کر سکتے ہیں کہ نہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے امام شرف الدین قوشجی کی توثیق شدہ ہدایہ کے نسخے میں اپنی آنکھوں سے اِس سلام میں لفظ "وبرکاتہ" دیکھا ہے۔ آپ نے یہ مسئلہ اپنے آستانے پر علما کی موجودگی میں منگل کے دن چاشت کے وقت ۱۰/ ربیع الاول ۷۵۷ھ کو بیان فرمایا۔ میرے ہاتھ میں یہ کتاب یعنی فتاوی صوفیہ تھی، آپ نے اسے اپنے دست مبارک میں لیا اور فرمایا: تم نے بہت زحمت اٹھائی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی وفات اس کے بعد ہوئی ہوگی، لہٰذا جن تذکرہ نگاروں نے آپ کی تاریخ وفات ۷۳۵ھ لکھی ہے، وہ بھی درست نہیں ہے۔

ابھی اوپر مذکور ہوا کہ بعض تذکرہ نگاروں نے آپ کی تاریخ وفات ۶۶۶ھ لکھی ہے، اگر ۶/ کے عدد کو تسامح مان لیا جائے اور اسے ۷/ تسلیم کر لیا جائے تو آپ کی تاریخ وفات ۷۶۶ھ ہو سکتی ہے۔ اور یہ تاریخ وفات ہر لحاظ سے درست ہو جائے گی۔ البتہ ان شواہد سے دو باتیں قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہیں ایک یہ کہ تذکرہ نگاروں کی پیش کردہ دونوں تاریخیں غلط ہیں اور دوسری یہ کہ آپ کی وفات ۷۵۷ھ کے بعد ہوئی ہے۔ واللہ اعلم

([1])[جامع المضمرات والمشكلات، كتاب الصلاة، ۱/۳۰۱، دار الكتب العلمية]

خَرَجَ عَلِيٌّ، وَقَدْ أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ وَهُمْ قِيَامٌ يَنْتَظِرُونَهُ، فَقَالَ: مَا لِي أَرَاكُمْ سَامِدِينَ؟[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز کے لیے نکلے، اس وقت اقامت ہو چکی تھی اور لوگ کھڑے آپ کا انتظار کر رہے تھے، آپ نے انہیں دیکھ کر فرمایا: میں تمہیں حیران و پریشان کھڑے کیوں دیکھ رہا ہوں؟

آپ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ تمہیں کھڑے ہو کر میرا انتظار نہیں کرنا چاہیے تھا، کیوں کہ امام کی عدم موجودگی میں امام کا کھڑے ہو کر انتظار کرنا مشقت میں پڑنا ہے، اسی لیے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے کہ: لاَ تَقُومُوا حَتَّى تَرَوْنِي[2] یعنی اس وقت تک مت کھڑے ہو جب تک مجھے نہ دیکھ لو۔ اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ امام اگر موجود نہ ہو تو امام کے انتظار میں کھڑا نہ ہونا چاہیے، اسی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے اصحاب کو منع فرمایا تھا کہ اگر میں موجود نہ رہوں تو میرے انتظار میں کھڑے نہ رہا کرو۔ لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول سے معلوم ہوا کہ کراہت کا قول اس صورت میں ہے، جب امام مسجد میں نہ ہو، ورنہ کھڑا ہونا مکروہ نہیں ہے، جیسا کہ جامع فقہ حنفی امام محمد رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "المبسوط" میں لکھا ہے، آپ فرماتے ہیں:

وأما إذا لم يكن الإمام معهم في المسجد فإنني أكره لهم أن يقوموا في الصف والإمام غائب عنهم[3] جب امام مسجد میں موجود نہ ہو بلکہ مسجد سے باہر ہو تو میں صف میں کھڑے ہونے کو مکروہ سمجھتا ہوں۔

چنانچہ شارح فقہ حنفی امام الائمہ علامہ شمس الدین محمد بن احمد سرخسی (۴۸۳ھ) نے اس مسئلہ کی دلیل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے "اثر" کو ذکر کیا ہے، آپ لکھتے ہیں:

إِذَا لَمْ يَكُنْ الْإِمَامُ مَعَهُمْ فِي الْمَسْجِدِ يُكْرَهُ لَهُمْ أَنْ يَقُومُوا فِي

([1]) مصنف ابن ابی شیبۃ، کتاب الصلوات، باب..... اذا اقیمت الصلاۃ قبل ان یجیء الامام (ح: ۴۰۹۴)
([2]) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب: متی یقوم الناس، اذا رأوا الامام عند الاقامۃ (ح: ۶۳۷)
([3]) المبسوط، کتاب الصلاۃ، باب افتتاح الصلاۃ (۱۹/۱)

الصَّفِّ حَتَّى يَدْخُلَ الْإِمَامُ لِقَوْلِهِ - عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ -: لَا تَقُومُوا فِي الصَّفِّ حَتَّى تَرَوْنِي خَرَجْتُ، وَإِنَّ عَلِيًّا - رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ - دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَرَأَى النَّاسَ قِيَامًا يَنْتَظِرُونَهُ فَقَالَ مَالِي أَرَاكُمْ سَامِدِينَ أَيْ وَاقِفِينَ مُتَحَيِّرِينَ[1]

جب امام مقتدیوں کے ساتھ مسجد میں موجود نہ ہو، تو ان کے لیے صف میں کھڑا ہونا مکروہ ہے، جب تک کہ امام نہ آجائے، کیوں کہ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: اس وقت تک نہ کھڑے ہو جب تک مجھے نہ دیکھ لو کہ میں نماز کے لیے نکل چکا ہوں۔ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ لوگ کھڑے آپ کا انتظار کر رہے ہیں، تو آپ نے فرمایا: کیا بات ہے کہ میں تمہیں حیران و پریشان کھڑا دیکھ رہا ہوں؟

اس تشریح سے واضح ہو گیا کہ کھڑے ہونے کی ممانعت صرف اس صورت میں ہے جب امام مسجد میں موجود نہ ہو، لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے "اثر" سے عند الاقامۃ کھڑے ہونے کو مکروہ ثابت کرنا صاحب مضمرات کا تسامح ہے اور وہ بھی ایسا تسامح جو جامع فقہ حنفی امام محمد اور شارح فقہ حنفی امام سرخسی کی تشریح کے خلاف ہے، امام سرخسی کا مذکورہ حوالہ ان کی شہرۂ آفاق کتاب المبسوط سے ماخوذ ہے اور اہل نظر سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ مبسوط فقہ حنفی کی کتب ظاہر الروایہ (مبسوط، زیادات، سیر کبیر، سیر صغیر، جامع کبیر، جامع صغیر) کی جامع کتاب ہے، کتب ظاہر الروایہ کی اس جامع کتاب کے بالمقابل نویں صدی ہجری کے ایک حنفی صوفی فقیہ کی تشریح کو پیش کرنا اصولی اعتبار سے کیا ہے؟ یہ بتانے کی حاجت نہیں، جب کہ مبسوط کے بالمقابل اگر امام محمد کی کتب نادر الروایہ کا کوئی حوالہ بھی آتا ہے تو حنفی اصول فتوی کے مطابق اسے بھی رد کر دیا جاتا ہے۔ افسوس کہ صاحب مضمرات کی متابعت میں یہ تسامح

([1]) المبسوط، کتاب الصلاۃ، باب افتتاح الصلاۃ (۱/۳۵)

متاخرین فقہا میں بھی در آیا اور آج بعض حضرات اسے ہی اصل فقہ حنفی سمجھتے ہیں ۔

فقہا سے بعض مسائل میں اس طرح کا تسامح در تسامح واقع ہونا کوئی مستبعد بات بھی نہیں ہے جیسا کہ علامہ ابن عابدین شامی ''عقود رسم المفتی'' میں لکھتے ہیں:

و قد يتفق نقل قول فی نحو عشرين كتابا من كتب المتأخرين؛ و يكون القول خطا، أخطأ به أول واضع له، فياتی من بعده، وينقله عنه ، وهكذا ينقل بعضهم عن بعض، كما وقع ذلک فی بعض مسائل -[1]

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات متاخرین فقہا کی بیسیوں کتابوں میں نقل ہوتی ہے، حالانکہ وہ بات غلط ہوتی ہے، جو پہلے والے سے ہوئی ہوتی ہے لیکن بعد والے اس کو نقل در نقل کرتے رہتے ہیں جیسا کہ بعض مسائل میں ایسا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر علامہ ابن عابدین شامی نے ''مسئلہ استئجار'' کو پیش کیا ہے، آپ نے لکھا ہے کہ صاحب سراج اور صاحب جوھرۃ نے ''محض تلاوتِ قرآن کی اجرت لینے'' کو مفتی بہ قول قرار دیا، اب اس کے بعد اکثر فقہا نے اپنی اپنی کتابوں میں اسی کو نقل کرنے لگے، اور اس سے مسئلہ کا استنباط بھی کرنے لگے، یہاں تک کہ فقہا نے مسئلہ استئجار سے یہ بھی مستنبط کر لیا کہ ''طاعات پر اجرت لینا'' جائز ہے، حالانکہ صاحب سراج اور صاحب جوھرۃ سے خطا واقع ہوئی تھی، مفتی بہ قول یہ تھا کہ ''تعلیم قرآن کی اجرت لینا'' جائز ہے، نہ کہ محض تلاوت قرآن کی اجرت لینا۔[2]

اقامت امام کا حق ہے:

یہاں ایک بات کی وضاحت نہایت ضروری ہے وہ یہ کہ بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ اقامت کہنا مکبر کا حق ہے وہ جب چاہے اقامت کہہ سکتا ہے، جب کہ ایسا نہیں ہے بلکہ اقامت کا حق امام کا ہے، جب امام کی اجازت ہوگی خواہ

([1]) شرح عقود رسم المفتی، ص: ۶۲، مکتبۃ زکریا دیوبند
([2]) شرح عقود رسم المفتی، ص: ۶۴، مکتبۃ زکریا دیوبند

قولاً اجازت ہو یا اشارۃً اس وقت مکبر اقامت کہہ سکتا ہے ،جس طرح مؤذن کو اذان دینے کا حق حاصل ہے کہ جب نماز کا وقت ہوجائے وہ اذان دے سکتا ہے ،اُس طرح مکبر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ جب چاہے اقامت کہہ دے تاآں کہ امام سے اقامت کہنے کی اجازت نہ مل جائے۔

جیساکہ ابن حجر نے ''بلوغ المرام من أدلة الأحكام ''میں اور ابن عدی نے ''الکامل فی الضعفاء'' میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعا روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

" الْمُؤَذِّنُ أَمْلَكُ بِالْأَذَانِ، وَالْإِمَامُ أَمْلَكُ بِالْإِقَامَةِ"[1]

یعنی مؤذن اذان کے اور امام اقامت کے زیادہ حق دار ہیں۔

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو شریک نے اعمش سے روایت کیا ہے اور وہ ابوصالح سے روایت کرتے ہیں اور ابوصالح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعا روایت کرتے ہیں، لیکن یہ حدیث محفوظ نہیں ہے۔[2]

راجح یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً محفوظ ہے، چنانچہ ترمذی، مصنف ابن ابی شیبہ ، مصنف عبد الرزاق اور کتاب الصلاۃ میں یہ حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً ہی مروی ہے۔[3]

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اقامت کا حق امام کو ہے کہ وہ جب چاہے نماز کے لیے آئے اور جب چاہے نماز قائم کرے، اس کے لیے کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں ہے اور نہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ مسجد میں آکر پہلے سے بیٹھ جاے، پھر تکبیر

([1]) بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام (ص:۱۱۲) الکامل فی الضعفاء (۱۲/۴)

([2]) بیہقی/السنن الکبری، کتاب الصلاۃ، باب لایقیم المؤذن حتی یخرج الامام ح:۲۲۷۹)

([3]) سنن الترمذی، ابواب الصلاۃ، باب ماجاء ان الامام احق بالاقامۃ ح:۲۰۲) مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الصلوات، باب الامام ینتظر بالصلاۃ، ح :۴۱۷۱) مصنف عبد الرزاق، کتاب الصلاۃ، باب المؤذن املک بالاذان ح:۱۸۳۶ (کتاب الصلاۃ لابی نعیم، باب المؤذن املک بالاذان ح:۲۸۸)

کہنے کا حکم دے اور نہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اگر پہلے سے مسجد میں بیٹھا ہو تو تکبیر کہنے کا حکم دینے کے بعد حی علی الصلاۃ یا حی علی الفلاح تک بیٹھے انتظار کرتا رہے، بلکہ مقتدیوں کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ امام کی پیروی کریں کہ اگر امام بیٹھا ہو تو وہ بھی بیٹھیں اگر امام کھڑا ہو تو وہ بھی کھڑے ہوجائیں، بالخصوص نبی ﷺ کے لیے تو کسی طرح کی کوئی پابندی تھی ہی نہیں، یہی وجہ ہے ایک مرتبہ آپ ﷺ نے آدھی رات تک نماز کو مؤخر فرمادیا اور صحابہ کرام آپ ﷺ کا انتظار فرماتے رہے، صحیح بخاری کی حدیث ہے:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: أَخَّرَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّلاَةَ ذَاتَ لَيْلَةٍ إِلَى شَطْرِ اللَّيْلِ، ثُمَّ خَرَجَ عَلَيْنَا، فَلَمَّا صَلَّى أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهِ، فَقَالَ: إِنَّ النَّاسَ قَدْ صَلَّوْا وَرَقَدُوا، وَإِنَّكُمْ لَنْ تَزَالُوا فِي صَلاَةٍ مَا انْتَظَرْتُمُ الصَّلاَةَ[1]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ آدھی رات تک نماز مؤخر کردی، پھر ہمارے پاس تشریف لائے اور جب نماز سے فارغ ہوگئے تو ہماری جانب متوجہ ہوکر ارشاد فرمایا: لوگ نماز ادا کرکے سوگئے اور جب تک تم لوگ انتظار کررہے تھے نماز ہی میں تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب تک حضور ﷺ باہر تشریف نہ لے آتے، اس وقت تک اقامت نہیں کہی جاتی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کے لیے کوئی پابندی نہیں تھی، آپ جب چاہتے نماز کے لیے باہر تشریف لاتے۔

یہیں سے امام کا حکم بھی مستنبط ہوا کہ امام کی اجازت کے بغیر اقامت نہیں کہی جاسکتی، اور نہ امام پر نماز کے عینِ وقت پر آنا ہی لازم ہے۔ ہاں امام کا یہ اخلاقی فرض

([1]) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب یستقبل الامام الناس اذا سلم، ح: ۸۴۷)

ہے کہ وہ جماعت کا وقت ہوتے ہی نماز کے لیے آجائے تاکہ مقتدیوں کو مشقت کا سامنانہ ہو، لیکن آج ہمارے معاشرہ میں ہوتا یہ ہے کہ امام اگر ایک دو منٹ بھی لیٹ کردے تو عوام بھڑک اٹھتے ہیں اور کبھی کبھی امام کے ساتھ بد سلوکی بھی کر جاتے ہیں، یہ نہایت افسوس ناک پہلو ہے، جب کہ مقتدیوں کو چاہیے کہ امام کا انتظار کریں کیوں کہ جب تک وہ امام کا انتظار کرتے رہیں گے ان کو نماز کا ثواب ملتا رہے گا۔

فتاوی رضویہ میں ہے: "وقت کراہت تک انتظار امام میں ہرگز تاخیر نہ کریں، ہاں وقت مستحب تک انتظار باعث زیادت اجر و تحصیل افضلیت ہے، پھر اگر وقت طویل ہے اور آخر وقت مستحب تک تاخیر حاضرین پر شاق نہ ہوگی کہ سب اس پر راضی ہیں تو جہاں تک تاخیر ہو اتنا ہی ثواب ہے کہ سارا وقت ان کا نماز ہی میں لکھا جائے گا الخ"[1]

بعض جگہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عینِ وقتِ جماعت امام باہر سے آکر پہلے مصلی پر بیٹھ جاتا ہے پھر اس کے بعد تکبیر ہوتی ہے اور حی علی الصلاۃ یا حی علی الفلاح پر امام و مقتدی سب کھڑے ہوتے ہیں، یہ احادیث کریمہ بلکہ فقہا کے بھی خلاف ہے، ایسا طریقہ نہ حدیث سے ثابت ہے اور نہ حضور ﷺ نے کبھی ایسا کیا ہے اور نہ ہی کسی فقیہ سے اس طرح کا قول منقول ہے۔ فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خان نے بھی اس کو اپنے فتاوی میں لکھا ہے:

آپ سے سوال ہوا کہ "کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسجد کے حجرہ میں امام ہو اور تکبیر مکبر شروع کردے اب امام حجرہ سے روانہ ہو، ختم تکبیر سے پہلے حی علی الفلاح کے وقت یا بعد ختم تکبیر مصلے پر پہنچ جاوے، اس میں کوئی قباحت تو نہیں ہے بصورت احیاناً یا بصورت دواماً، ہر دو صورت کا کیا حکم ہے؟

اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

([1])فتاوی رضویہ (۲۰۵/۸)

اس صورت میں کوئی حرج نہیں، نہ امام مکبر کا پابند ہو سکتا ہے بلکہ مکبر کو امام کی پابندی چاہیے، حدیث میں ہے: المؤذن أملک بالأذان، والإمام أملک بالإقامة (اذان کا اختیار مؤذن کو ہے اور اقامت کا اختیار امام کو) اور اگر وہ تکبیر ہوتے میں چلا تو اسے بیٹھنے کی بھی حاجت نہیں، مصلے پر جائے اور حی علی الفلاح یا ختم تکبیر پر تکبیر تحریمہ کہے، یونہی بعد خطبہ اسے اختیار ہے کہیں منقول نہیں کہ خطبہ فرما کر تکبیر ہونے تک جلوس فرماتے، یہ حکم قوم کے لیے، واللہ اعلم [1]

فاضل بریلوی کے اس فتوی سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ خطبہ جمعہ کے بعد امام کے لیے بیٹھنا ثابت نہیں بلکہ امام منبر سے اترنے کے بعد حی علی الصلاۃ یا حی علی الفلاح کا انتظار کیے بغیر شروع اقامت ہی میں کھڑا ہو جائے، لہٰذا جب جمعہ کی نماز کے لیے بیٹھنا ثابت نہیں ہے حالانکہ یہی ایک موقع ہے جہاں امام بیٹھ سکتا تھا تو دیگر نماز کے لیے بیٹھنا کہاں سے ثابت ہو گا اور دیگر نمازوں میں حی علی الصلاۃ یا حی علی الفلاح کا انتظار کرنے میں کون سی حکمت ہے؟

واضح رہے کہ جب خطبہ جمعہ کے بعد امام کا بیٹھنا ثابت نہیں بلکہ اسے سیدھے مصلے پر کھڑا ہو جانا ہے تو اس صورت میں کم از کم جمعہ کی حد تک تو عام مقتدیوں کو اول اقامت میں کھڑا ہونا ہی چاہیے، اس لیے کہ یہ کسی کا مذہب نہیں کہ امام کھڑا ہو اور مقتدی بیٹھے رہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ کبھی بھی رسول اللہ ﷺ سے حی علی الصلاۃ یا حی علی الفلاح تک بیٹھے رہنے کا ثبوت نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی حکمت معلوم ہوتی ہے، لہٰذا امام جب چاہے کھڑا ہو اور مقتدی امام کی پیروی کریں۔ یہ بلا کراہت اور بلا نکیر جائز ہے، البتہ فقہ حنفی کے مطابق مستحب یہ ہے کہ امام و مقتدی سب حی علی الصلاۃ یا حی علی الفلاح پر کھڑے ہوں، اور امام طحطاوی کی تشریح کے مطابق شروع اقامت میں بھی

([1]) فتاوی رضویہ (۵/۴۱۹)

کھڑے ہونے میں کوئی حرج نہیں۔

مذکورہ بالادلائل کی روشنی میں روز روشن کی طرح یہ مسئلہ ثابت ہوگیا کہ شروع اقامت میں بھی امام اور مقتدیوں کا ایک ساتھ کھڑا ہونااحایث اور تشریحات فقہا کے خلاف نہیں ہے۔

مخالفت یا عزیمت؟

بعض لوگ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے والوں پر احناف کی مخالفت کا حکم لگاتے ہیں، جب کہ معاملہ ایسانہیں ہے، یہ لوگ احناف کی مخالفت نہیں کرتے، زیادہ سے زیادہ پہلے سے امام اگر موجود رہے اور سب اگر شروع میں کھڑے ہوجاتے ہیں تو بظاہر فقہ حنفی کی رو سے استحباب کا ترک ہورہا ہے، بلکہ حنفی فقیہ امام طحطاوی نے ائمہ احناف کے اقوال کی ایسی شرح فرمائی کہ اس کے بعد ترک استحباب بھی نہیں ہوتا، چہ جائے کہ مخالفت ہو، مخالفت حنفیہ کی بات کرنا کسی بھی طرح سے عقل رکھنے والوں کے لیے روانہیں، اس کے ساتھ اس مسئلہ میں ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ مشائخ کے یہاں ایک عام اصول ہے کہ جہاں رخصت اور عزیمت دونوں پہلوؤں پر عمل کی اجازت ہووہاں وہ عزیمت پر عمل کرتے ہیں، اسی طرح اس مسئلہ میں ایک طرف جلیل القدر تابعین عظام ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کے وجوب کے قائل ہیں جیساکہ امام ابن المنذر، امام عسقلانی اور علامہ بدرالدین عینی نے لکھا ہے کہ حضرت سعید بن مسیب اور عمر بن عبد العزیز فرماتے ہیں کہ ابتدائے اقامت میں کھڑا ہونا واجب ہے ، اگرچہ یہاں لفظ ''واجب'' واجب اصطلاحی کے معنی میں نہیں ہے، پھر بھی لفظ واجب سے تاکیدی حکم ضرور نکل رہاہے اور دوسری طرف حی علی الفلاح پر قیام کا حکم لفظ 'ینبغی' سے دیا جارہا ہے، جو بہر حال لفظ واجب سے حکم میں نیچے کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ جمہور علماے اسلام یہ بھی کہتے ہیں کہ اقامت کے وقت مقتدی کب کھڑے

ہوں؟ اس کا کوئی ذکر حدیث میں نہیں ہے، صرف امام کی عدم موجودگی میں کھڑے ہونے کی ممانعت ہے، لہٰذا اگر امام مسجد میں موجود ہو تو بھی أُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ (المومنون:٦١) (اہل ایمان بھلائی کی طرف لپکنے والے اور سبقت کرنے والے ہوتے ہیں۔) کی وجہ سے شروع اقامت میں ہی کھڑا ہونا زیادہ مناسب ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ یہ فرماتے تھے: إذا سمعت النداء بالإقامة فكن أول من أجاب (جب تم اقامت کی ندا سنو تو سب سے پہلے اس کی بجاآوری کرنے والا بنو۔) اور حنفیہ سے جو یہ منقول ہے کہ حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا مستحب ہے، اسے بقول امام طحطاوی استحباب کی آخری حد پر محمول سمجھا جائے نہ کہ ابتدا پر، یعنی اس سے بھی زیادہ تاخیر کرنا نماز کے لیے کھڑے ہونے میں موجود استحباب کو کھو دینا ہے۔ آج پوری دنیا کے اہل سنت بشمول احناف کا عمل اسی پر ہے۔

ہندوستانی اہل تصوف واہل سنت کے جو مراکز اعلی حضرت فاضل بریلوی کے فتاوے سے بہت زیادہ اثر پذیر نہیں ہوئے، ان کے یہاں بھی یہی قدیم توارث قائم ہے۔ اس لیے ان کے اس عمل کو ترکِ استحباب اور اس سے بڑھ کر مخالفتِ احناف یا مخالفتِ اہل سنت پر محمول کرنے کی بجائے اسے عزیمت، مسارعت الی الصلاۃ، مسابقت الی الخیر، پوری دنیا کے اہل سنت اور احناف کی موافقت اور قدیم اہل سنت و اہل تصوف کے طریقِ عزیمت کے اتباع پر محمول کرنا چاہیے۔

ہندوستان کی خانقاہوں اور علمی مراکز کا توارث

ہندوستان میں واقع علمی مراکز اور اکثر خانقاہیں ایسی تھیں جہاں ہمیشہ سے یہ توارث تھا کہ وہاں کے سجادگان اقامت کی ابتدا میں کھڑے ہوتے تھے اور اذانِ ثانی اندرون مسجد دیتے تھے لیکن جس طرح خانقاہوں کے جانشیں و متولی علم سے نابلد اور عمل سے دور ہوتے گئے اسی قدر وہ لوگ اپنے آبا واجداد کے علمی، عملی اور اعتقادی ورثہ سے ہاتھ دھوتے چلے گئے۔

اس کے باوجود بعض خانقاہیں ایسی ہیں جو اپنے توارث کو باقی رکھے ہوئی ہیں، اور اس کے احیا کے لیے سعی پیہم کر رہی ہیں، ہم ذیل میں ان ہی میں سے چند خانقاہوں کا ذکر کرتے ہیں جہاں آج بھی قدیم توارث کے اتباع میں امام و مقتدی ابتدائے اقامت میں کھڑے ہوتے ہیں اور اذانِ ثانی اندرون مسجد دیتے ہیں:

خانقاہ چشتیہ نظامیہ، دہلی:

اس خانقاہ کے مورث اعلی محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا (۷۲۵ھ) ہیں جن کے فیوض و برکات سے خاندان چشت ہندو پاک میں پھلا اور پھولا۔

اس خانقاہ کے توارث کے سلسلے میں حضرت سید فرید احمد نظامی (درگاہ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا، دہلی) سے بات ہوئی، تو انہوں نے فرمایا کہ اس خانقاہ کا توارث تھا کہ لوگ شروع اقامت میں کھڑے ہوتے تھے اور آج بھی یہ توارث قائم ودائم ہے۔ البتہ اب کچھ سالوں سے اس میں تبدیلی دیکھنے کو مل رہی ہے۔ کچھ لوگ بیٹھے

رہتے ہیں اور کچھ لوگ کھڑے ہوں تو بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں کا قدیم طریقہ شروع اقامت میں ہی امام ومقتدی کا کھڑا ہونا متوارث ہے۔ اور جہاں تک اذان ثانی کی بات ہے تو یہ پہلے اندر ہی ہوتی تھی اور آج بھی اندر ہی ہوتی ہے۔

خانقاہ شیخ سعد خیر آبادی، خیر آباد:

اس خانقاہ کے بانی جامع شریعت وطریقت شیخ سعد الدین خیر آبادی (۹۲۲ھ) ہیں، آپ کے یہاں بھی اب تک یہی معمول ہے کہ لوگ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہوتے ہیں اور اذان ثانی داخل مسجد ہوتی ہے۔

خانقاہ عالیہ صفویہ، صفی پور:

صفی پور ضلع اناؤ کا قدیم قصبہ ہے، جو اناؤ سے ۲۷/کیلو میٹر جانب مغرب میں واقع ہے اور اناؤ شمالی ہند کے کثیر آبادی والا صوبہ اتر پردیش کے دارالحکومت لکھنؤ سے جانب جنوب میں ۶۴/کیلو میٹر کی دوری پر واقع ہے اس قصبہ کا پرانا نام ''سائی پور'' تھا۔

ساتویں صدی ہجری میں ایک کامل صوفی حضرت شاہ اکرم عثمانی سہروردی رحمۃ اللہ علیہ (۶۷۵ھ) یہاں تشریف لائے، آپ کے ذریعہ اس خطہ میں اسلام کی تبلیغ ہوئی۔ آپ کی چوتھی پشت میں حضرت شیخ عبد الصمد عرف مخدوم شاہ صفی قدس اللہ سرہ (۹۴۵ھ) پیدا ہوئے، بعد میں یہ قصبہ آپ کے نام نامی سے موسوم ہوا۔

اس خانقاہ کا عمل بھی یہ تھا کہ یہا ں کے سجادگان اور متولیان ابتدائے اقامت میں کھڑے ہوتے تھے۔

اس سلسلے میں حضرت افضال میاں قبلہ (خانقاہ صفویہ، صفی پور شریف) سے میری بات ہوئی، تو انہوں نے فرمایا کہ ۱۹۸۳ء سے لوگ اقامت کے وقت بیٹھنے لگے ہیں، ورنہ اس سے پہلے سب لوگ اقامت کے شروع ہی میں کھڑے ہوتے تھے۔ لیکن اذان ثانی آج بھی اندر ہی ہوتی ہے۔

خانقاہ ردولی شریف کا توارث

یہ خانقاہ صوبہ اتر پردیش، ضلع فیض آباد میں واقع ہے، اس کے بانی نویں صدی ہجری کی ایک عبقری شخصیت مخدوم الاولیا حضور شیخ العالم احمد عبد الحق ردولوی علیہ الرحمہ (وفات: ۸۳۷ھ) ہیں جو سلسلۂ صابریہ چشتیہ کے مجدد مانے جاتے ہیں- یہ خانقاہ اکابر اولیا اور اکابر علما کی عقیدت کا گہوارہ اور مرکز رہی ہے۔ اس خانقاہ کے موجودہ سجادہ نشین نیر ملت حضرت الحاج شاہ عمار احمد احمدی ہیں جو خانقاہ کی دینی و علمی سرگرمیاں عام کرنے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔ ان سے اس مسئلے پر بات ہوئی، تو آپ نے فرمایا کہ میری خانقاہ کا توارث ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اذان ثانی مسجد کے اندر ہوتی تھی اور لوگ اقامت کی ابتدا میں کھڑے ہوتے تھے، اور آج بھی اذان ثانی مسجد کے اندر منبر سے متّصل ہوتی ہے لیکن یہاں کے کچھ متشدد دین علما نے ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کا توارث بدل دیا، چونکہ یہ مسئلہ فرعیات سے ہے، اس لیے میں ان سے نہیں الجھتا لیکن مجھے مشائخ کے اس توارث کے بدل دیے جانے کا بہت قلق رہتا ہے۔

خانقاہ دائرہ شاہ ولایت الہ آباد

یہ خانقاہ شہر الہ آباد میں واقع ہے، اس کے بانی حضرت مولانا محمد ولایت حسین صاحب ہیں جو حضرت مولانا محمد حسین الہ آبادی قدس سرہ کے صاحبزادے، خلیفہ اور سجادہ نشین تھے۔ آپ کا اسم گرامی محمد ولایت حسین اور تاریخی نام حفظ الکریم تھا۔ آپ اپنے نام کے ساتھ کبھی عمری، کبھی محب الٰہی، کبھی فریدی اور کبھی چشتی صابری تحریر فرماتے تھے۔ آپ نے صدر انجمن رفاہ اسلام الہ آباد کی حیثیت سے خاص کر الہ آباد و دیگر مقامات کے مسلمانوں کی دینی و دنیاوی خدمت اور فلاح و بہبودی میں عمر صرف کر دی۔ تقریباً ۱۹۰۵ء میں یتیم خانہ اسلامی الہ آباد قائم کیا۔ آپ کے زیر سرپرستی مدرسہ

محمدیہ امدادیہ ۲۰ شوال ۱۳۴۳ھ سے جاری ہوا۔

آپ نے وعظ و پند، رشد وہدایت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھا، دور دراز اضلاع کے علما و فضلا اور عمائدین شہر بلا امتیاز مذہب وملت آپ کو مسلمانوں کا رہنما تسلیم کر کے احترام سے پیش آتے تھے۔ آپ کا انتقال ۱۶ جنوری ۱۹۳۸ء کو ہوا اور اپنی جائے سکونت میں دفن ہوئے آپ کا عرس ۱۲، ۱۳، ۱۴، ذیقعدہ کو سالانہ درگاہ میں ہوا کرتا ہے۔[1]

اس خانقاہ میں ہم اپنے احباب مفتی آفتاب رشک مصباحی، مولانا ذکی اور مولانا افضل حسین مصباحی کے ساتھ گئے اور یہاں کے ذمہ داران سے اذان ثانی کے داخل مسجد ہونے اور ابتدائے اقامت میں قیام کے سلسلے میں بات کی، انہوں نے بتایا کہ اس خانقاہ کا ہمیشہ سے یہ معمول رہا ہے کہ اذان ثانی داخل مسجد ہوتی اور ابتدائے اقامت ہی میں سب لوگ کھڑے ہوتے اور آج بھی یہی معمول ہے، کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

خانقاہ دائرہ شاہ محب اللہ الہ آباد

یہ خانقاہ شہر الہ آباد کی سب سے مشہور خانقاہ ہے۔ اس کے بانی حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی ہیں۔ آپ گیارھویں صدی ہجری اور عہد شاہجہانی کے مشہور عالم، مذہبی مفکر اور صاحب نسبت و حال بزرگ تھے۔ فلسفہ وحدت الوجود کے مؤید اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے پرزور حامی و ہم نوا تھے۔ آپ کی ولادت ۲ صفر ۹۹۶ھ کو ہوئی جب کہ وفات ۹ رجب ۱۰۵۷ھ کو ہوئی۔[2]

اس خانقاہ میں بھی اپنے احباب مفتی آفتاب رشک مصباحی، مولانا ذکی اور مولانا افضل حسین مصباحی کے ساتھ جانے کا شرف حاصل ہوا، اور اس کے ولی عہد مولانا شاہ مقرب اللہ عرف علی میاں چشتی صاحب سے داخل مسجد اذان ثانی اور قیام عند الاقامۃ کے حوالے سے گفتگو ہوئی، آپ نے فرمایا: ہماری خانقاہ کا قدیم معمول یہ

([1]) ماخوذ از تاریخ مشائخ الہ آباد، ص: ۸۸، مرتب: محمد نظام الدین، مطبع، سرسوتی آفسیٹ پریس، الہ آباد

([2]) ماخوذ از تاریخ مشائخ الہ آباد، ص: ۵۶، مرتب: محمد نظام الدین، مطبع، سرسوتی آفسیٹ پریس، الہ آباد

تھا کہ اذان ثانی داخل مسجد ہوتی تھی اور بوقت اقامت ابتدا میں کھڑے ہوتے تھے اور آج بھی یہی معمول ہے۔

خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ

خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ ملک کی معروف خانقاہوں میں سے ایک ہے، اس کے مورث اعلی صاحب سبع سنابل میر عبدالواحد بلگرامی ہیں جو مخدوم شاہ صفی صفی پوری کے مرید اور شاہ حسین سکندرآبادی کے خلیفہ تھے، اس طرح یہ خانقاہ بنیادی اعتبار سے چشتی خانقاہ ہے۔ اور جب حضرت شاہ برکت اللہ پیمی قدس سرہ حضرت شاہ فضل اللہ کالپوی کی تربیت میں آئے جس کے بعد اس خانقاہ پر قادریت کا غلبہ ہوگیا۔

ملک کے دو معروف علمی مراکز بدایوں اور بریلی کے پیر خانے کے طور پر بھی اس کی بڑی شہرت ہے۔

اذان ثانی کے مسئلے میں یہاں کا توارث بھی عندالمنبر ہی رہا ہے۔ بقول مولانا سید سبطین حیدر قادری برکاتی، آستانہ عالیہ برکاتیہ مارہرہ، حضرت آل رسول احمدی، ان کے بعد حضرت شاہ ابوالحسین نوری اور ان کے بعد حضرت شاہ مہدی میاں تک تو یہی عمل تھا، اس توارث سے عدول بعد میں ہوا ہے، اس لیے سید صاحب موصوف نے اب اپنی مسجد میں اپنے بزرگوں کی سنت کو زندہ بھی کر دیا ہے۔ جس پر انہیں فخر بھی ہے، البتہ اقامت کے وقت کھڑے ہونے کے سلسلے میں انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں حی علی الفلاح پر ہی کھڑے ہوتے ہیں، تاہم اس مسئلے پر ہمارے یہاں کوئی شدت نہیں ہے۔ ہم اس پر بھی تشدد نہیں کرتے جو آج کل رائج ہے، کہ اگر کوئی شروع اقامت میں کھڑا ہو جائے تو اسے پکڑ کر بٹھایا جاتا ہے یا اس پر وہابیت کی تہمت لگائی جاتی ہے، اس قسم کی شدت ہمیں پسند نہیں۔

خانقاہ کاظمیہ قلندریہ، کاکوری، لکھنؤ:

قصبہ کاکوری صوبہ اترپردیش کے قدیم، مشہور اور علمی قصبات میں سے ایک ہے، یہ قصبہ دارالحکومت اترپردیش لکھنؤ سے ۲۱/کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے، یہیں پر حضرت شاہ محمد کاظم قلندر قدس سرہ (۱۲۲۱ھ) نے "خانقاہ کاظمیہ قلندریہ" کی داغ بیل ڈالی، جو آج بھی مرجع عوام وخواص ہے، یہاں کا بھی توارث یہی ہے کہ شروع اقامت ہی میں نمازی کھڑے ہوتے ہیں۔

خانقاہ وجیہیہ مجددیہ، رامپور:

اس خانقاہ کا توارث بھی شروع اقامت میں ہی کھڑا ہونا ہے، اس مسئلے کی بابت مفتی محبوب علی رامپوری "فتاوی علماء رامپور" میں لکھتے ہیں:

"اس میں موجودہ علما کا اختلاف ہے، مولوی احمد رضا خان صاحب فرماتے ہیں کہ امام بیٹھا رہے جب مکبر حی علی الصلاۃ پر پہنچے تب کھڑا ہو اور فقہ کی بعض عبارتوں سے ایسا دھوکہ بھی لگتا ہے کہ مستحب یہ ہے کہ امام حی علی الصلاۃ پر کھڑا ہو، مگر علماء رامپور وجمہور علماء کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ابتداء ہی سے کھڑے ہوجاتے ہیں، اس لیے ہم نے اس مسئلہ میں کافی تحقیق کی اور کتابوں کی ورق گردانی کی، لہٰذا ہمارے علمائے رامپور وغیرہ کی تحقیق کے مطابق ہمیں ثبوت مل گیا اور فقہ کی دیگر عبارتوں میں صراحت کردی گئی کہ حی علی الصلاۃ پر کھڑے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے زیادہ تاخیر نہ کرے، تاخیر کی یہ انتہا ہے، نہ کہ اول سے کھڑے ہونے کی ممانعت اور کفایہ میں ہے کہ سرعت امتثال اسی میں ہے کہ اول سے کھڑا ہو، اسی لیے یہ افضل ہے: والقيام لإمام و مؤتم الخ مسارعة لامتثال أمره و الظاهر أنه احترازعن التاخير لا التقديم حتى لو قام أول الإقامة لا بأس۔[1]

([1]) فتاوی علماء رامپور: ص، ۱۶/۱۷، زیر اہتمام: شعبہ نشر واشاعت، مدرسہ جامعہ العلوم فرقانیہ

اذان ثانی کے مسئلے پر علمائے رامپور نے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے فتوے پر شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے جس پر ان کا موقف واضح ہے تاہم اختلاف ادب کی یہ تاریخ صد ہزار داستان ہے جس میں بے شمار مقامات آہ وفغاں ہیں۔

خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، ضلع پٹنہ (بہار):

مولانا ہلال احمد قادری صاحب اقامت کے مسئلے میں فتویٰ جاری کرتے ہوئے اس خانقاہ کا توارث تحریر فرماتے ہیں کہ ''اقامت کے مسئلے میں شروع سے تمام بزرگوں کا عمل یہ رہا ہے کہ وہ شروع اقامت میں کھڑے ہوکر صفیں درست کراتے اور اقامت ختم ہونے پر نماز شروع کرتے تھے، خانقاہ کے تمام بزرگوں کا عمل اقامت کے وقت کھڑے رہنے کا ہے اور آج بھی خانقاہ کی مسجد میں یہی معمول ہے۔

ابتدائے اقامت میں بیٹھے رہنا یا امام کا مسجد میں آکر اپنی جگہ پر بیٹھ جانا حدیث سے ثابت نہیں ہے، ابتدائے اقامت میں کھڑے ہوجانا ہی مسنون ہے''۔[1]

خانقاہ منعمیہ، پٹنہ:

خانقاہ منعمیہ، متن گھاٹ، پٹنہ کا شمار بہار کی بڑی خانقاہوں میں ہوتا ہے، بانیٔ خانقاہ حضرت شاہ منعم پاک (۱۱۸۵ھ) بارہویں صدی کے جلیل القدر بزرگ گزرے ہیں، اس آستانے کے موجودہ صاحب سجادہ معروف عالم دین، صوفی، خطیب، داعی، ڈاکٹر سید شمیم الدین منعمی ہیں، جب ان سے ان کے خانقاہ کے توارث کے سلسلے میں گفتگو کی گئی تو انھوں نے بتایا:

اذان ثانی کا معمول ہمارا عندالمنبر ہی ہے اور اسی پر ہم آج بھی قائم ہیں، معروف عالم دین علامہ ارشد القادری بھی ہمارے یہاں آتے رہے، ہماری مسجد میں تقریر کی اور منبر کے قریب اذان ثانی ہوئی، لیکن کبھی اس مسئلے پر کچھ بھی نہیں

([1]) سہ ماہی المجیب، مارچ ۲۰۰۳ء، از ہلال احمد قادری

کہا، البتہ اقامت کے وقت کھڑے ہونے کے سلسلے میں ہمارا توارث متروک ہے، ہمارے مشائخ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہوتے رہے۔ ہمارے والد صاحب کے زمانے میں اس میں تبدیلی آئی اور اس تبدیلی کی وجہ یہ بنی کہ والد صاحب نے اس مسئلے پر تحقیق کرائی، ساری کتابیں تلاش کی گئیں ان میں ایک کتاب مولانا ظفر الدین بہاری کی ملی جو اقامت کے مسئلے میں ہے، اس میں عالم گیری کے حوالے سے ہے، کہ شروع میں کھڑا رہنا مکروہ ہے، اسی لیے والد صاحب نے بھی کہا کہ ہم لوگ بھی حی علی الصلوۃ پر کھڑے ہوں گے، لیکن ہم کسی کے اندھے مقلد نہیں ہیں۔ آج اس کے خلاف کوئی مضبوط بات آتی ہے تو ہم اس پر غور کریں گے۔

خانقاہ قادریہ، بدایوں :

یہ ہندوستان کی مشہور خانقاہوں میں ایک ہے، یہاں سے ایک عرصہ سے خلق خدا علمی و روحانی فیض پا رہی ہے۔

اذان ثانی کے مسئلے میں اعلی حضرت بریلوی سے اس خانقاہ کا اختلاف معروف و مشہور ہے، اقامت کے سلسلے میں بھی وہاں کا عام معمول یہی ہے کہ صاحب سجادہ جب تشریف لاتے ہیں تو ان کو دیکھتے ہی لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں اور اقامت بھی شروع ہو جاتی ہے۔ اس بارے میں یہاں کے ایک ذمہ دار شخص سے بات ہوئی، تو اس نے کہا کہ ہمارے یہاں پہلے بھی اور آج بھی لوگ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہوتے ہیں لیکن کسی پر کوئی جبر نہیں ہے جو جب چاہے کھڑا ہو، کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ اس سلسلے میں ہمارے بزرگوں کی کوئی تحریر موجود نہیں ہے۔

جنوب ہند کا توارث:

جن شخصیتوں نے جنوب ہند کی امامت و پیشوائی کی، ان میں ایک بڑا نام شیخ الاسلام انوار اللہ شاہ فاروقی کا ہے۔ آپ نے جامعہ نظامیہ حیدرآباد کی بنیاد رکھی، آپ

علوم ظاہری میں ید طولی رکھتے تھے اور علوم باطنی کے شہسوار بھی تھے۔ حضرت شیخ الشیوخ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے نسبت ارادت رکھتے تھے۔آپ نے متعدّد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں اور بہت سے مسائل میں آپ اپنی تحقیقی رائے رکھتے تھے۔پورا جنوب ہند آپ سے متاثر تھا اور آپ کے فتوی پر عامل بھی۔

آپ بھی اذان عند المنبر کے قائل تھے ،آپ ہی کے حکم سے مولانا معین الدین اجمیری نے ''القول الاظہر فیما یتعلق بالاذان عند المنبر ''تصنیف کی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ جنوب ہند کی مسجدوں میں اذان مسجد کے اندر ہوتی تھی۔لیکن موجودہ زمانے میں ان میں سے کچھ نے اپنے توارث کو چھوڑ دیا ہے۔

خانقاہ سلیمانیہ، تونسہ شریف، پاکستان

تونسہ، پاکستان کے صوبہ پنجاب کے ضلع ڈیرہ غازی خان میں واقع ایک شہر ہے۔ غوث زمان حضرت خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسوی (۱۱۸۳-۱۲۶۷ھ) سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے ایک نامور بزرگ رہے ہیں۔ ہندوستان، پاکستان اور افغانستان میں سیکڑوں مشائخ آپ کو اپنا روحانی مورث تسلیم کرتے ہیں۔ ۱۲۱۴ھ میں آپ رشدو ہدایت کے لیے شیخ کے حکم سے تونسہ میں قیام پزیر ہوئے۔

مشہور و معروف کتاب شناس اور درگاہ شریف کے مستقل حاضر باش مولانا رمضان علی معینی سے گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ پاکستان کی اکثر خانقاہوں میں بالعموم اور چشتیہ سلسلے کی خانقاہوں میں بالخصوص آج بھی جمعے کی اذان ثانی اندر ہوتی ہے اور لوگ ابتدائے اقامت ہی میں کھڑے ہوتے ہیں، ہمارے یہاں بھی شروع سے یہی معمول ہے۔

خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں الہ باد:

سید سراواں، الہ آباد کا ایک قدیم قصبہ ہے۔ یہ قصبہ دلی کولکاتا ریلوے لائن پر

الہ آباد شہر سے تقریباً ۲۲ر کیلو میٹر کی دوری پر جانب مغرب واقع ہے۔ آٹھویں صدی ہجری کے عظیم صوفی عارف ربانی سید محمد بن علی بن العلاء حسینی سبزواری معروف بہ سید حقانی قدس سرہٗ نے اس سرزمین کو اپنا مسکن بنایا اور دیکھتے دیکھتے یہ خطۂ ارض مخلوق خدا کے رشد وہدایت اور عقیدتوں کا مرکز بن گیا۔ یہ قصبہ آپ ہی کی طرف منسوب ہوکر ''سید سراواں'' کہلایا۔

سلطان العارفین شاہ عارف صفی محمدی قدس سرہٗ (۱۳۲۰ھ/۱۹۰۳ء) نے انیسویں صدی عیسوی میں ایک طرح سے آپ ہی کے دعوتی اور تبلیغی مشن کی نشاۃ ثانیہ کی اور ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء میں مخلوق کی روحانی تشنگی بجھانے کی خاطر سید صاحب کے مزار اقدس کے قریب ہی خانقاہ عارفیہ کی بنیاد رکھی۔ خانقاہ عالیہ عارفیہ کا تعلق مشہور روحانی سلسلہ، چشتیہ صفویہ سے ہے۔ حضرت سلطان العارفین کو خرقۂ اجازت و خلافت، حضرت شاہ عبدالغفور محمدی بارہ بنکوی قدس سرہٗ (۱۳۲۴ھ) سے حاصل تھا جو حضرت مخدوم شاہ محمد خادم صفی محمدی صفی پوری قدس اللہ سرہٗ (۱۲۸۷ھ) کے مرید و خلیفہ تھے۔ یہ روحانی سلسلہ، شیخ الاسلام حضرت مخدوم عبد الصمد شاہ صفی (۹۴۵ھ)، وارث الانبیا حضرت مخدوم شیخ سعد خیر آبادی (۹۲۲ھ) اور قطب العالم حضرت مخدوم شاہ مینا لکھنوی (۸۸۴ھ) قدست اسرارہم کے واسطوں سے ہوتا ہوا سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی قدس سرہٗ (۷۲۵ھ) تک پہنچتا ہے۔

اس خانقاہ کے موجودہ صاحب سجادہ داعی اسلام شیخ ابو سعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ العالی ہیں۔ اس خانقاہ میں بھی شروع سے ہی خطبۂ جمعہ کی اذان مسجد کے اندر ممبر کے سامنے ہوتی ہے اور اقامت کے مسئلے میں اس کا توارث یہ ہے کہ اقامت ہوتے ہی سب لوگ کھڑے ہوجاتے ہیں اور آج بھی داعی اسلام اپنے اسی توارث پر عمل پیرا ہیں۔ آپ کا طریقہ یہ ہے کہ آپ مسجد سے متّصل بائیں جانب

حجرے سے مسجد میں داخل ہوتے ہیں، آپ کو دیکھتے ہی اقامت شروع ہوجاتی ہے اور سب لوگ کھڑے ہوجاتے ہیں۔ یہ عین سنت نبوی ہے جس میں کسی فقیہ کو اختلاف نہیں اور یہ سنت میری نظر میں کہیں اور نظر نہیں آتی۔ ظہر و عصر میں آپ سیدھے مصلے پر چلے جاتے ہیں اور صف کی درستگی کے بعد نماز کی امامت فرماتے ہیں جب کہ مغرب، عشاء اور فجر میں آپ کے حکم سے کوئی اور امامت کرتا ہے۔ جمعہ کے دن آپ مسجد میں ہی بیٹھے رہتے ہیں۔ امام خطبہ دینے کے بعد مصلے پر چلا جاتا ہے، بیٹھتا نہیں ہے، اس لیے آپ بھی کھڑے ہوجاتے ہیں، ساتھ ہی تکبیر بھی شروع ہوجاتی ہے اور سب لوگ کھڑے بھی ہوجاتے ہیں یہ طریقہ بھی فقہا کی تصریحات کے مطابق سب سے اولی ہے، جیسا کہ ماقبل مذکور ہوا کہ خطبہ کے بعد مصلی پر امام کا بیٹھنا اور پھر بیٹھ کر اقامت سننا یہ کہیں سے بھی ثابت نہیں ہے۔

یہی یہاں کا ہمیشہ سے توارث رہا ہے، یہاں یہ بھی واضح کردیں کہ داعی اسلام اگرچہ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہوتے ہیں، لیکن آپ حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے والے پر نکیر نہیں فرماتے، بلکہ آپ کا معمول یہ بھی ہے کہ اگر آپ ایسی جگہ جاتے ہیں جہاں لوگ حی علی الفلاح پر کھڑے ہوتے ہیں تو آپ بھی ان کے ساتھ حی علی الفلاح ہی پر کھڑے ہوتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ ایک استحبابی مسئلہ ہے لہٰذا جہاں کا جو رواج ہو اسی پر عمل کرنا چاہیے اور شدت برتنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

خانقاہوں کے اس توارث سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کی اذان ثانی مسجد کے اندر منبر کے سامنے دیا جانا اور شروع اقامت میں کھڑا ہونا کوئی آج کی ایجاد نہیں ہے، بلکہ زمانہ قدیم سے ہی مشائخ کا معمول رہا ہے۔

اس لئے اس مسئلے میں شدت نہیں ہونی چاہئے۔ اس سلسلے میں بعض علما کا جو اختلاف ہے اس کی نوعیت محض استحباب سے متعلق ہے، جبکہ اتحاد اہل سنت اور

محبت و موالات مسلمین فرض و واجب ہے، غرض فرض چھوڑ کر استحباب کے مسئلے پر جنگ سراسر نادانی ہے، استحبابی مسئلے میں جس کی جو تحقیق ہو اس پر عمل کرنا چاہیے۔ لیکن دوسروں کو اسے منوانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اللہ کریم ہمیں اپنی بندگی، اپنے حبیب کی محبت و اطاعت اور مشائخ کی پیروی پر قائم رکھے۔ اور ہم مسلمانوں کو ایک اور نیک رکھے، نفس کی بندگی سے آزادی دے اور اپنی بندگی کا خوگر بنائے، آمین یارب العالمین بجاہ سید المرسلین علیہ وعلی اٰلہ افضل الصلوۃ وادوم التسلیم۔

کیا یہ مسئلہ ضروریات اہل سنت اور شعار سنیت سے متعلق ہے؟

ضروریات اہل سنت کا مفہوم:

بعض لوگ ان مسائل کو ضروریات اہل سنت سے شمار کرتے ہیں، اس لیے سب سے پہلے ضروریات اہل سنت کی تفہیم اور تعریف واضح کردی جائے تاکہ اس الزام کی حقیقت سامنے آجائے۔

ہم ضروریات اہل سنت کی تعریف و توضیح کے لیے ''فتاوی رضویہ'' کی عبارت من وعن پیش کررہے ہیں:

مانی ہوئی باتیں چار قسم [کی] ہوتی ہیں۔

(۱) ضروریاتِ دین:

ان کا ثبوت قرآن عظیم یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی قطعیات الدلالات، واضحۃ الافادات سے ہوتا ہے جن میں نہ شبہے کی گنجائش، نہ تاویل کو راہ۔ اور ان کا منکر یا ان میں باطل تاویلات کا مرتکب کافر ہوتا ہے۔

(۲) ضروریاتِ مذہب اہلسنت وجماعت:

ان کا ثبوت بھی دلیل قطعی سے ہوتا ہے۔ مگر ان کے قطعی الثبوت ہونے میں ایک نوعِ شبہہ اور تاویل کا احتمال ہوتا ہے، اسی لیے ان کا منکر کافر نہیں بلکہ گمراہ، بدمذہب، بددین کہلاتا ہے۔

(۳) ثابتات محکمہ:

ان کے ثبوت کو دلیل ظنی کافی، جب کہ اس کا مفاد اکبر رائے ہو کہ جانب

خلاف کو مطروح و مضمحل اور التفاتِ خاص کے ناقابل بنادے۔ اس کے ثبوت کے لیے حدیث احاد، صحیح یا حسن کافی، اور قول سوادِ اعظم و جمہور علماء کا سندِ وافی، فانّ ید اللہ علی الجماعۃ (اللہ تعالی کا دستِ قدرت جماعت پر ہوتا ہے۔)

ان کا منکر وضوحِ امر کے بعد خاطی و آثم خطاکار و گناہ گار قرار پاتا ہے، نہ بددین و گمراہ، نہ کافر و خارج از اسلام

(۴) ظنّیات محتملہ:

ان کے ثبوت کے لیے ایسی دلیل ظنّی بھی کافی، جس نے جانبِ خلاف کے لیے بھی گنجائش رکھی ہو، ان کے منکر کو صرف مخطی و قصور وار کہا جائے گا نہ گنہگار، چہ جائیکہ گمراہ، چہ جائیکہ کافر۔

ان میں سے ہر بات اپنے ہی مرتبے کی دلیل چاہتی ہے، جو فرقِ مراتب نہ کرے اور ایک مرتبے کی بات کو اس سے اعلی درجے کی دلیل مانگے، وہ جاہل بے وقوف ہے یا مکّار فیلسوف ع

ہر سخن و قتے و ہر نکتہ مقامے دارد

(ہر بات کا کوئی وقت اور ہر نکتے کا کوئی خاص مقام ہوتا ہے۔)

گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

(اگر تو مراتب کے فرق کو ملحوظ نہ رکھے تو زندیق ہے۔)[1]

ان چاروں قسموں پر غور کریں، تو معلوم ہوگا کہ اس مسئلے کا تعلق "ضروریات دین" سے نہیں ہے، یہ تو بالکل ظاہر ہے، اسی طرح اس کا تعلق "ضروریات اہل سنت" سے بھی نہیں ہے؛ کیوں کہ ضروریات اہل سنت ہونے کے لیے بھی "دلیل قطعی" چاہیے، جب کہ حی علی الفلاح پر قیام کے ثبوت کے لیے کوئی "دلیل قطعی" نہیں ہے۔

([1]) فتاوی رضویہ، ج، ۲۹، ص: ۳۸۵)

اس مسئلے کو ''ثابتات محکمہ'' کے خانے میں بھی نہیں رکھ سکتے ؛کیوں اس کے ثبوت کے لیے بھی ''حدیث احاد، صحیح ،یا حسن، یا سواد اعظم اور جمہور علما'' کا قول چاہیے، حالانکہ اس کا ثبوت ان میں سے کسی چیز سے نہیں ہے۔ البتہ اس کو ''ظنیات محتملہ ''کی فہرست میں شامل کر سکتے ہیں ،لہٰذا بر سبیل تنزل حی علی الفلاح پر قیام کا ثبوت ''ظنیات محتملہ'' کے قبیل سے ہے، تب بھی اس کے خلاف عمل کرنے والے گنہگار نہیں ہیں، چہ جائیکہ گمراہ، چہ جائیکہ کافر، کیوں کہ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے والوں کے پاس بھی دلائل موجود ہیں، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ اور وہ حضرات اہل سنت ہی نہیں اساطین اہل سنت اور مقتدایان امت ہیں۔

یہاں یہ بات بھی کس قدر حیرت انگیز ہے کہ بعض لوگ ایک ایسے مسئلے کو ضروریات اہل سنت سے شمار کرنے پر تلے ہوئے ہیں جس پر مذاہب اربعہ میں الگ الگ آرا موجود ہیں۔ اس مسئلے کو ضروریات اہل سنت یا شعار سنیت سے متعلق کرنے کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ امت کے اساطین سنت کو سنیت سے خارج کرنے کی سعی نا مشکور کی جارہی ہے۔

تشبہ اہل بدعت کا مفہوم:

مسئلہ اقامت کے سلسلے میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ابتدائے اقامت ہی سے کھڑے ہونے میں اہل بدعت سے مشابہت ہوتی ہے، اس لیے حی علی الفلاح پر ہی کھڑے ہونا چاہیے، لہٰذا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس حوالے سے بھی کچھ باتیں عرض کروں، کہ مشابہت کی حد کیا ہے ؟اس کا مفہوم کیا ہے ؟کن چیزوں میں مشابہت باعث ضلالت ہوتی ہے ؟

اس تعلق سے بھی میں اپنی بات پیش کرنے سے زیادہ، فاضل بریلوی کے والد محترم مولانا نقی علی خان رحمۃ اللہ علیہما کی بات پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں، جس کو انھوں

نے قدرے تفصیل کے ساتھ ''اصول الرشاد لقمع مبانی الفساد'' میں لکھا ہے۔آپ قاعدہ نمبر۶ کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

''مشابہت کفار و مبتدعین کی ممانعت چند امور پر موقوف:

اولاً:نیت وقصد مشابہت؛ لأن الأعمال بالنیات،ولکل امرءمانوی، وفی ''الأشباہ'' الأمور بمقاصدھا و''فی الدر المختار'' ناقلا عن ''البحر''''فإن التشبہ بہم لا یکرہ فی کل شیء بل فی المذموم وفیما یقصد بہ التشبہ''.

[اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے ہر شخص کو اس کی نیت کا بدلہ ہی ملتا ہے اور اشباہ میں ہے:تمام امور اپنے مقاصد کے تحت ہیں،در مختار میں البحر الرائق کے حوالے سے ہے:کفار و مبتدعین سے مشابہت ہر چیز میں مکروہ نہیں ہے،بلکہ مذموم چیزوں میں مکروہ ہے اوران چیزوں میں مکروہ ہے جن میں مشابہت کی نیت کی گئی ہو۔]

حدیث:(من تشبہ بقوم فھو منھم)اور دیگر احادیث میں جو ممانعتِ مشابہت میں ہیں جیسے حدیث(لیس منا من تشبہ بغیرنا)اور(لا تشبھوا بالیھود والنصاری) لفظِ تشبہ وارد،خاصہ باب تفعل کا تکلف ،کتمرض و تکوف: أی أظھر نفسہ مریضًا و کوفیًا ولم یکن.

[ان تمام نصوص میں لفظ تشبہ آیا ہے جو باب تفعل سے ہے جس کے مفہوم میں تکلف کا معنی پایا جاتا ہے، مثلا تمرض کے معنی ہیں، بتکلف مریض بننا۔ تکوف کا معنی ہیں بتکلف کوفی بننا جب کہ حقیقتاً نہ مریض ہو اور نہ کوفی ہو۔]

بیسوں عبادات اور صدہا معاملاتِ اہل اسلام و کفار مبتدعین باہم متشابہ یا متحد ہیں،مگر بدون نیت وقصدِ مشابہت باتفاق فریقین حرام ومکروہ نہیں....الخ

دوم:جس فعل میں مشابہت واقع ہے ،شعارِ مذہب ان کا ہو،صرح بہ العلماءفی''شرح الفقہ الاکبر'' لمولانا علی القاری رحمہ اللہ :أنا ممنوعون

من التشبه بالكفرة و أهل البدعة فی شعارهم ،لا من هیون عن کل بدعة، ولوکانت مباحة، سواء کانت من أفعال أهل السنة أو من أفعال الکفرة وأهل البدعة ،فالمدار علی الشعار''...الخ

[اس بات کی علمانے صراحت کی ہے کہ اسی معاملہ میں مشابہت ممنوع ہے جو کفار و مبتدعین کا شعار ہو، ملاعلی قاری کی شرح فقہ اکبر میں ہے، ہمیں کفاراوراہل بدعت کی شعار میں مشابہت سے منع کیا گیا ہے۔ ہر بدعت میں مشابہت سے نہیں روکا گیا ہے، خواہ وہ بدعت اہل سنت کے افعال میں ہو، کفار کے افعال میں ہو یا اہل بدعت کے افعال میں ہو۔ لہٰذا ممانعت کی بنیاد شعار ہے۔]

سوم: خصوصیت فعل کی کسی فرقہ مخالف کے ساتھ اور ممانعت مشابہت کی اس میں خاص اس حالت میں متصور کہ اِحداث اُس فعل کا اُس فرقہ سے ثابت ہو، ورنہ ہمیں ترک اپنی عادت کا کہ کفار اہل بدعت بہ تقلید واقتدا ہماری اختیار کرلیں، ضروری نہیں۔

چہارم: اگر عادت کفار و مبتدعین کی بدل جائے اور اب ان میں عادت ورواج نہ رہے، یا رواج عام ہونے سے خصوصیت ان کے ساتھ باقی نہ رہے یہاں تک کہ شعار ان کا نہ سمجھا جائے، تو حکم بھی نہ رہے گا۔''...الخ[1]

خلاصہ یہ ہے کہ مشابہت متحقق ہونے کے لیے چار چیزیں درکار ہیں، جیسا کہ مولانا کے مذکورہ اقتباسات سے معلوم ہوا، اب اگر ہم مسئلہ اقامت کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان چاروں چیزوں میں سے کوئی ایک بھی نہیں پائی جاتی ہے۔

پہلی شرط یہ تھی کہ ''نیت و قصد مشابہت ہو'' یہ شرط مفقود ہے، کوئی بھی اہل بدعت سے مشابہت کی بنا پر ابتدا میں قیام نہیں کرتا۔

([1])(اصول الرشاد لقمع مبانی الفساد: ص، از ۱۴۹ تا ۱۵۳)

دوسری شرط یہ تھی کہ ''جس فعل میں مشابہت واقع ہے شعار مذہب ان کا ہو'' یہ شرط بھی مفقود ہے، کیوں کہ ابتدائے اقامت میں کھڑا ہونا اہل بدعت کا شعار نہیں ہے، کیوں کہ اہل سنت وجماعت -کبار تابعین اور حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی -کی اکثریت ابتدا ہی میں کھڑے ہونے پر عامل ہے، فقہائے احناف میں سے ایک نامور فقیہ امام طحطاوی (۱۲۳۱ھ) حنفیہ کے مذہب کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جتنی جلد کھڑا ہو بہتر ہے، البتہ حی علی الفلاح سے تاخیر نہ کرے کہ وہ خلاف استحباب ہے۔ چنانچہ آپ ''در مختار'' کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

والقيام لإمام و مؤتم الخ مسارعة لامتثال أمره و الظاهر أنه احتراز عن التاخير لا التقديم حتى لو قام أول الإقامة لا بأس.[1]

امام اور مقتدی کا کھڑا ہونا، الخ امتثال حکم میں جلدی کرنا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کو مستحب کہنا یہ تاخیر سے روکنا ہے، نہ کہ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے سے روکنا، لہٰذا کوئی اگر ابتدائے اقامت ہی میں کھڑا ہو جائے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔

مزید یہ کہ ہندو پاک میں پہلے علما و مشائخ کا اسی پر عمل رہا ہے اور آج بھی بہت سی خانقاہوں میں اسی پر عمل ہے۔ نیز برصغیر سے باہر عالم اسلام میں اہل سنت و اہل تصوف بلکہ عام اہل اسلام کا اسی پر عمل ہے۔

تیسری شرط یہ تھی کہ ''خصوصیت فعل کی کسی فرقہ مخالف کے ساتھ اور ممانعت مشابہت کی اس میں خاص اس حالت میں متصور کہ اِحداث اُس فعل کا اُس فرقہ سے ثابت ہو'' اس مسئلہ اقامت میں یہ تیسری شرط بھی نہیں پائی جاتی، کیوں کہ اس کا مُحدِث فرق باطلہ نہیں ہیں، بلکہ یہ مسئلہ سلف سے چلا آرہا ہے، جیسا کہ میں نے ماقبل میں بیان کر دیا ہے کہ حضرت سعید بن مسیب، عمر بن عبد العزیز، امام

([1]) طحطاوی علی الدر المختار (۱/۲۱۵)

زہری اور دیگر لوگوں کا بھی یہی عمل رہا ہے۔

چوتھی شرط یہ تھی کہ ”اگر عادت کفار و مبتدعین کی بدل جائے اور اب ان میں عادت ورواج نہ رہے، یا رواج عام ہونے سے خصوصیت ان کے ساتھ باقی نہ رہے یہاں تک کہ شعار ان کا نہ سمجھا جائے، تو حکم بھی نہ رہے گا“

یہ شرط بھی اقامت کے مسئلے میں نہیں پائی جاتی، کیوں کہ یہ اہل بدعت کا نہ شعار ہے اور نہ صرف ان ہی کا رواج، بلکہ اہل سنت و جماعت کے یہاں بھی مسئلے کی یہ صورت رائج ہے۔ ہاں جو لوگ اہل سنت کو کسی ایک عالم کی فکر میں منحصر مانتے ہیں اور کسی فقیہ یا خانقاہ سے وابستگی کو ہی سنت سمجھتے ہیں ان کی سمت الگ ہے، انہیں ضرور شبہہ اور تشبہ لاحق ہوگا۔

اسی طرح اعلی حضرت فاضل بریلوی ”فتاوی رضویہ“ میں لکھتے ہیں:

....تشبہ وہی ممنوع و مکروہ ہے جس میں فاعل کی نیت تشبہ کی ہو یا وہ شی ان بدمذہبوں کا شعار خاص یا فی نفسہ شرعًا کوئی حرج رکھتی ہو، بغیر ان صورتوں کے ہرگز کوئی وجہ ممانعت نہیں۔[1]

ابتدائے اقامت میں قیام کرنے والوں کی اہل بدعت سے نہ تشبہ کی نیت ہوتی ہے اور نہی یہ اہل بدعت کا شعارِ خاص ہے۔ اور نہ ہی اس پر عمل کرنے میں فی نفسہ شرعًا کوئی حرج ہے۔

ان تشریحات کی روشنی میں یہ واضح ہوگیا کہ مسئلہ اقامت کا، اہل بدعت کے ساتھ مشابہت کسی درجے میں نہیں ہے، لیکن ہمارے یہاں المیہ یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اہل بدعت کے ساتھ مشابہت کا ٹیگ لگا دیتے ہیں، پھر اس کو حرام بلکہ کفر تک پہنچا دیا جاتا ہے، اللہ ہم سب کو اس علمی بحران اور اخلاقی دیوالیہ پن سے بچائے۔ آمین!

([1])فتاوی رضویہ، ۲۴/۵۳۴)

حاصل کلام

○ اذان ثانی کا اندرون مسجد ہونا مختلف فیہ اور فرعی مسئلہ ہے۔

○ خارج مسجد اذان ثانی دینا، عہد رسالت و خلفاے راشدین کی سنت ہے۔

○ اذان ثانی کا داخل مسجد ہونے پر دوسری صدی سے علما و مشائخ کا معمول رہا ہے۔

○ اذان ثانی کا مقصد صرف حاضرینِ مسجد کو سماعتِ خطبہ کے لیے متوجہ کرانا ہے۔

○ آج خارج مسجد اذان ثانی دینا ظاہر سنت کے مطابق ہے۔

○ اذان ثانی اندرون مسجد دینا در حقیقت سنت کے خلاف نہیں بلکہ مقصد سنت کے عین مطابق ہے۔

○ اندرون مسجد اذان ثانی کا ہونا بدعت سیئہ، مکروہ اور گناہ نہیں بلکہ دوسری صدی کے بعد کے علما و مشائخ کی پیروی ہے۔

○ اندرون مسجد اذان ثانی کو بدعت سیئہ کہہ کر رد کرنا، دوسری صدی سے آج تک کے تمام بلاد عالم کے علما و مشائخ کی ایک گونا توہین ہے۔

○ اذان کا مقصود شرعی؛ اعلام و اعلان ہے جو مائک سے دی جانے والی اذان سے حاصل ہے خواہ وہ کہیں سے دی جائے، داخل مسجد سے یا خارج مسجد سے۔ اب اس مسئلے پر بحث و جدل کرنا کسی طرح جائز نہیں بلکہ انتشار و افتراق کا سبب ہے، جو

یقیناً معیوب ہے۔

○ ابتدائے اقامت میں کھڑا ہونا بھی فرعی اور مختلف فیہ مسئلہ ہے۔

○ نبی کریم ﷺ سے اقامت کے وقت بیٹھنا ثابت نہیں۔

○ بعض مجتہدین تابعین کے نزدیک ابتدائے اقامت میں کھڑا ہونا واجب ہے اور اکثر مجتہدین اور جمہور ائمہ مذاہب کے نزدیک مستحب ہے جب کہ احناف کے نزدیک اس مسئلہ میں قدرے تفصیل ہے۔

○ فقہ حنفی میں اقامت کے وقت کھڑے ہونے کی تین صورتیں ہیں۔ دو صورتوں میں ابتدائے اقامت میں اور ایک صورت میں حی علی الصلاۃ/حی علی الفلاح کے وقت کھڑا ہونا مستحب ہے۔ تاہم پہلے کھڑے ہونے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

○ خیر کی طرف جلدی کرنے اور تعدیل صفوف کی وجہ سے ہندو پاک کی اکثر خانقاہوں کا معمول ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کا رہا ہے۔

○ اگر امام مسجد میں موجود نہ ہو تو اس کے لیے پہلے سے کھڑا ہو کر انتظار کرنا اپنے آپ کو مشقت میں ڈالنا ہے اس لیے ایسی صورت میں پہلے کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ ورنہ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے میں کوئی حرج نہیں۔

حرف اختتام

ان تمام مباحث کا حاصل یہ ہے کہ داخل مسجد اذان ثانی دینااور ابتدائے اقامت میں قیام کرنا ایک فرعی اور مختلف فیہ مسئلہ ہے لہٰذا جو لوگ خارج مسجد اذان ثانی دیتے ہیں، وہ خارج مسجد اذان ثانی دیں! اور جو لوگ داخل مسجد اذان ثانی دیتے ہیں وہ داخل مسجد اذان ثانی دیں! اسی طرح جو لوگ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہوتے ہیں، انہیں چاہئے کہ وہ حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے والے پر لعن طعن نہ کریں اور جو لوگ حی علی الفلاح پر کھڑے ہوتے ہیں، انہیں چاہیے کہ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے والے پر نکیر نہ کریں، کیوں کہ دلائل جواز اور وجوہ ترجیح دونوں کے پاس موجود ہیں، اختلاف صرف استحباب میں ہے اور استحباب کا حکم ماقبل میں گزر چکا، البتہ ان نئے طریقوں سے بچنا چاہیے جن کا ذکر نہ احادیث کریمہ میں ملتا ہے اور نہ ہی صحابہ و تابعین اور فقہائے امت کے یہاں، جیسا کہ ہمارے یہاں بعض مسجدوں میں یہ ہوتا ہے کہ امام اپنے حجرے سے نکلتے ہیں اور مصلی پر جا کر بیٹھ جاتے ہیں، پھر مکبر تکبیر کہتا ہے، پھر سب لوگ حی علی الفلاح پر کھڑے ہوتے ہیں اور اگر امام، صاحبِ حیثیت اور پیر ہو تو امام صاحب کو آتے دیکھ کر سب مقتدی کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر سب بیٹھ جاتے ہیں، اس کے بعد مکبر تکبیر کہتا ہے، تب سب لوگ حی علی الفلاح پر کھڑے ہوتے ہیں، یہ ایک غیر ضروری رسم پرستی ہے، اس کا ثبوت نہ احادیث کریمہ میں ملتا ہے اور نہ فقہ کی کسی کتاب میں۔

لیکن اس کے باوجود اگر کوئی اپنے طریقے کے مطابق عمل پیرا ہے تو اس میں اس سے کوئی تعرض کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ اس کے لیے بحث و مباحثہ کیا جائے۔ اس قسم کے مسائل کو لے کر نزاعی صورتِ حال پیدا کرنا، کسی کی سنیت اور ضلالت کا فیصلہ کرنا، اہل سنت کے بیچ شگاف ڈالنا، فتوی بازی کرنا، تعلقات توڑنا، یہ نادانی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

میں نے ان دونوں مسئلوں کو اتنی تفصیل سے اس لیے واضح کیا تاکہ کہ لوگ داخل مسجد اذان ثانی دینے والے اور ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے والے اہل سنت پر طعنہ زنی نہ کریں اور نہ ہی مشقِ ستم بنائیں اور نہ ہی ان مسائل کو فرض و واجب کا درجہ دیں ۔ جو لوگ ان مسائل کے ساتھ فرض و واجب کا سا معاملہ کرتے ہیں ان سے میری مؤدبانہ گزارش ہے کہ ان مسائل کی نوعیت اور ان کی حقیقت کو سمجھیں اور کسی پر لعن طعن اور کسی کی سنیت داغ دار کرنے کی بے جا جسارت سے اجتناب کریں ۔ اور اللہ کے حضور جواب دہی کو پیش نظر رکھیں۔ اس وقت اہل اسلام داخلی و خارجی سطح پر مختلف مسائل سے دوچار ہیں، اہل سنت ضعف و اضمحلال اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں، ایسے میں اس قسم کے فرعی و استحبابی مسائل کو بنیاد بنا کر اہل اسلام اور اہل سنت کو خانوں میں بانٹنے کی کوشش سے اللہ تعالی ہمیں محفوظ رکھے۔ مولیٰ کریم ہمیں حق لکھنے، سمجھنے اور قبول کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین!

ضمیمہ

مسئلہ اذان سے متعلق سوالات وجوابات

اذان

غیر اجماعی مسائل میں اختلاف کا جواز

سوال (۱) آپ کہتے ہیں کہ جس برائی کے برائی ہونے پر اجماع ہو وہی برائی منکر ہوتی ہے، اس لیے اجماعی مسئلہ ہی کے خلاف عمل پیرا لوگوں سے مواخذہ ہو سکتا ہے کیوں کہ قاعدہ ہے: لاینکر المختلف فیه وإنما ینکر المجمع علیه۔ یعنی مختلف فیہ پر عمل کرنے والے پر کوئی مواخذہ نہیں، مواخذہ صرف اجماعی مسائل کے خلاف عمل کرنے والے پر ہو سکتا ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ اگر کوئی مسئلہ حنفی شافعی کے درمیان مختلف فیہ ہو مثلاً حرام و حلال کا اختلاف ہو، حنفی کے نزدیک حرام ہو اور شافعی کے نزدیک حلال ہو تو کیا ایک حنفی اس پر عمل کرے گا تو اس سے مواخذہ نہیں ہوگا بلکہ وہ مواخذہ سے صرف اس لیے بچ جائے گا کہ اس میں شافعی کا اختلاف ہے، وہ اس کو حلال کہتے ہیں، اس طرح اگر چھوٹ دے دی جائے تو پھر تقلید کے کیا معنی ہوں گے؟

جواب: یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ جس برائی کے برائی ہونے پر اجماع ہو صرف وہی برائی منکر ہوتی ہے اور اسی پر انکار کیا جائے گا، لیکن جب کسی مسئلے کی حلت و حرمت میں اختلاف ہو جائے تو پھر وہ مسئلہ منکر کے درجہ میں نہیں رہ جاتا، خواہ یہ اختلاف کسی ایک ہی مذہب کے فقہا کے درمیان ہو یا کسی دوسرے مذاہب کے فقہا کے درمیان۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ، علامہ عبدالغنی نابلسی کے حوالے سے اپنے فتاوی میں لکھتے ہیں: متی أمکن تخریجها علی قول من الأقوال فی مذهبنا أو مذهب غیر نا فلیست بمنکر یجب اِنکاره والنهی عنه و إنما

المكنر ما وقع الإجماع على حرمته والنهى عنه خصوصاً[1]

یعنی جب کسی مسئلے کے جواز کی تخریج ہمارے مذہب یا ہمارے غیر کے مذہب کے اقوال میں سے کسی قول پر ممکن ہو تو یہ وہ منکر نہیں جس پر انکار کرنا اور اس سے روکنا واجب ہے، بلکہ منکر تو وہی ہے جس کی حرمت پر اور اس سے نہی پر اجماع واقع ہو۔

لہٰذا اگر ہمارے فقہا کے مابین کسی مسئلے کے جواز و عدم جواز میں اختلاف ہو جائے تو وہ مسئلہ منکر نہیں ہوگا جس سے روکنا واجب ہو، یا ہمارے مذہب کے علاوہ میں بھی اس مسئلہ کے جواز کی صورت نکل رہی ہوگی تو وہ مسئلہ پھر بھی منکر نہیں رہے گا۔

اب رہ گئی بات عوام کی، تو عوام اپنے زمانے کے علماء کے مذہب پر ہوتے ہیں، اگر علما اختلاف کر کے اس مسئلے پر عمل کر رہے ہیں تو عوام بھی اس پر عمل کریں گے۔ اور عوام پر بھی کوئی مواخذہ نہیں ہوگا، کیوں کہ جائز چیزوں پر عمل کرنے میں کوئی مواخذہ نہیں ہے، اس لیے میں نے لکھا ہے کہ مختلف فیہ مسئلے پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ ہاں! مواخذہ اس صورت میں ہے کہ جب کسی مسئلے کو حرام تسلیم کر کے اس پر عمل کرے، یا عوام یہ جانتے ہوں کہ یہ مسئلہ ہمارے امام کے نزدیک حرام ہے اور پھر اس پر عمل کریں تو اب ان پر مواخذہ ہوگا۔ یہ ہیں تقلید کے معنی۔

بدائع الصنائع میں ہے:

وَالْإِنْكَارُ لَا يَلْزَمُ فِي مَحِلِّ الِاجْتِهَادِ إِذَا كان الِاخْتِلَافُ فِي الْفُرُوعِ[2] یعنی محل اجتہاد میں انکار لازم نہیں آتا جب کہ اختلاف فروع کے اندر ہو۔

امام ماوردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وَأَمَّا مَا اخْتَلَفَ الْفُقَهَاءُ فِي حَظْرِهِ وَإِبَاحَتِهِ فَلَا مَدْخَلَ لَهُ فِي إِنْكَارِهِ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مِمَّا ضَعُفَ الْخِلَافُ فِيهِ

([1]) فتاوی رضویہ (۵۳۲/۹) الحدیقۃ الندیۃ شرح الطریقۃ المحمدیۃ (۲۰۴/۲)

([2]) بدائع الصنائع، کتاب الحج، فصل ویتصل بھذا بیان مایعم المحرم والحلال جمیعا (۲۰۹/۲)

وَكَانَ ذَرِيعَةً إِلَى مَحْظُورٍ مُتَّفَقٍ عَلَيْهِ كَرِبَا النَّقْدِ فَالْخِلَافُ فِيهِ ضَعِيفٌ وَهُوَ ذَرِيعَةٌ إِلَى رِبَا النَّسَاءِ الْمُتَّفَقِ عَلَى تَحْرِيمِهِ .[1]

یعنی جب کسی مسئلہ کے حرام وحلال میں فقہا کا اختلاف ہوجائے تو پھر کسی بھی رائے کے اختیار کرنے پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا، ہاں! اختلاف جب ضعیف ہو اور وہ کسی متفق علیہ حرام کا سبب بنے تو ایسی صورت میں اس ضعیف رائے پر عمل کرنا قابل مواخذہ ہوگا جیسے کہ "رِبَا النَّقْدِ" کی حرمت، کیوں کہ اس میں اختلاف ضعیف ہے اور یہ "رِبَا النَّسَاءِ" کی حرمت کا سبب ہے جس کی حرمت متفق علیہ ہے۔

حضرت غوث پاک کا عمل

سوال (۲) آپ نے لکھا ہے کہ حضور غوث پاک رضی اللہ عنہ مسجد کے اندر جمعہ کی اذان دیتے تھے جیسا کہ ان کی کتاب " الغنية" سے سمجھ میں آتا ہے، حالانکہ "الغنية" میں لفظ "عند" ہے جو ظرف زمان و مکان مبہم کے لیے آتا ہے، لہٰذا اس سے منبر سے بالکل متّصل اذان دینے کو ثابت کرنا درست نہیں ہے۔

جواب: لفظ "عند" کے معنی " قریب" کے ہیں ،اگرچہ اس کا اطلاق "بعید" معنی پر بھی ہوتا ہے، کشف الاسرار، البحر المحیط فی اصول الفقہ اور تیسیر التحریر میں ہے: وَعِنْدَ لِلْحَضْرَةِ[2] یعنی لفظ "عند" قریب کے لیے ہے۔

اور شرح الرضی علی الکافیۃ میں ہے: أن(عند) يستعمل في الحاضر القريب، وفيما هو في حرزك وإن كان بعيدا[3] یعنی لفظ "عند" قریب موجود کے لیے بولا جاتا ہے اور اس کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو تمھارے کنٹرول میں ہو، اگرچہ وہ دور ہو۔

([1]) الاحکام السلطانیۃ، الباب العشرون: فی احکام الحسبۃ (ص: ۳۶۷)
([2]) کشف الاسرار شرح اصول البزدوی (۱۸۹/۲) البحر المحیط فی اصول الفقہ (۲۱۲/۳) تیسیر التحریر (۱۲۷/۲)
([3]) شرح الرضی علی الکافیۃ (۲۲۱/۳)

لہٰذا جہاں قریب کے معنی مراد لینے پر کوئی قرینہ موجود ہوگا وہاں قریب کا معنی مراد لیا جائے گا اور جہاں بعید کے معنی مراد لینے پر کوئی قرینہ ہوگا وہاں بعید والا معنی مراد لیا جائے گا۔ اور یہاں ''الغنیۃ'' کے اندر جمعہ کی دونوں اذان کا ذکر ہے، ایک اذان جو خطبہ کے لیے دی جاتی ہے اس کو ''عند المنبر'' سے بیان کیا گیا ہے اور دوسری اذان جو اعلان عام کے لیے دی جاتی ہے اس کو ''أذان المنارۃ'' سے بیان کیا گیا ہے، اس تقابل سے پتہ چلتا ہے کہ عند سے قریب ہی کے معنی مراد ہیں یعنی منبر سے متّصل، تو یہاں ''قریب'' کے معنی مراد لینے پر قرینہ موجود تھا، اس لیے ہم نے ''عند المنبر'' میں ''عند'' کا قریب والا معنی مراد لیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ حضور غوث پاک کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے زمانے میں بھی اذانِ ثانی منبر سے متّصل ہی دی جاتی تھی۔

''عند'' سے قریب کے معنی مراد لینے پر دوسری دلیل یہ ہے کہ ہشام نے اپنے زمانے میں اس اذان کو منبر سے متّصل کر دیا تھا اور اس کا زمانہ دوسری صدی کے اوائل کا ہے اور حضور غوث پاک رضی اللہ کا زمانہ چھٹی صدی کا ہے اور اعلی حضرت کے بقول اس توارث کو انہوں نے چودھویں صدی میں بدلا، تو لا محالہ حضور غوث پاک کے زمانے میں یہ اذان مسجد کے اندر ہوتی رہی ہوگی، اور جب عند کا لفظ بھی اس معنی کی تائید کر رہا ہے تو اب یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہ اذان مسجد کے اندر ہوتی تھی۔

قُرب وبُعد کا مفہوم

سوال (۳) بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ قریب و بعید یہ امر اضافی ہے جس کا تعین اس کے متعلقات سے ہوتا ہے جیسے امام سے پہلی صف دوسری صف کی بہ نسبت قریب ہے اور دوسری صف تیسری صف کی بہ نسبت قریب ہے اسی طرح قیاس کرتے جائیں مثلاً پچاسویں صف اکاونویں صف کی نسبت قریب ہے وغیرہ، اس قاعدہ

کی روشنی میں مسجد کا دروازہ فنائے مسجد کی بہ نسبت امام سے قریب ہے اور مسجد میں اذان دینا سنت مستمرہ کے خلاف ،بدعت سیئہ اور مکروہ ہے ،اس لیے مسجد کے دروازے پر ہی اذان ہوگی۔

جواب: یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ قریب وبعید امر اضافی ہے، اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جس وقت قریب وبعید کا اطلاق ہوگا اور اس وقت قرینہ اور حال جس معنی کا تقاضا کرے گا، اسی معنی کی طرف اس کو پھیر دیا جائے گا۔ اور "عند المنبر" سے دور کے معنی مراد ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے جب کہ "عند المنبر" سے قریب بمعنی متّصل مراد ہونے پر دلیل موجود ہے، وہ یہ ہے کہ دوسری صدی کی ابتدا سے اذان ثانی مسجد کے اندر دینے کا معمول ہے، لہٰذا "عند المنبر" سے قریب بمعنی متّصل ہی مراد ہوگا۔ اور دور کے معنی مراد ہونے کی دلیل میں یہ کہنا کہ مسجد کے اندر اذان دینا سنت مستمرہ کے خلاف، بدعت سیئہ اور مکروہ ہے، یہ سراسر باطل ہے، وہ اس لیے کہ اگر مسجد کے اندر اذان دینے سے اس کی آواز دور تک پہنچ جائے یا اذان کی آواز صرف اندر ہی والوں کو سنانا مقصود ہو تو مسجد کے اندر اذان دینا سنت مستمرہ کے خلاف نہیں بلکہ سنتِ اذان کے موافق ہے کیوں کہ شرع کو اذان کی متعیّن جگہ مطلوب نہیں ہے بلکہ مقصدِ اذان پر عمل مطلوب ہے۔ اور بقول علامہ ابن عابدین شامی مسجد کے اندر اذان ثانی دینا مومنین و صالحین کا توارث ہے اور توارث مکروہ اور بدعت سیئہ نہیں ہوتا[1]

کیا امام اعظم کا مذہب یہ ہے کہ مسجد میں کوئی اذان نہ دی جائے؟

سوال (۴) بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ "مسجد میں کوئی اذان نہ دی جائے" جیسا کہ فتاوی قاضی خان، بحر الرائق اور فتاوی عالم گیری میں ہے اور خاص جمعہ کی اذان ثانی کے بارے میں بھی ہے کہ "مسجد میں اذان دینا مکروہ

---

(1) لِأَنَّ الْمُتَوَارَثَ لَا يَكُونُ مَكْرُوهًا وَكَذَلِكَ نَقُولُ فِي الْأَذَانِ بَيْنَ يَدَيْ الْخَطِيبِ فَيَكُونُ بِدْعَةً حَسَنَةً إذْ مَا رَآهُ الْمُؤْمِنُونَ حَسَنًا فَهُوَ حَسَنٌ. ردالمحتار مع الدر المختار، باب الاذان (۱/۳۹۰)

ہے" جیسا کہ فتح القدیر اور غایۃ البیان میں ہے اور امام مالک تو اسے امام کے سامنے ہی تسلیم نہیں کرتے اور مکروہ سمجھتے ہیں جیسا کہ مالکی حضرات کی کتابوں مثلاً ابن الحاج مالکی، ابن رشد قرطبی مالکی، امام شاطبی مالکی سے ثابت ہے، اور مغربی ممالک کے مسلمان تو آج تک اذان ثانی مسجد کے باہر ہی دے رہے ہیں جیسا کہ حاشیہ سفطی سے ثابت ہے۔

لہٰذا ایسی صورت میں یہ کہنا کہ ہشام بن عبد الملک کے بعد سے تمام لوگوں کا عمل اس پر رہا ہے کہ وہ سب جمعہ کی اذان ثانی مسجد کے اندر ہی دیتے رہے ہیں صریح طور پر خلاف واقعہ ہے۔

جواب: یہ کہنا کہ امام اعظم کا مذہب یہ ہے کہ "مسجد میں کوئی اذان نہ دی جائے" بالکل درست نہیں ہے، بلکہ یہ تو مذہب امام سے ناواقفی پر مبنی ہے۔ ان کا مذہب یہ ہے کہ اذان ایسی جگہ سے دی جائے جہاں سے لوگوں اور پڑوسیوں کو زیادہ سنائی دے، امام محمد جو فقہ حنفی کے جامع ہیں، فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہ سے عرض کیا: فَأَيّهمَا أحب إِلَيْك أَن يُؤذن الْمُؤَذّن على المنارة أَو فِي صحن الْمَسْجِد؟ آپ کے نزدیک اذان دینا کہاں مستحب ہے منارہ پر یا صحن مسجد میں؟

آپ نے فرمایا: أحب ذَلِك إِلَى أَن يكون أسمعهُ للْقَوْم وَالْجِيرَان وكل ذَلِك حسن[1] اذان ایسی جگہ سے دی جائے جہاں سے لوگوں اور پڑوسیوں کو زیادہ سنائی دے اور یہ دونوں جگہیں مناسب ہیں۔

امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے اس قول سے سمجھ میں آتا ہے کہ آپ کا مذہب یہ ہے کہ اذان خواہ کہیں سے بھی دی جائے درست ہے، لیکن ایسی جگہ سے دی جائے جہاں سے لوگوں کو زیادہ سنائی دے۔ اس لیے آپ کے نزدیک بھی مسجد کے اندر اذان دینا جائز ہے، چنانچہ امام محمد اپنی کتاب "الاصل" میں فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہ سے عرض کیا: أَرَأَيْت الْمُؤَذّن إِذا لم يكن لَهُ مَنَارَة وَالْمَسْجِد صَغِير أَيْن أحب إِلَيْك

([1]) الاصل المعروف بالمبسوط للشیبانی، کتاب الصَّلَاۃ، بَاب من نسی صَلَاۃ ذکرھا من الغَد (۱/۱۳۷)

أَن يُؤذن أيخرج من الْمَسْجِد فَيُؤذن حَتَّى يسمع النَّاس أَو يُؤذن فِي الْمَسْجِد؟ آپ بتائیں کہ مسجد چھوٹی ہو اور منارہ نہ ہو تو مؤذن مسجد سے باہر نکل کر اذان دے تاکہ لوگ سن سکیں یا مسجد کے اندر ہی اذان دے؟

آپ نے فرمایا: أحب ذَلِك الي أَن يُؤذن خَارِجا من الْمَسْجِد وَإِذا أذن فِي الْمَسْجِد أجزاه[1] میں یہ پسند کرتا ہوں کہ مسجد سے باہر نکل کر اذان دے اور اگر مسجد کے اندر ہی اذان دے دی جائے تب بھی کافی ہے۔

امام اعظم کے اس قول پر بھی غور کریں کہ آپ فرمارہے ہیں کہ مسجد کے اندر بھی اذان دے دی جائے تب بھی کافی ہے، لہٰذا یہ کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے کہ آپ کے نزدیک مطلقاً کوئی اذان مسجد کے اندر دینا درست نہیں ہے۔

بلکہ اصل بات یہ ہے کہ آپ کے نزدیک اذان مسجد کے اندر یا باہر ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں، آپ کے نزدیک اذان کا مقصود صرف یہ ہے کہ اذان کی آواز زیادہ سے زیادہ لوگ سنیں لیکن جب مسجد چھوٹی ہوگی تو اذان خواہ اندر دی جائے یا باہر آواز کو جہاں تک پہنچنا ہوگا وہیں تک پہنچے گی۔

واضح رہے کہ امام اعظم کا مذکورہ بالا قول امام محمد کی کتاب "الاصل" جس کو مبسوط کہا جاتا ہے، سے ماخوذ ہے جو ظاہر الروایۃ میں سے ہے، اور ظاہر الروایۃ کا مسئلہ دیگر تمام مسئلوں پر ترجیح رکھتا ہے۔

اور فتاوی قاضی خان، البحر الرائق اور فتاوی عالم گیری کے حوالے سے یہ کہنا کہ ان کتابوں میں آیا ہے: مسجد میں کوئی اذان نہ دی جائے "اس پر عرض یہ ہے کہ ان کتابوں کی عبارتوں کا مفہوم بالکل مبسوط کے موافق ہے کہ اذان کسی بلند اور ایسی جگہ دی جائے جہاں سے آواز دور تک پہنچے۔ جیسا کہ "فتاوی قاضی خان، فتاوی عالم گیری، البحر الرائق" میں ہے، کچھ لفظی اختلاف کے ساتھ تینوں کتابوں کی عبارتیں یکساں ہیں، بحر

([1]) الاصل المعروف بالمبسوط للشیبانی، کتاب الصَّلَاۃ، بَاب من نسی صَلَاۃ ذکرھا من الغد (۱۴۱/۱)

کے الفاظ یہ ہیں: وينبغي للمؤذن أن يؤذن في موضع يكون أسمع للجيران ويرفع صوته ولا يجهد نفسه لأنه يتضرر بذلك وفي الخلاصة ولا يؤذن في المسجد[1] مؤذن کے لیے بہتر یہ ہے کہ ایسی جگہ سے اذان دے جو پڑوسیوں کو زیادہ سنائی دے اور اپنی آواز کو بلند کرے لیکن اپنے آپ کو مشقت میں نہ ڈالے؛ کیوں کہ یہ اس کے لیے نقصان دہ ہے اور خلاصہ میں ہے کہ مسجد میں اذان نہ دی جائے۔

یہاں جو مسجد میں اذان نہ دینے کی بات کی جارہی ہے وہ اسی لیے کہ اگر مسجد میں اذان دی جائے گی تو دور تک آواز نہیں پہنچے گی، جب کہ اذان کا مقصود یہی ہے کہ اس کی آواز دور تک پہنچے اور لوگ اذان سن کر نماز کے لیے حاضر ہوں، اور پنج وقتہ نماز کے لیے یہ ضروری بھی ہے کہ اگر اذان مائک کے بغیر ہو تو مسجد کے باہر ہی ہو، کیوں کہ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں، ان تک اذان کی آواز پہنچے تاکہ وہ اپنا کام چھوڑ کر مسجد آئیں، اور مسجد میں اذان دینے سے یہ مقصد فوت ہوجارہا ہے، اس لیے اذان مسجد کے باہر ہی ہونا چاہیے لیکن اگر مسجد چھوٹی ہو یا ایسی جگہ اذان دے جہاں صرف حاضرین کو مطلع کرنا مقصود ہو، دوسروں کو بلانا مقصود نہ ہو یا اذان مائک سے ہو تو ایسی صورت میں کہیں سے بھی اذان دی جائے کوئی حرج نہ ہوگا۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ''مسجد میں اذان نہ دی جائے'' یہ پنج وقتہ اذانوں کے لیے فقہائے احناف کا قول ہے، جس کی خاص حکمت ہے، اب اسے براہ راست مذہب امام ابو حنیفہ قرار دینا اور اس سلسلے میں خاص قول امام کو نظر انداز کرنا، پھر فقہائے احناف کے اس قول کو پنج وقتہ اذانوں کے ساتھ جمعہ کی اذان ثانی کے لیے بھی عام کردینا، پھر فقہا نے جو حکمت نقل کی ہے، اس حکمت کو بھی نظر انداز کردینا، فقہ و دیانت کے خلاف ہے۔

([1]) البحر الرائق (۲۶۸/۱) وينبغي أو يؤذن على المئذنة أو خارج المسجد ولا يؤذن في المسجد (فتاوی قاضیخان: ۳۷/۱) الفتاوی الہندیۃ (۵۵/۱)

سوال میں جو یہ کہا گیا ہے کہ فتح القدیر اور غایۃ البیان میں خاص جمعہ کی اذان ثانی کے بارے میں لکھا ہے: مسجد میں دینا مکروہ ہے، تو یہ بھی درست نہیں ہے؛ کیوں کہ ہدایہ میں اس طرح ہے: ثُمَّ هِيَ شَرْطُ الصَّلَاةِ فَيُسْتَحَبُّ فِيهَا الطَّهَارَةُ كَالْأَذَانِ - یعنی خطبہ نماز کے لیے شرط ہے لہٰذا اس میں اذان کی طرح طہارت مستحب ہوگی۔

اس کی شرح میں امام ابن الہمام فرماتے ہیں: إذْ الْأَذَانُ لَيْسَ شَرْطًا، فَالْأَوْلَى مَا عَيَّنَهُ فِي الْكَافِي جَامِعًا وَهُوَ ذِكْرُ اللهِ فِي الْمَسْجِدِ: أَيْ فِي حُدُودِهِ لِكَرَاهَةِ الْأَذَانِ فِي دَاخِلِهِ.[1]

اس عبارت کی توضیح یہ ہے کہ صاحبِ ہدایہ نے خطبہ میں طہارت کے مستحب ہونے کی علت خطبہ کو نماز کے لیے شرط ہونا، قرار دیا جیسے کہ اذان نماز کے لیے شرط ہے یعنی جب اذان نماز کے لیے شرط ہے اور اس میں طہارت مستحب ہے تو خطبہ بھی نماز کے لیے شرط ہے لہٰذا اس میں بھی طہارت مستحب ہوگی۔ اس پر کمال ابن الھمام نے کہا کہ اذان تو نماز کے لیے شرط نہیں ہے، اس لیے "کافی" میں جو وجہ شبہ متعیّن کی گئی ہے وہی بہتر ہے اور وہ ہے "مسجد میں اللہ کا ذکر ہونا" یعنی اس کے حدود میں کیوں کہ اذان اس کے اندر مکروہ ہے۔

یہاں پر مطلقِ اذان کا ذکر ہے، خاص اذان ثانی کا ذکر بالکل نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ طہارت صرف خاص اذان ثانی ہی کے لیے مستحب ہے، بلکہ تمام اذان کے لیے طہارت مستحب ہے اور صاحبِ ہدایہ نے خطبہ کو مطلقِ اذان کے مشابہ قرار دیا تھا، لہٰذا اس اذان کو خاص اذان ثانی پر محمول کرنا غلط فہمی ہے۔

آج بہت سے لوگ علامہ کمال ابن الہمام کی مذکورہ عبارت کو داخل مسجد اذان

([1]) فتح القدیر، باب صلاۃ الجمعۃ (۵۸/۲)

ثانی کی کراہت کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں ، جب کہ یہاں داخل مسجد اذان ثانی کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے ، لیکن کچھ لوگ اِس عبارت کی من مانی تشریح و تعبیر کر کے اپنا مدعا ثابت کرتے ہیں، ایسے لوگوں سے دردمندانہ گزارش ہے کہ علامہ ابن الہمام کی مذکورہ عبارت کو بار بار پڑھیں، اور سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کریں۔

اور غایۃ البیان میں اذان کے اندر یا باہر دینے کا کوئی ذکر نہیں ہے، بلکہ اس میں ہدایہ کی عبارت "ثُمَّ هِيَ شَرْطُ الصَّلَاةِ فَيُسْتَحَبُّ فِيهَا الطَّهَارَةُ كَالْأَذَانِ" کے تحت صرف اتنا لکھا ہے: "فيه نظر لأنه يفهم من هذا التركيب أن الأذان شرط الصلاة و ليس كذالك لأنه سنة[1] یہ محل نظر ہے کیوں کہ اِس عبارت کے اسلوب سے اذان کا نماز کے لیے شرط ہونا سمجھ میں آرہا ہے حالانکہ اذان نماز کے لیے شرط نہیں ہے بلکہ اذان دینا سنت ہے۔

یہاں دیکھیں کہ "اذان کہاں ہو" اس سے متعلق کوئی بات ہی نہیں ہے لہٰذا غایۃ البیان کے حوالے سے یہ کہنا کہ اس میں خاص جمعہ کی اذان ثانی کے بارے میں لکھا ہے کہ اندر دینا مکروہ ہے کتنا بڑا مغالطہ ہے۔ بلکہ اسی کتاب میں دوسری جگہ اذان ثانی کے متعلق لکھا ہے: قوله=ولم يكن علي عهد رسول اللهﷺ إلا هذا الأذان أي الأذان الذي بين يدي المنبر حتي صعد الإمام المنبر[2] آپ ﷺ کے عہد مبارک میں صرف یہی اذان تھی یعنی وہ اذان جو منبر کے سامنے دی جاتی ہے جب امام منبر پر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس عبارت سے سمجھ میں آتا ہے کہ مؤلف غایۃ البیان کے نزدیک بھی اذانِ ثانی منبر کے سامنے مسجد کے اندر ہی ہوتی تھی جیسا کہ "بين يدي المنبر" کے الفاظ سے مترشح ہے۔

([1]) غایۃ البیان، باب صلاۃ الجمعۃ (۱/۱۰۹)

([2]) غایۃ البیان، باب صلاۃ الجمعۃ (۱/۱۱۳)

رہ گئی مالکیہ کی بات تو وہ ہم حنفیوں کے خلاف حجت نہیں ہے۔ مزید یہ کہ مالکیہ کا مرکز دیار مغرب یعنی اندلس تھا جو امویوں اور عباسیوں کے تسلط سے آزاد رہا۔

حاشیہ سفطی کے حوالے سے جو یہ بات کہی گئی ہے کہ مغربی ممالک کے لوگ آج تک مسجد کے باہر ہی اذان دے رہے ہیں تو ذرا حاشیہ سفطی کا بھی جائزہ لے لیں، اس کے الفاظ یہ ہیں: و الحاصل أن البيع حرام عند الأذان الثانی سواء كان الأذان علي المنارة كما كان في الزمن القديم وعليه أهل المغرب إلي الآن أو كان بين يدي الامام كما هو في بلادنا الآن إلا أن فعله بين يدي الامام مكروه كما نص عليه البرزلي، و قد نهى عنه مالك و أما فعله على المنارة و الإمام جالس فهو المشروع انتهي سكندري[1]

یعنی حاصل گفتگو یہ ہے کہ خرید و فروخت اذان ثانی کے وقت حرام ہے خواہ اذان منارہ پر ہو جیسا کہ قدیم زمانے میں ہوتی تھی اور اہل مغرب آج تک اس اذان کو منارہ پر ہی دے رہے ہیں یا اذان امام کے سامنے ہو جیسا کہ ہمارے ملکوں میں ہوتی ہے، اگرچہ امام کے سامنے اذان دینا مکروہ ہے جیسا کہ برزلی نے اس کی صراحت کی ہے اور امام مالک نے منع فرمایا ہے البتہ امام جب منبر پہ بیٹھ جائے اس وقت منارے کے اوپر اذان دینا درست ہے۔

اس حاشیہ میں جہاں یہ بات کہی گئی ہے کہ اہل مغرب آج تک اس اذان کو منارہ پر ہی دے رہے ہیں وہیں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ "ہمارے ملکوں میں یہ اذان مسجد کے اندر ہوتی تھی" اور صاحب حاشیہ علامہ شیخ یوسف بن سعید بن اسماعیل (وفات: ۱۱۹۳ھ) مصر کے رہنے والے تھے، گویا کہ مصر میں یہ اذان مسجد کے اندر ہوتی تھی اور یہ سب جانتے ہیں کہ مصر عہد قدیم ہی سے اسلامی علوم و فنون کا مرکز رہا

([1]) حاشیۃ السفطی علی شرح ابن ترکی علی العشماویۃ، باب صلاۃ الجمعۃ، ص: ۱۵۳)

ہے اور یہاں اپنے اپنے دور کے چوٹی کے علما گزرے ہیں اور کسی نے وہاں آج تک اس کے خلاف تحریک نہیں چلائی، یہی وجہ ہے کہ آج بھی وہاں ہر چھوٹی بڑی مسجد میں یہ اذان مسجد کے اندر ہی بالکل منبر کے سامنے ہوتی ہے، جس کو یقین نہ ہو وہاں جاکر دیکھ لیں یا وہاں کے رہنے والوں سے دریافت کرلیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ صاحب حاشیہ نے اذان ثانی کے متعلق یہ کہا کہ یہ اذان منارہ پر ہوتی تھی لہٰذا جو لوگ اس اذان کو مسجد سے باہر کرنے پر بضد ہیں انہیں چاہیے کہ اس اذان کو خطیب کے سامنے دینے کی بجائے صاحبِ حاشیہ کے بقول منارہ پر دیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ علامہ یوسف بن سعید مالکی ہیں، اسی لیے مصر میں ہو رہے عمل پر اپنی کراہت کا اظہار فرما رہے ہیں اور دلیل کے طور پر مالکیہ کا قول نقل کر رہے ہیں، احناف کا نہیں، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اذان ثانی کے مقام و محل کے حوالے سے اہل مغرب مالکیوں کا منہج، عالم اسلام کے دیگر بلاد سے الگ رہا ہے۔ اہل اندلس کا طریقہ، عالم اسلام کے دیگر خطوں سے مختلف رہا جہاں غیر مالکیوں کا تسلط تھا۔

کیا جمہور امت کا اتفاق ہے کہ اذانِ ثانی داخل مسجد دینا بدعت و مکروہ ہے؟

سوال (۵) آپ نے لکھا ہے کہ اذانِ ثانی خارج مسجد کے قائلین چند علما رہے ہیں حالانکہ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی چاروں مذہب کی جمہور امت کا اتفاق ہے کہ جمعہ کی اذان ثانی مسجد سے باہر دینا سنت اور مسجد کے اندر دینا بدعت و مکروہ ہے۔ اور مسجد کے اندر اذانِ ثانی دینے کی بنیاد جس ہشام پر رکھی گئی ہے وہ ایک ظالم و جابر بادشاہ تھا لہٰذا اس کا فعل قابل تقلید کیسے ہو سکتا ہے؟

جواب: یہ حقیقت ہے کہ اذانِ ثانی خارج مسجد کے قائلین میں چند ہی علما کے نام ملتے ہیں، علامہ ابن رشد مالکی، علامہ ابن الحاج مالکی، امام شاطبی مالکی، علامہ عبدالحی فرنگی محلی، فاضل بریلوی اور علامہ ناصر الدین البانی۔ ان چھ علما کے علاوہ کوئی اور اس

کے قائل نہیں ہے۔ اور آپ کا یہ کہنا کہ "حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی چاروں مذہب کے جمہور امت کا اتفاق ہے کہ جمعہ کی اذان ثانی مسجد سے باہر دینا سنت اور مسجد کے اندر دینا بدعت ومکروہ ہے" یہ بات قابل غور ہے کیوں کہ احناف میں سے کسی نے خاص اِس اذان کو مسجد کے اندر دینے کو بدعت ومکروہ نہیں کہا ہے البتہ پنج وقتہ اذان کے بارے میں احناف کا مذہب یہ ہے کہ اذان ایسی جگہ سے دی جائے جہاں سے لوگوں کو زیادہ سنائی دے مثلا منارہ، چھت یا مسجد کے دروازے پر۔

اور مالکیہ میں سے امام ابن الحاج مالکی، ابن رشد قرطبی مالکی، امام شاطبی مالکی نے اس اذان کو مسجد کے اندر ہونے کو بدعت کہا ہے۔ میرے مطالعہ کی حد تک ان کے علاوہ کسی نے اس اذان کو بدعت نہیں کہا ہے بلکہ خود امام مالک رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی مدینہ کا معمول یہی تھا کہ یہ اذان مسجد کے اندر ہوتی تھی لیکن آپ نے کبھی یہ فتوی نہیں دیا کہ یہ بدعت ہے اور نہ اس اذان کے باہر ہونے کی مہم چلائی۔

اور شافعیہ، حنابلہ میں سے کسی ائمہ نے اِس اذان کے مسجد کے اندر ہونے کو بدعت نہیں کہا ہے بلکہ امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں پسند کرتا ہوں کہ یہ اذان "عند المنبر" ہونا چاہیے۔(1) اور فقہ حنبلی کی مشہور کتاب "کشاف القناع عن متن الاقناع" میں ہے:(وَالْأَفْضَلُ) أَنْ يَكُونَ الْأَذَانُ بَيْنَ يَدَيْ الْخَطِيبِ (مِنْ مُؤَذِّنٍ وَاحِدٍ) لِعَدَمِ الْحَاجَةِ إلَى الزِّيَادَةِ لِأَنَّهُ لِإِعْلَامِ مَنْ فِي الْمَسْجِدِ وَهُمْ يَسْمَعُونَهُ۔[2]

یعنی خطیب کے سامنے ایک ہی مؤذن کا اذان دینا افضل ہے، مزید کی کوئی حاجت نہیں ہے؛ کیوں کہ اس کے ذریعہ سے انہی کو باخبر کرنا ہے جو مسجد میں موجود

(1) أُحِبُّ أَنْ يَكُونَ لِلْجُمُعَةِ أَذَانٌ وَاحِدٌ عِنْدَ الْمِنْبَرِ وَيُسْتَحَبُّ أَنْ يَكُونَ الْمُؤَذِّنُ وَاحِدًا. المجموع شرح المھذب، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (۱۲۴/۳)

(2) کشاف القناع عن متن الاقناع، باب صلاۃ الجمعۃ، فصل یسن ان یغتسل للجمعۃ (۴۲/۲)

ہیں اور وہ لوگ ایک مؤذن کی آواز سن رہے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حنابلہ کے نزدیک بھی اذان ثانی مسجد کے اندر ہوتی تھی۔

رہا آپ کا یہ ارشاد کہ مسجد میں اذانِ ثانی دینے کی بنیاد جس ہشام پر رکھی گئی ہے وہ ایک ظالم و جابر بادشاہ تھا لہٰذا اس کا فعل قابل تقلید کیسے ہو سکتا ہے؟ اس پر عرض ہے کہ ہم ہشام کے مقلد نہیں ہیں، اس سے ہمیں کوئی سرو کار نہیں بلکہ ہم دوسری صدی کی ابتدا سے لے کر ابھی تک جتنے علما و مشائخ گزرے ہیں ان کے مقلد ہیں جنہوں نے اس اذان کو مسجد کے اندر برقرار رکھا اور بدعت و خلافِ سنت نہیں کہا بلکہ سنتِ اذان کے موافق بتایا۔

کیا جمعہ کی اذان ثانی کا مقصود دور تک آواز پہنچانا کبھی نہیں رہا؟

سوال (۶) کیا آپ نے یہ لکھا ہے کہ جمعہ کی اذان ثانی کا مقصود دور تک آواز پہنچانا کبھی نہیں رہا؟ اگر ایسا ہے تو پھر حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کے دَور تک یہ اذان مسجد سے باہر کیوں ہوتی تھی؟

جواب: میری عبارت کو سیاق و سباق سے ہٹا کر اس کا اختراعی مفہوم اخذ کیا گیا ہے، میں نے یہ نہیں لکھا ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ سے ہی اِس اذان کا مقصود دور تک آواز پہنچانا نہیں تھا بلکہ میں نے یہ لکھا ہے کہ جب سے اذان ثانی کو داخل مسجد کر دیا گیا، اس وقت سے اس اذان کا مقصود دور تک آواز پہنچانا کبھی نہ رہا، کیوں کہ اگر اس اذان کا مقصود دور تک آواز پہنچانا ہوتا تو پھر آج کے زمانے میں اس اذان کو لاؤڈ اسپیکر سے دیتے، جب کہ جو لوگ اس اذان کو باہر دیتے ہیں، وہ بھی لاؤڈ اسپیکر سے نہیں دیتے بلکہ صرف اذانِ اول کو لاؤڈ اسپیکر سے دیتے ہیں، اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ صرف اذان اول ہی سے دور تک آواز پہنچانا مقصود ہے، اذان ثانی سے دور تک آواز پہنچانا مقصود نہیں ہے۔ میری کتاب کی پوری عبارت یہ ہے: ''**اوائل قرن ثانی**

میں یہ محسوس کرلیا گیا کہ اب جمعہ کے دن پہلی اذان سے دور دور آواز پہنچ جاتی ہے، اسی لیے **دوسری اذان کو مسجد کے اندر کردی گئی تاکہ حاضرین سنن ونوافل ترک کرکے خطبہ سننے کے لیے تیار ہوجائیں**، یہی وجہ ہے کہ **آج لاؤڈ اسپیکر کے زمانے میں بھی خطبہ کی اذان لاؤڈ اسپیکر سے نہیں دی جاتی ہے**، جس سے فریقین پر واضح ہے کہ اس اذان کا مقصود دور تک آواز پہنچانا کبھی نہیں رہا۔ اور **جب یہ اذان صرف مسجد کے اندر موجود لوگوں ہی کے لیے رہ گئی تو اب** اندر اذان دینا مکروہ نہیں ہوگا"

نمایاں کی ہوئی عبارت کو دیکھیں کہ اس عبارت سے میری کیا مراد تھی اور کیا مراد لے لی گئی ہے۔

"امداد" کی عبارت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

سوال (۷) آپ نے علامہ شامی کے تعلق سے لکھا ہے کہ انہوں نے "امداد" کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر کسی امر عام کی وجہ سے سب کی نماز قضا ہوگئی ہو تو مسجد میں اذان دے کر نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے، حالانکہ انہوں نے نہ مسجد کے باہر اذان دینے کی بات کہی ہے اور نہ مسجد کے اندر، انہوں نے تو صرف یہ بتایا کہ امر عام کی وجہ سے سارے لوگوں کی نماز قضا ہوگئی ہو تو اذان دے کر مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔

جواب: علامہ شامی نے "امداد" کی عبارت نقل کی ہے جس میں یہ صاف لکھا ہے: إِذَا كَانَ التَّفْوِيتُ لِأَمْرٍ عَامٍّ فَالْأَذَانُ فِي الْمَسْجِدِ لَا يُكْرَهُ لِانْتِفَاءِ الْعِلَّةِ[1] جب کسی امر عام کی وجہ سے لوگوں کی نماز فوت ہوجائے تو مسجد میں اذان دینا مکروہ نہیں ہوگا کیوں کہ یہاں مکروہ ہونے کی علت مفقود ہے۔

اس عبارت کا سیاق یہ ہے کہ صاحب تنویر الابصار نے فرمایا تھا کہ مسجد میں قضا

([1]) رد المحتار علی الدر المختار، کتاب الصلاۃ، فائدۃ التسلیم بعد الاذان (۱/۳۹۱)

نماز پڑھی جائے تو اس کے لیے اذان سنت نہیں ہے ،اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے صاحب در مختار نے لکھا تھا کہ ''کیوں کہ اذان دینے سے لوگوں کو تشویش اور مغالطہ ہوگا ''اس پر صاحب امداد نے فرمایا کہ جب امر عام کی وجہ سے نماز قضا ہو جائے تو مسجد کے اندر اذان دے کر نماز پڑھنے میں کوئی کراہت نہیں ہوگی کیوں کہ جب مسجد سے باہر آواز نہیں جائے گی تو کسی کو تشویش بھی نہیں ہوگی۔

علامہ ابن حجر عسقلانی کا رد اور اس کا جواب

سوال (۸) آپ نے لکھا ہے کہ پنج وقتہ نماز کی اذان کا مقصود دور دور تک آواز پہنچانا ہے لیکن جمعہ کی اذانِ ثانی کا مقصود اب صرف یہ رہ گیا ہے کہ جو لوگ مسجد میں آچکے ہیں اور وہ نماز یا دیگر اوراد و وظائف میں مشغول ہیں، انھیں یہ اطلاع دے دی جائے کہ اب وہ لوگ خطبہ سننے کی طرف متوجہ ہوں۔اور اس بات پر آپ نے مہلب اور علامہ ابن حجر عسقلانی کی عبارت سے استدلال کیا ہے جبکہ علامہ ابن حجر عسقلانی نے خود مہلب کا رد کر دیا اور علامہ ابن حجر عسقلانی ایک متاخر شافعی ہیں اور فقہ کا یہ مسئلہ کسی کتاب میں نہیں۔اور جب اس اذان کا مقصود صرف انصات رہ گیا تو گویا کہ عہد رسالت میں اذان ہوئی ہی نہیں۔اور یہ بات کسی سے متصور نہیں ہو سکتا۔

جواب: یہ بات درست ہے کہ جب سے اذان ثانی کو داخل مسجد کیا گیا ہے تب سے اس کا مقصود صرف حاضرین کو خطبہ سننے کی طرف متوجہ کرنا رہ گیا ہے جیسا کہ علامہ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے اور میں نے بطور استدلال علامہ عسقلانی ہی کی عبارت پیش کی ہے اور علامہ عسقلانی نے جو مہلب کا رد کیا ہے میں اس سے خود متفق ہوں بلکہ میرا موقف بھی یہی ہے کہ عہد رسالت میں اس اذان کا مقصود اعلام ہی تھا، اسی وجہ سے وہ دروازہ پر ہوتی تھی، لیکن جب سے یہ اذان داخل مسجد ہوئی اس وقت سے یہ صرف انصات کے لیے رہ گئی۔

آپ نے علامہ ابن حجر عسقلانی (۷۷۳ھ) کے بارے میں یہ کہہ کر ان کی بات رد کردی ہے کہ وہ ایک متاخر شافعی عالم ہیں، اس پر عرض ہے کہ اوائل قرن ثانی ہی سے اس پر علما و مشائخ عمل پیرا رہے ہیں جو خود اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ اذان صرف انصات کے لیے ہے اور پھر یہ کہ داخل مسجد اذان دینے کی حکمت اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے! یہی نا کہ یہ انصات کے لیے ہو، بس اسی حکمت کو علامہ عسقلانی نے اپنی مایہ ناز کتاب ''فتح الباری'' میں رقم فرمایا ہے۔ اسی طرح فقہ حنبلی کی مشہور کتاب ''کشاف القناع عن متن الاقناع'' میں ہے: (وَالْأَفْضَلُ) أَنْ يَكُونَ الْأَذَانُ بَيْنَ يَدَيْ الْخَطِيبِ (مِنْ مُؤَذِّنٍ وَاحِدٍ) لِعَدَمِ الْحَاجَةِ إلَى الزِّيَادَةِ لِأَنَّهُ لِإِعْلَامِ مَنْ فِي الْمَسْجِدِ وَهُمْ يَسْمَعُونَهُ[1] یعنی خطیب کے سامنے ایک ہی مؤذن کا اذان دینا افضل ہے، مزید کی کوئی حاجت نہیں ہے؛ کیوں کہ اس کے ذریعہ سے انہی کو باخبر کرنا ہے جو مسجد میں موجود ہیں اور وہ لوگ ایک مؤذن کی آواز سن رہے ہیں۔ اس عبارت سے بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اذان ثانی کا مقصود دور تک آواز پہنچانا نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی کیا بوالعجبی ہے! کہ جب اِس اذان کو بدعت ثابت کرنا تھا تو ابن الحاج مالکی (۷۳۷ھ) ابن رشد مالکی (متوفی: ۵۲۰ھ) امام شاطبی مالکی (۷۹۰ھ) کا سہارا لیا گیا جو کون متقدمین احناف میں سے ہیں؟ یہ سب بھی تو غیر احناف اور متاخرین مالکیہ ہیں، اسی طرح یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اہل مغرب اب تک اس اذان کو مسجد سے باہر ہی دیتے ہیں، شیخ یوسف بن سعید بن اسماعیل کو بطور دلیل پیش کیا گیا تو کیا یہ متقدمین احناف میں سے ہیں؟ بلکہ یہ تو متاخرین در متاخرین میں سے ہیں اور مذہباً مالکی، غیر حنفی ہیں، ان کی وفات ۱۱۹۳ ہجری میں ہوئی ہے یعنی یہ بارہوی صدی کے اواخر کے ہیں۔ تو جب ان لوگوں کی بات قابل قبول ہے تو علامہ ابن حجر کی بات قابلِ قبول کیوں نہیں ہو سکتی؟

([1]) کشاف القناع عن متن الاقناع، باب صلاۃ الجمعۃ، فصل یسن ان یغتسل للجمعۃ (۴۲/۲)

رہ گئی یہ بات کہ ”جب اس اذان کا مقصود صرف انصات رہ گیا تو گویا کہ عہد رسالت میں اذان ہوئی ہی نہیں“ تو یہ الزام بھی بے بنیاد ہے کیوں کہ ہم خود ثابت کر چکے ہیں کہ عہد رسالت میں جب ایک ہی اذان ہوتی تھی تو اسی سے اعلام و انصات کا کام لیا جاتا تھا اور حضرت عثمانِ غنی کے زمانے سے اوائل قرن ثانی تک پہلی اذان اعلام اور دوسری اعلام و انصات کے لیے تھی لیکن اوائل قرن ثانی کے بعد پہلی اذان اعلام اور دوسری صرف انصات کے لیے باقی رہ گئی۔

کیا پنج وقتہ اذانیں مسجد کے اندر دینا مطلقاً مکروہ ہے؟

سوال (۹) آپ اذان ثانی کو ذکر الٰہی ہونے کی وجہ سے مسجد کے اندر دینے، دلانے کو مکروہ نہیں سمجھتے ہیں تو پھر پنج وقتہ اذانوں کے اندرون مسجد دینے، دلانے کو مکروہ کیوں سمجھتے ہیں؟ کیا صرف جمعہ کی اذان ثانی ہی ذکر الٰہی ہے، پنج وقتہ اذانیں ذکر الٰہی نہیں ہیں؟

جواب: اذان ثانی کے ذکر الٰہی ہونے کی وجہ سے مسجد کے اندر دینے، دلانے کو مکروہ کیسے سمجھا جائے! مسجد بنتی ہی اس لیے ہے کہ وہاں ذکر کیا جائے، تو ذکر مسجد میں نہ ہوگا تو پھر کہاں ہوگا؟ ہم تو پنج وقتہ اذانوں کے بھی مسجد کے اندر دینے، دلانے کو مطلقاً ناپسند نہیں کرتے بلکہ اس صورت میں اندرونِ مسجد اذان دینے کو ناپسند کرتے ہیں جس صورت میں آواز دور تک نہ پہنچ سکے مثلاً مسجد بڑی ہو تو اندر اذان دینے سے آواز دور تک نہیں پہنچے گی، اور فقہا نے اسی علت کی بنا پر پنج وقتہ اذانیں اندر دینے سے منع کیا ہے ورنہ اگر آواز دور تک پہنچ جائے جیسے آج کے زمانے میں مائک سے اذان دینے سے آواز دور تک پہنچ جاتی ہے تو پھر اندر دینے میں کوئی کراہت نہیں ہے کیوں کہ ہم بتا چکے ہیں کہ شرع کو جگہ مطلوب نہیں ہے بلکہ شرع کو صرف یہ مطلوب ہے کہ اذان کی آواز دور تک پہنچ جائے جو مائک سے حاصل ہے، مائک کے ذریعہ خواہ اندر

سے دی جائے یا باہر سے آواز کو جہاں تک پہنچنا رہے گا وہاں تک پہنچ ہی جائے گی، ایسا نہیں ہے کہ مائک کے ذریعہ اندر سے دیں گے تو آواز دور تک نہیں پہنچے گی اور باہر سے دیں گے تو دور تک پہنچ جائے گی۔ آج کل بہت ساری مسجدوں میں خاص کر مصر میں یہ دیکھا گیا ہے کہ مائک کا پورا سسٹم ہی منبر کے قریب ہوتا ہے، اسی لیے بلا کراہت وہیں اذان دی جاتی ہے۔

اسی طرح اگر مائک نہ ہو لیکن مسجد چھوٹی ہو تو بھی اندر سے اذان دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جیسا کہ صاحب مذہب امام اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ مسجد چھوٹی ہو تو اندر سے اذان دے دیا جائے تب بھی کافی ہے۔[1]

کیا ہندوستان کی ساری مسجدوں میں اذان ثانی مسجد کے اندر ہوتی تھی؟

سوال (۱۰) آپ کا یہ کہنا کہ ہندوستان کی ساری مسجدوں میں یہ اذان مسجد کے اندر ہوتی تھی، درست نہیں ہے کیوں کہ ہندوستان کی ساری مسجدوں میں یہ اذان کبھی بھی مسجد کے اندر نہیں ہوئی ہے جیسے دہلی کی جامع مسجد میں آج تک یہ اذان منبر سے کئی گز کے فاصلہ سے مئذنہ پر ہوتی ہے اور بہت سی مسجدوں میں یہ اذان اندرون ہوئی تو اس کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں: پہلی وجہ: کچھ مسجدوں میں دروازہ پر مئذنہ دیکھ کر لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ داخل مسجد ہے، اس طرح انہوں نے داخل داخل یکساں سمجھ کر پہلی صف میں کر لیا۔ جیسے لاؤڈ اسپیکر آجانے کے بعد کئی جگہوں پر لوگ پنج وقتہ اذانیں بھی اندرون مسجد ہی سے دیتے ہیں۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ

دوسری وجہ: بعض حضرات کو بین یدیہ کے لفظ سے دھوکا ہوا اور وہ یہ خیال نہ کر سکے کہ جس حدیث میں بین یدیہ ہے، اسی حدیث میں علی باب المسجد بھی ہے جو باہر ہونے کو بتا رہا ہے۔

---

(1) أحب ذَلِك الي أَن يُؤذن خَارِجا من الْمَسْجِد وَإِذا أذن فِي الْمَسْجِد أجزاه. الاصل المعروف بالمبسوط للشيباني، كتاب الصَّلَاة، بَاب من نسى صَلَاة ذكرهَا من الْغَد (۱/۱۴۱)

تیسری وجہ: کچھ لوگوں کو فقہ کی بعض کتابوں میں اس کی تعبیر لفظ "عند" سے کرنے کی بنا پر التباس ہو گیا اور وہ سمجھ گئے کہ اس سے تو "قرب" مفہوم ہو رہا ہے اور یہ خیال نہیں کیا کہ قرب امر اضافی ہے جو مسجد کے اندر اور باہر دونوں پر صادق ہے۔

چوتھی وجہ: بعض کتابوں میں مثلاً قدوری، فتح القدیر، وقایہ، کنز، ہدایہ وغیرہ میں:

الإقامة كالأذان، الإقامة مثل الأذان

اور نور الایضاح کے اندر خاص سنن خطبہ کے بیان میں: الجلوس على المنبر قبل الشروع في الخطبة والأذان بين يديه كالإقامة[1] کے الفاظ سے اشتباہ ہوا، حالانکہ یہ تشبیہ عددِ کلمات، ترتیب اور سنت ہونے میں ہے جیسا کہ بحر الرائق میں ہے: مثل الأذان في كونه سنة الفرائض فقط وفي عدد كلماته وفي ترتيبها[2]

اس طرح رفتہ رفتہ وہ اندر ہوتی گئی اور اسی کا رواج پڑ گیا۔

جن علما نے اسے سنت کے خلاف سمجھا انہوں نے حدیث کے بموجب عوام کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور جن بزرگوں پر یہ منکشف ہوا کہ اس "بدعت" کا ازالہ "فلاں" کے ہاتھ سے مقدر ہے، انہوں نے دوسری برائیوں کے مٹانے کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھی، جیسے بعض بدعتوں کا ازالہ پہلی صدی کے مجدد حضرت عمر بن عبد العزیز کے ہاتھوں سے ہونا مقدر تھا تو حضرات صحابہ و تابعین کے دور میں ان کا قلع قمع نہیں ہوا۔ اور جن بدعتوں کا ازالہ حضور غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں ہونا مقدر تھا تو ان سے پہلے کے بزرگوں نے ان کا قلع قمع نہیں کیا، لہٰذا پرانے علما اور مشائخ پر کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ جو لوگ اس مسئلہ کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد بھی اپنی پرانی روش پر قائم رہیں وہ ضرور تارک سنت ہیں۔

([1]) نور الایضاح، الخطبۃ، وسننھا (ص: ۸۴)

([2]) البحر الرائق، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (۱/۲۷۰)

جواب: آپ کا یہ کہنا کہ ہندوستان کی ساری مسجدوں میں یہ اذان کبھی بھی مسجد کے اندر نہیں ہوئی، اعلی حضرت فاضل بریلوی کے فتوے کے خلاف ہے؛ کیوں کہ فاضل بریلوی نے خود اپنے مکتوب میں لکھا ہے کہ "فقیر کا یہ فتوی ۲۲ [۱۳ھ] میں 'تحفہ حنفیہ' میں چھپ کر ملک میں شائع ہوچکا۔ نہ علما نے انکار فرمایا، نہ جہال نے شور مچایا"[1]

اس مکتوب کا مطلب یہ ہے کہ جب فاضل بریلوی نے اس اذان کو اپنے فتوے کے ذریعہ مسجد سے باہر کیا تو علما نے انکار نہیں کیا اور جاہلوں نے شور نہیں مچایا، اگر یہ اذان بعض مسجدوں میں باہر ہی ہوتی تو علما کے انکار نہ کرنے اور جہال کے شور مچانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ کیوں کہ ان کو پہلے ہی سے پتہ ہوتا کہ اذان باہر بھی ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر بعض مسجدوں میں یہ اذان باہر ہی ہوتی تھی وہ بھی دہلی کی جامع مسجد میں جو شروع سے ابھی تک مرجعِ عوام و خواص ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سنت زندہ تھی تو پھر فاضل بریلوی نے کس مردہ سنت کو زندہ کیا، حالانکہ آپ خود ہی اپنے فتاوی میں لکھتے ہیں کہ: الحمدللہ! یہاں اس سنتِ کریمہ کا احیاء رب عزوجل نے اس فقیر کے ہاتھ پر کیا۔[2]

پھر یہ کہ آپ نے جامع مسجد دہلی کی جو مثال دی ہے کہ وہاں ابھی بھی اذان مئذنہ پر ہوتی ہے تو اس پر کیا دلیل ہے کہ وہاں ہمیشہ سے اذان مئذنہ پر ہی ہوتی رہی ہے اور سابق توارث کو نہیں بدلا گیا ہے؟ جب کہ فاضل بریلوی کے فتوے کے بعد ہندوستان کی بہت سی مسجدوں میں سابق توارث کو بدل دیا گیا تو ممکن ہے کہ جامع مسجد دہلی کے سابق توارث کو بھی بدل دیا گیا ہو۔ واللہ أعلم بالصواب

اور آپ نے جو اندر اذان دینے کی چار وجہیں لکھیں ہیں تو پہلی وجہ کے جواب

([1]) مکتوبات امام احمد رضا بریلوی (ص:۷۹)
([2]) فتاوی رضویہ (۵۰۱/۸)

میں عرض ہے کہ جب لوگ آج بھی مئذنہ کو مسجد نہیں سمجھتے ہیں تو یہ کہنا کیسے صحیح ہوگا کہ لوگ مئذنہ کو مسجد سمجھ کر اذان کو منبر کے پاس لے گئے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ صرف آپ کا ذہنی مفروضہ ہے، قدیم زمانے میں اذان داخل مسجد ہونے کے دستاویزی ثبوت کے بعد اس قسم کے مفروضات کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔

اور لاؤڈ اسپیکر سے پنج وقتہ اذانیں مسجد کے اندر دیے جانے پر جو آپ نے لا حول پڑھا ہے، اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی حرامِ قطعی کا ارتکاب ہوگیا ہو۔ لاحول و لا قوۃ إلا باللہ! خیر اس حوالے سے بتادیں کہ فقہانے پنج وقتہ اذانیں مسجد کے اندر دینے سے اس لیے منع کیا ہے کہ اس سے آواز دور تک نہیں پہنچے گی لیکن جب لاؤڈ اسپیکر سے اذان دی جائے گی تو خواہ مسجد کے اندر سے دی جائے یا باہر سے، آواز دور تک پہنچ ہی جائے گی، لہٰذا لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے مسجد کے اندر اذان دینے میں کوئی حرج نہیں ہوگا جیسے کے مسجد چھوٹی ہو تو اذان اس کے باہر سے بھی دے سکتے ہیں اور اندر سے بھی۔

دوسری وجہ کے جواب میں عرض ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک مختصر حدیث جس کے الفاظ یہ ہیں: كَانَ يُؤَذَّنُ بَيْنَ يَدَيْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا جَلَسَ عَلَى الْمِنْبَرِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ عَلَى بَابِ الْمَسْجِدِ، وَأَبِي بَكْرٍ، وَعُمَرَ[1] [آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب منبر پر تشریف رکھتے تو مؤذن آپ کے سامنے مسجد کے دروازے پر اذان دیتا تھا، اسی طرح حضرت ابو بکر، حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں بھی ہوتا تھا] اس حدیث میں "بين يديه" کے الفاظ بھی ہیں اور "على باب المسجد" کے الفاظ بھی ہیں تو "بين يديه" کے الفاظ پر نظر گئی اور "على باب المسجد" کے الفاظ پر نظر نہیں گئی، وہ بھی اوائل قرن ثانی سے لے کر اب تک

([1]) سنن ابی داود، کتاب الجمعۃ، باب النداء یوم الجمعۃ، ح: ۱۰۸۸)

کے علماو مشائخ کی۔ یہ فلسفہ میری سمجھ سے باہر ہے۔

تیسری وجہ کے جواب میں عرض ہے کہ آپ کا یہ کہنا کہ ''بعض کتابوں میں لفظ ''عند'' کی تعبیر سے کچھ لوگوں کو التباس ہوگیا'' درست نہیں ہے۔ ان کو التباس نہیں ہوا بلکہ ان لوگوں نے عند کا حقیقی معنی سمجھا، اس سلسلے میں کیا عجب کہ خود آپ ہی التباس کا شکار ہوں۔

چوتھی وجہ کہ قدوری، فتح القدیر، وقایہ، کنز، ہدایہ وغیرہ کے الفاظ سے اشتباہ ہوا، اس پر عرض ہے کہ ان مذکورہ کتابوں کی عبارت ''الإقامة كالأذان، الإقامة مثل الأذان'' سے کسی کو اشتباہ نہیں ہوا اور ہوتا بھی کیسے کہ کوئی بھی اِس مذکورہ عبارت سے داخل مسجد اذان کو ثابت ہی نہیں کرتا۔ اور آپ کا یہ کہنا کہ نور الایضاح کے الفاظ ''والجلوس على المنبر قبل الشروع في الخطبة والأذان بين يديه كالإقامة [1] سے اشتباہ ہوا، تو یہ بھی درست نہیں ہے۔ صاحب نورالایضاح نے جو اس اذان کے لیے ''بین یدیہ'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں، ان سے اندرون مسجد ہی مراد ہے جیسا کہ امام طحطاوی نے مراقی الفلاح کے حاشیہ میں اس کی صراحت کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: كذا ''الجلوس على المنبر قبل الشروع في الخطبة والأذان بين يديه'' جرى به التوارث ''كالإقامة'' بعد الخطبة[2]

یعنی خطبہ شروع ہونے سے پہلے منبر پر بیٹھنا اور اس کے سامنے اذان دینا- اسی پر توارث جاری ہے- جیسے کہ خطبہ کے بعد اقامت کہنا۔

یہاں پر امام طحطاوی نے جو یہ فرمایا ہے کہ اسی پر توارث جاری ہے، اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ بین یدیہ سے مراد اندرون مسجد ہی ہے اور اذان اندرون مسجد ہی ہوتی تھی کیوں کہ اذان اگر اندرون مسجد نہ ہوتی تو ''اسی پر توارث جاری ہے'' کہنے

([1]) نور الایضاح، الخطبۃ، وسننھا (ص: ۸۴)

([2]) حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح شرح نور الایضاح: باب الجمعۃ، سنن الخطبۃ، ص: ۵۱۵)

کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ کہنے کی ضرورت اسی لیے پیش آئی ہے کہ یہ اذان عہد نبوی میں دروازے پر ہوتی تھی لیکن اوائل قرن ثانی ہی سے اکابر علما و مشائخ اس اذان کو اندرون مسجد دینے لگے اور پھر اسی کا توارث ہو گیا۔

آپ کے بیان کردہ چاروں وجہوں کے تعلق سے ایک عمومی بات یہ عرض کر دوں کہ آپ نے بار بار یہ کہا کہ لوگوں نے داخل داخل یکساں سمجھ لیا، ان کو دھوکہ ہو گیا، وہ خیال نہ کر سکے، التباس ہو گیا، اشتباہ ہو گیا، تو کیا تقریباً چودہ سو صدیوں میں جتنے اکابر علما و مشائخ ہوئے اور جنہوں نے اس اذان کو اندرون مسجد برقرار رکھا، سب کو دھوکہ ہو گیا، وہ سب خیال نہ کر سکے، ان سب کو التباس اور اشتباہ ہو گیا؟ التباسات پر مشتمل یہ بات بالکل ہی عقل میں آنے والی نہیں ہے۔

اور آپ نے کہا کہ جن علما نے اسے سنت کے خلاف سمجھا، انہوں نے حدیث کے بموجب عوام کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جیسے بعض بدعتیں حضرات صحابہ و تابعین کے دور میں ہوتی رہیں لیکن بعد میں ان کو حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے ختم کیا وغیرہ لہٰذا پہلے والے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن جو پرانی روش پر قائم رہیں وہ تارک سنت ہیں۔ اس پر عرض ہے کہ یہ بات تو سمجھ میں آنے والی ہے کہ عوام اگر کسی بدعت میں مبتلا ہو جائیں اور علما و مشائخ اسے ختم کرنے کی طاقت نہ رکھیں تو وہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں لیکن یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کہ خود علما و مشائخ بھی اس بدعت میں مبتلا ہوں، نعوذ باللہ من ذالک۔

جیسے حضرات صحابہ و تابعین کے دور میں جو بدعتیں تھی جن کا ازالہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے کیا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نعوذ باللہ حضرات صحابہ و تابعین بھی ان بدعتوں کے مرتکب تھے۔ اسی طرح جن بدعتوں کا ازالہ حضرت غوث پاک رضی اللہ عنہ نے کیا تو کیا نعوذ باللہ حضرت غوث پاک بھی پہلے

ان بدعتوں میں ملوث تھے۔ لیکن آپ اندرون مسجد اذان ثانی کو جو بدعت کہہ رہے ہیں جن کا ازالہ فاضل بریلوی نے کیا تو آپ کے بقول یہ وہ بدعت ہے جس پر دوسری صدی کی ابتدا سے لیکر فاضل بریلوی کے دور تک جتنے بھی علما و مشائخ گزرے ہیں بلکہ خود فاضل بریلوی کے آبا و اجداد بھی اس بدعت پر عمل پیرا رہے ہیں۔ جب کہ حضور ﷺ کی حدیث: إِنَّ أُمَّتِي لَا تَجْتَمِعُ عَلَى ضَلَالَةٍ، فَإِذَا رَأَيْتُمُ اخْتِلَافًا فَعَلَيْكُمْ بِالسَّوَادِ الْأَعْظَمِ [1] کے مطابق اس امت کا سواد اعظم یعنی بڑی جماعت گمرہی پر جمع نہیں ہو سکتی، جب کہ بدعت کا ارتکاب گمرہی ہے لہٰذا ہمیں یہ تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے کہ اندرون مسجد اذان ثانی دینا بدعت نہیں ہے، ورنہ سواد اعظم کو بدعتی قرار دینا لازم آئے گا۔

آپ نے یہ فرمایا کہ اپنی پرانی روش پر قائم رہنے والا تارک سنت ہے تو جان لیں کہ ہم اپنی پرانی روش پر قائم نہیں ہیں بلکہ علما و مشائخ اور فاضل بریلوی کے بقول اکابر علما کی روش پر قائم ہیں، تو جس طرح یہ لوگ تارک سنت نہیں تو ہم کیسے تارک سنت ہو سکتے ہیں۔ اگر اس مسئلہ میں ہم پر ترک سنت کا الزام لگے گا تو پھر یہی الزام اگلوں پر بھی منجر ہو گا۔ اللہ بچائے اکابرین پر بدعت اور ترک سنت کا الزام و اتہام لگانے سے۔

کیا چاروں مذاہب میں داخلِ مسجد اذان دینے کا کوئی ثبوت نہیں ہے؟

سوال (۱۱) اہل سنت کے چاروں مذہبوں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی میں سے کسی مذہب میں مسجد کے اندر اذان دلانے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

جواب: جامع فقہ حنفی امام محمد حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کا مذہب مبسوط میں بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: أحب ذَلِك الي أَن يُؤذن خَارِجا من الْمَسْجِد

([1]) میری امت گمرہی پر جمع نہیں ہوگی، چنانچہ جب تم اختلاف دیکھو، تو سواد اعظم کی پیروی لازم جانو [سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب السواد الاعظم، ح: ۳۹۵۰]

وَإِذا أذن فِي الْمُسْجِد أجزاه[1] میں یہ پسند کرتا ہوں کہ مسجد سے باہر نکل کر اذان دے اور اگر مسجد کے اندر ہی اذان دے دی جائے تب بھی کافی ہے۔

امام اعظم کے اس قول پر غور کریں کہ آپ فرما رہے ہیں کہ مسجد کے اندر بھی اذان دے دی جائے تب بھی کافی ہے، لہٰذا یہ کہنا کیسے درست ہو گا کہ آپ کے نزدیک داخل مسجد اذان دینے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

اور حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: الأذان بين يدي الإمام ليس من الأمر القديم[2] یعنی امام کے سامنے اذان دینا قدیم معاملہ نہیں ہے۔

حضرت مالک رضی اللہ عنہ کے اس قول سے یہ واضح ہے کہ امام کے سامنے مسجد کے اندر اذان دینا اگرچہ عہد رسالت میں نہیں تھا لیکن ان کے زمانے میں یہی مدینہ کا معمول بن گیا تھا۔ اس لیے علامہ ابن عبد البر مالکی (۴۶۳-۳۶۸ھ) لکھتے ہیں:

إذا جلس الإمام على المنبر فإن أذن مؤذن في صومعة وأذن غيره بين يدي الإمام فلا بأس ...[3]

یعنی جب امام منبر پر بیٹھ جائے تو اگر ایک مؤذن منارہ سے اذان دے اور دوسرا امام کے سامنے سے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اور امام شافعی فرماتے ہیں: أُحِبُّ أَنْ يَكُونَ لِلْجُمُعَةِ أَذَانٌ وَاحِدٌ عِنْدَ الْمِنْبَرِ وَيُسْتَحَبُّ أَنْ يَكُونَ الْمُؤَذِّنُ وَاحِدًا[4]

یعنی میں یہ پسند کرتا ہوں کہ جمعہ کے لیے منبر کے پاس [کئی اذانوں کی جگہ] ایک ہی اذان ہو اور [اذان واقامت کے لیے] مستحب ہے کہ مؤذن بھی ایک ہی ہو۔

([1]) الاصل المعروف بالمبسوط للشيباني، كتاب الصَّلَاة، بَاب من نسي صَلَاة ذكرهَا من الْغَد (۱۴۱/۱)
([2]) الكافي في فقه اهل المدينة: باب صلاة الجمعة (۲۵۰/۱)
([3]) الكافي في فقه اهل المدينة: باب صلاة الجمعة (۲۵۰/۱)
([4]) المجموع شرح المهذب، كتاب الصلاة، باب الاذان (۱۲۴/۳)

لہٰذا مالکیہ اور شافعیہ کے حوالے سے بھی یہ کہنا کہ ان کے نزدیک داخلِ مسجد اذان دینے کا کوئی ثبوت نہیں، یہ درست نہیں ہے۔

اور اب حنابلہ کا بھی مذہب ملاحظہ فرمالیں۔ فقہ حنبلی کے مستند اور زبردست فقیہ علامہ ابن قدامہ حنبلی اپنے مشہور زمانہ کتاب ''المغنی'' میں فرماتے ہیں: وَقَدْ يَكُونُ النِّدَاءُ بَيْنَ يَدَيْ الْمِنْبَرِ، فَلَا يَسْمَعُهُ إلَّا مَنْ فِي الْجَامِعِ. یعنی کبھی اذان منبر کے سامنے ہوتی ہے تو اس اذان کو صرف وہی سنتے ہیں جو مسجد میں ہوتے ہیں۔[1]

اسی طرح آپ ''الشرح الکبیر علی متن المقنع'' میں فرماتے ہیں:

وقد يكون النداء بين يدي المنبر فلا يسمعه إلا أهل المسجد.

کبھی اذان منبر کے سامنے ہوتی ہے تو اس اذان کو صرف مسجد والے ہی سنتے ہیں۔[2]

اس عبارت کا پس منظر یہ ہے کہ مسئلہ یہ تھا کہ جمعہ کی نماز کس پر فرض ہے؟ تو جواب دیا گیا کہ جو اذان کی آواز سنے اس پر فرض ہے۔ اس پر علامہ ابن قدامہ حنبلی نے معارضہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگ بہرے ہوتے ہیں، بعض لوگ سوئے ہوئے ہوتے ہیں، بعض لوگ غفلت میں ہوتے ہیں، اسی طرح کبھی اذان مسجد کے اندر ہوتی ہے جیسے اذان ثانی، جس کو صرف اہل مسجد ہی سنتے ہیں تو کیا ان لوگوں پر جمعہ فرض نہیں ہوگا؟

ابن قدامہ کی اس عبارت سے واضح ہے کہ اذان ثانی مسجد کے اندر ہوتی تھی، لہٰذا

([1]) المغنی، کتاب صلاۃ الجمعۃ، فصل: مقدار البعد الذی تلزم فیہ الجمعۃ (۲/۲۱۴) یہاں پر ''قد'' اپنے سیاق کی وجہ سے آیا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کبھی اذان ثانی مسجد کے اندر ہوتی ہے اور کبھی باہر، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اذان کبھی باہر ہوتی ہے جس کو سب لوگ سنتے ہیں جیسے پنج وقتہ نماز کی اذانیں اور کبھی اذان مسجد کے اندر ہوتی ہے جیسے اذان ثانی جس کو صرف اہل مسجد ہی سنتے ہیں۔

([2]) الشرح الکبیر علی متن المقنع، باب صلاۃ الجمعۃ، مسئلۃ: وھی واجبۃ علی کل مسلم (۲/۱۴۸)

یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ حنابلہ کا مذہب بھی اندرون مسجد اذان ثانی کے جواز کا ہے۔

اسی طرح فقہ حنبلی کی مشہور کتاب "کشاف القناع عن متن الاقناع" میں ہے:

(وَالْأَفْضَلُ) أَنْ يَكُونَ الْأَذَانُ بَيْنَ يَدَيْ الْخَطِيبِ (مِنْ مُؤَذِّنٍ وَاحِدٍ) لِعَدَمِ الْحَاجَةِ إلَى الزِّيَادَةِ لِأَنَّهُ لِإِعْلَامِ مَنْ فِي الْمَسْجِدِ وَهُمْ يَسْمَعُونَهُ[1]

یعنی خطیب کے سامنے ایک ہی مؤذن کا اذان دینا افضل ہے، مزید کی کوئی حاجت نہیں ہے؛ کیوں کہ اس کے ذریعہ سے انہی کو باخبر کرنا ہے جو مسجد میں موجود ہیں اور وہ لوگ ایک مؤذن کی آواز سن رہے ہیں۔

اس عبارت سے بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اذان ثانی مسجد میں دینا جائز ہے۔

کیا غوث پاک، داتا علی ہجویری... سے داخل مسجد اذان کا ثبوت ہرگز نہیں ہے؟

سوال (۱۲) حضور غوث پاک، حضرت داتا علی ہجویری، حضرت خواجہ غریب نواز، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر، حضرت بختیار کاکی، حضرت نظام الدین محبوب الٰہی، حضرت مخدوم علاء الحق پنڈوی، حضرت مخدوم بہار شیخ شرف الدین احمد بن یحی منیری، حضرت مخدوم جہاں گیر سمنانی رضی اللہ عنہ سے یہ ہرگز ثابت نہیں کہ انہوں نے کبھی مسجد کے اندر اذان دی ہو یا دلوائی ہو۔

جواب: حضور غوث پاک رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب "الغنیہ" میں اذانِ ثانی کے لیے "عند المنبر" کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ آپ کا عمل بھی اذان ثانی اندرون مسجد ہی دینے کا رہا ہے۔ اور حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کی درگاہ اور اجمیر معلی میں تو آج بھی یہ اذان اندر ہی ہوتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ دونوں بزرگوں کا بھی معمول یہی رہا ہوگا، اور دوسری بات یہ ہے کہ فاضل بریلوی

([1]) کشاف القناع عن متن الاقناع، باب صلاۃ الجمعۃ، فصل یسن ان یغتسل للجمعۃ (۴۲/۲)

کے فتوی سے پہلے غیر منقسم ہندوستان میں اندرون مسجد اذان ثانی دینے دلانے کا توارث چلا آرہا تھا تو غالب گمان یہی ہے کہ یہ بزرگان دین بھی اسی توارث پر عمل پیرا رہے ہوں گے لیکن آپ کے پاس کون سی دلیل ہے کہ یہ لوگ خارج مسجد اذان دے رہے تھے ؟صرف کہنے سے کوئی چیز ثابت نہیں ہوتی، دلیل درکار ہے۔

کیا مسجد کے اندر اذان دینے کا توارث نص کے خلاف ہے ؟

سوال (۱۳) اب جو بعض بلاد میں مسجد کے اندر اذان دینے اور دلانے پر تعامل و توارث ہوگیا ہے تو یہ تعامل و توارث حادث ہے جو سنت مستمرہ اور نص تقریری کے خلاف ہے، اس لیے نہ تو وہ حجت ہے نہ اس کے مطابق عمل جائز ہے۔

جواب: یہ تعامل و توارث سنت مستمرہ اور نص کے خلاف نہیں ہے، اذان میں سنت یہ ہے کہ اس کی آواز دور تک جائے، اس لیے سنت میں جگہ کی قید نہیں لگائی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ اذان عہد رسالت میں مختلف جگہوں سے ہوتی رہی ہے، اور نص میں کہیں بھی اندر اذان دینے کی ممانعت نہیں ہے لہٰذا یہ اگرچہ حادث ہے لیکن سنت مستمرہ اور نص کے خلاف نہیں ہے اور جو حادث نص کے خلاف نہ ہو وہ قابل حجت ہوتی ہے۔

کیا مسجد کے اندر اذان دینا سنت مستمرہ کے خلاف اور بدعت ہے ؟

سوال (۱۴) اصرار کے ساتھ مسجد کے اندر اذان دینا اور دلوانا سنت مستمرہ کے خلاف، بدعت سیئہ اور مکروہ و گناہ ہے۔

جواب: مسجد کے اندر اذان دینا، دلوانا سنت کے خلاف نہیں بلکہ سنتِ اکابر علما و مشائخ ہے، جس کا توارث اوائلِ قرن ثانی سے چلا آرہا ہے جیسا کہ علامہ بدرالدین عینی حنفی نے صاحب ہدایہ کی عبارت: وأذن المؤذنون بين يدي المنبر، بذلك جرى التوارث، کی تشریح میں فرماتے ہیں: (بذلك) ش: أي بالأذان بين

يدي المنبر بعد الأذان الأول على المنارة.[1] منبر کے سامنے اذان دینے پر توارث ہے جو مینارہ پر پہلی اذان دینے کے بعد دی جاتی ہے۔ اور علامہ شامی حنفی نے خاص اس اذان ثانی کے بارے میں لکھا کہ اذان ثانی مسجد کے اندر دینا بدعت حسنہ ہے، آپ رقم طراز ہیں: لِأَنَّ الْمُتَوَارَثَ لَا يَكُونُ مَكْرُوهًا ، وَكَذَلِكَ نَقُولُ فِي الْأَذَانِ بَيْنَ يَدَيْ الْخَطِيبِ فَيَكُونُ بِدْعَةً حَسَنَةً إذْ مَا رَآهُ الْمُؤْمِنُونَ حَسَنًا فَهُوَ حَسَنٌ[2] توارث مکروہ نہیں ہوتا جیسے اذان خطبہ مسجد کے اندر خطیب کے سامنے دینا بدعت حسنہ ہے کیوں کہ جسے مومنین اچھا جانیں وہ اچھا ہے۔

علامہ ابن عابدین کا خطیب کے سامنے خطبہ کی اذان کو بدعت حسنہ کہنا یہ ثابت کرتا ہے کہ بین یدی الخطیب سے ان کی مراد مسجد کے اندر اذان کا ہونا ہے ورنہ بدعت کہنا لغو ہو جائے گا۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ بین یدی الخطیب سے مراد دروازہ پر اذان دینا ہوتا تو علامہ شامی نے اس اذان ثانی کے لیے بین یدی الخطیب/المنبر کے الفاظ کئی جگہوں پر استعمال کیے ہیں لیکن کہیں بھی علی باب المسجد کا ذکر نہیں ہے بلکہ فقہ کی تمام کتابوں میں اس اذان ثانی کے لیے کہیں بھی خواہ فقہ حنفی ہو، مالکی ہو، شافعی ہو، حنبلی ہو، علی باب المسجد کا ذکر نہیں ہے بلکہ بین یدی الخطیب/المنبر یا عند المنبر/الخطیب یا علی المنبر جیسے الفاظ آئے ہیں، جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اس سے مراد اندرون مسجد ہی ہے ورنہ کبھی تو علی باب المسجد یا اس کے ہم معنی الفاظ آتے اور تیسری بات یہ ہے کہ ''منبر کے سامنے'' اس کی تعبیر فصیح عربی میں مذکورہ الفاظ کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے!

لہٰذا جب یہ بدعت حسنہ ہے، جس کو دوسرے لفظوں میں سنت حسنہ کہا جاتا ہے تو پھر یہ بدعت سیئہ کیسے ہو سکتی ہے؟ اور جب یہ علامہ شامی کے بقول مکروہ نہیں ہے تو گناہ کا ترتب کیسے ہو سکتا ہے؟

([1]) البنایۃ شرح الہدایۃ، کتاب صلاۃ الجمعۃ، باب البیع والشراء بعد اذان الجمعۃ الاول (۹۰/۳)
([2]) رد المحتار علی الدر المختار، کتاب الصلاۃ، فائدۃ التسلیم بعد الاذان (۳۰۹/۱)

بعض لوگ شامی کی عبارت '' الْأَذَانِ بَيْنَ يَدَيْ الْخَطِيبِ'' کو اذانِ جوق [1] پر محمول کرتے ہیں جو بالکل درست نہیں ہے، کیوں کہ علامہ شامی نے ''وَكَذَلِكَ نَقُولُ'' کہہ کر اذانِ جوق سے تشبیہ دی ہے کہ جس طرح اذانِ جوق عہد رسالت میں نہ تھی لیکن وہ متوارث ہے اور متوارث مکروہ نہیں ہوتا اسی طرح خطیب کے سامنے والی اذان عہد رسالت میں نہ تھی لیکن یہ بھی متوارث ہے اور متوارث مکروہ نہیں ہوتا بلکہ جسے مومنین اچھا سمجھیں وہ اچھا ہوتا ہے۔

([1])اذان کی آواز دور تک پہنچانے کے لیے ایک ساتھ کئی مؤذنوں کا اذان دینا۔

اقامت

مسئلہ اقامت سے متعلق سوالات وجوابات

اقامت

امام طحطاوی کے موقف پر اعتراض اور اس کا جواب

سوال(۱) آپ نے امام طحطاوی کا موقف ذکر کیا ہے جب کہ ان کی عبارت سے ان کا موقف ثابت نہیں ہو رہا ہے، انہوں نے ''الظاھر'' کا لفظ استعمال کیا تھا جو ''شک'' کے لیے آتا ہے، نہ کہ موقف بتانے کے لیے۔

جواب: لفظ ''الظاھر'' کا استعمال صرف شک کے لیے نہیں ہوتا بلکہ لفظ الظاھر وہاں پر بھی استعمال کیا جاتا ہے جب عبارت کئی معانی کا احتمال رکھتی ہو، اور ان میں جو معنی سب سے راجح ہو، اس کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ مشہور حنبلی عالم شیخ الاسلام علی الاطلاق علامہ علاء الدین ابو الحسن علی بن سلیمان مرداوی (۸۱۷-۸۸۵ھ) اپنی مایہ ناز کتاب «الإنصاف في معرفة الراجح من الخلاف» جو امام ابن قدامہ کی کتاب ''المقنع'' کی شرح ہے، اس کے مقدمہ میں ابن قدامہ اور دوسرے متون کے مصنفین کی بعض عبارتوں کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: «الظَّاهِرُ» مِنْ الْكَلَامِ هُوَ: اللَّفْظُ الْمُحْتَمِلُ مَعْنَيَيْنِ فَأَكْثَرَ، هُوَ فِي أَحَدِهِمَا أَرْجَحُ. أَوْ مَا تَبَادَرَ مِنْهُ عِنْدَ إطْلَاقِهِ مَعْنًى، مَعَ تَجْوِيزِ غَيْرِهِ[1]

یعنی ''الظاھر'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ لفظ دو یا دو سے زائد معانی کا احتمال رکھتا ہے لیکن ان دونوں میں وہی معنی ارجح ہے یا اس لفظ کے اطلاق کے وقت اسی معنی کی طرف ذہن فوراً متبادر ہوتا ہے، اگرچہ دوسرے معنی کا احتمال بھی ہوتا ہے۔

([1]) الانصاف فی معرفۃ الراجح من الخلاف للمرداوی (۹/۱)

اس کا حاصل یہ ہوا کہ لفظ جب دو یا چند معانی کا احتمال رکھتا ہو، اور ان میں سے جو راجح ہو اس کو بتانے کے لیے " الظاهر "کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ امام طحطاوی حنفی کے سامنے دو طرح کی عبارتیں موجود تھیں، ایک مضمرات کی عبارت جس کو انہوں نے "مراقی الفلاح" کے حاشیہ میں ذکر کیا ہے -وہ عبارت یہ ہے: إذا أخذ المؤذن في الإقامة ودخل رجل المسجد فإنه يقعد ولا ينتظر قائما فإنه مكروه كما في المضمرات قهستاني ويفهم منه كراهة القيام إبتداء الإقامة والناس عنه غافلون[1]

اور دوسری "در مختار" کی عبارت -اور وہ عبارت یہ ہے: (وَالْقِيَامُ لِإِمَامٍ وَمُؤْتَمٍّ الخ) مسارعة لامتثال أمره و الظاهر أنه احترازعن التاخير لا التقديم حتى لو قام أول الاقامة لا بأس و حرر[2]

مذکورہ ان دونوں عبارتوں پر آپ نے اپنی رائے پیش کی ہے، چنانچہ آپ مضمرات کی عبارت کے حوالے سے لکھتے ہیں: «يفهم منه كراهة القيام ابتداء الإقامة والناس عنه غافلون» یعنی اس سے ابتدائے اقامت میں قیام کا مکروہ ہونا سمجھا جا رہا ہے، حالانکہ لوگ اس سے غافل ہیں۔ اور در مختار کی عبارت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

«مسارعة لامتثال أمره و الظاهر أنه احترازعن التاخير لا التقديم حتى لو قام أول الإقامة لا بأس و حرر» یعنی امتثال حکم میں جلدی کرنا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کو مستحب کہنا یہ تاخیر سے روکنا ہے، نہ کہ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے سے روکنا، لہٰذا کوئی اگر ابتدائے اقامت ہی میں کھڑا ہو جائے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں، خوب غور و فکر کر لو۔

([1]) حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح شرح نور الایضاح، کتاب الصلاۃ، فصل: من آدابھا (ص: ۲۷۸)
([2]) طحطاوی علی الدر المختار (۱/۲۱۵)

امام طحطاوی کے نزدیک مضمرات کی بات ضعیف تھی، اس لیے اس بات کو فعل مجہول کا صیغہ «يُفْهَمُ» سے بیان کیا، جو تضعیف کے لیے آتا ہے۔ اور در مختار کی عبارت سے جو مفہوم ہو رہا ہے وہ زیادہ راجح تھا، اس لیے اس کو "الظاهر" سے بیان کیا، جو ارجح کو بتانے کے لیے آتا ہے اور خوب غور و فکر کی دعوت دی ہے کہ خوب غور و فکر کر لو، یہی معنی زیادہ راجح ہے کہ اگر کوئی ابتدائے اقامت ہی میں کھڑا ہو جائے تو کوئی حرج نہ ہوگا۔

کیا حی علی الفلاح سے پہلے کھڑا ہونے والا عتاب کا مستحق ہوگا؟

سوال (۲) بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا ایسا ادب ہے جو سنت غیر موکدہ ہے، جیسا کہ "مالابد منہ" اور حاشیہ شلبی میں ہے، اور اس کے خلاف عمل کرنا مکروہ تنزیہی ہے اور مکروہ تنزیہی کا مرتکب عتاب کا مستحق ہوتا ہے، لہٰذا حی علی الفلاح سے پہلے کھڑا ہونے والا عتاب کا مستحق ہوگا۔

جواب: حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کو سنت غیر موکدہ کہنا درست نہیں، تمام فقہانے حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کو مستحبات سے شمار کیا ہے۔ مثلاً در مختار میں ہے:- [ولها آداب] تركه لا يوجب إساءة ولا عتابا كترك سنة الزوائد، لكن فعله أفضل [نظره إلى موضع سجوده حال قيامه... [والقيام] إمام ومؤتم [حين قيل حي على الفلاح][1] [اس کے چند آداب ہیں] جن کا ترک نہ اساءت کا موجب ہے اور نہ کسی عتاب کا، جیسے سنت زوائد کا ترک لیکن اس کا کرنا افضل ہے [نمازی کا قیام کی حالت میں اپنے سجدہ کی جگہ دیکھنا] [اور کھڑا ہونا] امام اور مقتدی کے لیے [جس وقت مکبر حی علی الفلاح کہے]

اور امام طحطاوی نے "إساءة" کی تشریح "کراهت تنزیہ" سے کی ہے[2] حاصل یہ

([1]) الدر المختار (۱/۵۱۵)

([2]) طحطاوی علی الدر المختار، باب صفۃ الصلاۃ (۱/۲۱۵)

ہوا کہ نماز کے کچھ آداب ہیں جن کا ترک نہ مکروہ تنزیہی کا موجب ہوتا ہے اور نہ کسی عتاب کا، انہی میں سے حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا ہے، لہٰذا اس کو کوئی ترک بھی کر دے تو وہ نہ مکروہ تنزیہی کا ارتکاب کرنے والا ہوگا اور نہ اس کی وجہ سے وہ کسی عتاب کا مستحق ہوگا۔

رہ گئی بات یہ کہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اپنی کتاب ''مالابد منہ'' میں حی علی الصلاۃ پر کھڑے ہونے کو سنت کہا ہے، تو یہ ایک غلط فہمی ہے کیوں کہ انہوں نے ایک فصل قائم کی ہے اور فرمایا ہے ''طریقِ خواندنِ نماز بروجہ سنت آنست'' اور پھر اس کے تحت نماز ادا کرنے کا مکمل طریقہ بتایا ہے، جس میں واجب جیسے سورہ فاتحہ پڑھنا، سنت جیسے اذان دینا، مستحب جیسے نماز میں سجدہ گاہ پر نظر رکھنا وغیرہ۔ ان ساری چیزوں کو ایک ساتھ اس فصل میں بیان کیا ہے، اسی فصل میں حی علی الصلاۃ پر کھڑے ہونے کو بھی بیان کیا گیا ہے جو در حقیقت مستحب ہے جس کو تمام فقہا نے اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے، لیکن بعض لوگ عبارتِ مذکورہ میں لفظِ سنت دیکھ کر غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور انہوں نے اس کو سنت سمجھ لیا، حالانکہ حقیقت میں یہ سنت نہیں ہے بلکہ مستحب ہے اور اگر کسی کو یہ ضد ہو کہ قاضی صاحب نے اس کو سنت ہی شمار کیا ہے جیسا کہ انہوں نے لکھا ''طریقِ خواندنِ نماز بروجہ سنت آنست کہ اذان گفتہ شود و اقامت و نزد حی علی الصلاۃ امام برخیزد و نزد قد قامت الصلاۃ تکبیر گوید''[1] یعنی سنت کے مطابق نماز ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اذان ہو، اقامت ہو، امام حی علی الصلاۃ پر کھڑا ہو، اور قد قامت الصلاۃ پر تکبیر کہے۔ قاضی صاحب کی اس عبارت سے حی علی الصلاۃ پر کھڑے ہونے کو سنت ثابت کرنے والوں کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ وہ قد قامت الصلاۃ پر تکبیر کہنے کو بھی اس عبارت سے سنت مانیں جو ''نزد حی علی الصلاۃ امام برخیزد'' سے متّصل ہے اور اس کے تارک پر بھی یہ حکم لگائیں کہ وہ مکروہ تنزیہی کا ارتکاب کرنے والا ہے۔ میرے علم کے مطابق کسی بھی مسجد میں اس پر عمل نہیں ہے، لہٰذا تمام

([1]) مالابد منہ (ص:۳۶)

مصلیان سنت کے خلاف عمل کر رہے ہیں اور مکروہ تنزیہی کے مرتکب ہو رہے ہیں، ایسا حکم لگانا فقاہت سے بہت دور ہے۔

اسی طرح حاشیہ شلبی سے بھی حی علی الصلاۃ پر قیام کے سنت ہونے کی دلیل دی جاتی ہے کہ حاشیہ شلبی میں "الوجیز" کے حوالے سے مذکور ہے کہ "والسنة أن يقوم الإمام و القوم إذا قال المؤذن حي على الفلاح "یعنی سنت یہ ہے کہ امام اور قوم اس وقت کھڑے ہوں جب مکبر حی علی الفلاح کہے۔

اس حوالے سے عرض یہ ہے کہ یہاں پر سنت اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں ہے بلکہ یہاں وہ مستحب کے معنی میں ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ حاشیہ، تبیین الحقائق پر لگائی گئی ہے اور تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق میں یہ مسئلہ آداب نماز کے تحت ذکر کیا گیا ہے، اصل عبارت یہ ہے (الْقِيَامُ حِينَ قِيلَ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ)؛ لِأَنَّهُ أَمَرَ بِهِ فَيُسْتَحَبُّ الْمُسَارَعَةُ إلَيْهِ[1] اس پر شیخ شہاب الدین شلبی نے حاشیہ لگاتے ہوئے وجیز کے حوالے سے لکھا کہ سنت یہ ہے کہ امام اور قوم اس وقت کھڑے ہوں جب مکبر حی علی الفلاح کہے۔ لہٰذا یہاں سنت ادب ہی کے معنی میں ہے، کیوں کہ کبھی کبھی ادب کو بھی سنت کہہ دیا جاتا ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے: قال وتسمية الله تعالى في ابتداء الوضوء لقوله عليه الصلاة والسلام لا وضوء لمن لم يسم الله والمراد به نفي الفضيلة والأصح أنها مستحبة وإن سماها في الكتاب سنة[2] یعنی وضو شروع کرتے وقت بسملہ پڑھنا، کیوں کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ اس کا وضو ہی نہیں جس نے بسملہ نہیں پڑھا۔ اس سے مراد فضیلت کی نفی کرنا ہے، اور اصح یہ ہے کہ بسملہ پڑھنا مستحب ہے اگرچہ اس کو کتاب یعنی قدوری میں سنت کہہ دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مستحب کو بھی کبھی سنت کہہ دیا جاتا ہے، لہٰذا

([1]) تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق وحاشیۃ الشلبی، کتاب الصلاۃ، آداب الصلاۃ (۱۰۸/۱)
([2]) الھدایۃ شرح البدایۃ، کتاب الطھارات (۱۲/۱)

وجیز میں بقول شیخ شہاب الدین شلبی کے مستحب پر سنت کا اطلاق کر دیا گیا ہے ،اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وجیز جو امام محمد بن شہاب البزاز الکردری کی تصنیف ہے جس کو الفتاوی البزازیہ بھی کہا جاتا ہے، اس میں بھی اس مسئلہ کو مستحب ہی کہا گیا ہے چنانچہ وجیز موسوم بہ فتاوی بزازیہ میں ہے:إذا كان الإمام والقوم في المسجد الأحب قيام لكل عند قول المؤذن حيّ على الفلاح عند الكل[1]

جب امام اور مقتدی مسجد میں موجود ہوں تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس وقت کھڑے ہوں، جب مکبر حی علی الفلاح کہے، یہ سب کے نزدیک ہے۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ حی علی الصلاۃ پر قیام کرنا مستحب ہی ہے۔

برسبیل تنزل اگر کوئی یہ کہے کہ حی علی الصلاۃ پر قیام کرنا سنت غیر موکدہ ہی ہے، تو یہ بھی ذہن نشیں رہے کہ اس کے تارک پر کوئی عتاب بھی نہیں ہے ، بہار شریعت میں ہے:

سنت غیر مؤکدہ:وہ یہ کہ نظر شرع میں ایسی مطلوب ہو کہ اس کے ترک کو ناپسند رکھے مگر نہ اس حد تک کہ اس پر وعید عذاب فرمائے عام ازیں کہ حضور سید عالم ﷺ نے اس پر مداومت فرمائی یا نہیں، اس کا کرنا ثواب اور نہ کرنا اگرچہ عادۃً ہو موجب عتاب نہیں۔[2]

اس میں صاف لفظوں میں یہ بات کہی گئی ہے کہ سنت غیر موکدہ کے ترک پر، اگرچہ یہ ترک عادۃً ہی کیوں نہ ہو، کوئی عتاب نہیں ہے، لہٰذا اگر کوئی حی علی الصلاۃ سے پہلے ہی کھڑا ہو جاتا ہے تو وہ مستحق عتاب نہیں ہوگا۔

اسی طرح یہ کہنا کہ شروع اقامت میں قیام کرنا مکروہ تنزیہی ہے اور اس کا مرتکب عتاب کا مستحق ہوتا ہے تو یہ بھی محل نظر ہے، کیوں کہ ارشاد الفحول، الابہاج اور

([1])الفتاوی البزازیہ او الجامع الوجیز فی مذہب الامام الاعظم ابی حنیفۃ النعمان (۱/۲۷)

([2])بہار شریعت، جلد اول، حصہ دوم (ص:۲۸۳)

نہایۃ السول شرح منہاج الوصول میں ہے: والمکروہ: مایمدح تارکہ، ولا یذم فاعلہ. [1] یعنی جس کے نہ کرنے والے کی مدح کی جاتی ہے اور کرنے والے کی مذمت نہیں کی جاتی۔

یہ جواب اس وقت ہے جب ہم یہ تسلیم کرلیں کہ حی علی الصلاۃ پر ہی قیام کرنا مستحب ہے، اس سے پہلے نہیں، ورنہ تو صحیح بات یہ ہے کہ شروع اقامت ہی سے نماز کے لیے کھڑا ہونا مستحب ہے جو قد قامت الصلاۃ تک باقی رہتا ہے۔ اس کے بعد استحباب ختم ہو جاتا ہے، صرف اباحت باقی رہ جاتی ہے۔ جیسا کہ امام طحطاوی حنفی "درمختار" کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

(والقیام لإمام و مؤتم الخ) مسارعة لامتثال أمره والظاهر أنه احترازعن التأخیر لا التقدیم حتی لو قام أول الإقامة لا بأس. [2]

(امام اور مقتدی کا کھڑا ہونا) یعنی مکبر کی آواز پر لبیک کہنا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کو مستحب کہنا یہ تاخیر سے روکنا ہے، نہ کہ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے سے روکنا، لہٰذا کوئی اگر ابتدائے اقامت ہی میں کھڑا ہو جائے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔

صاحب مضمرات کا قیام عند الاقامۃ کو مکروہ لکھنا تسامح کیسے ہے؟

سوال (۳) مالابد منہ اور طحطاوی علی الدر میں لکھا ہے کہ اقامت کی ابتدا میں کھڑا نہ ہونا سنت غیر مؤکدہ ہے اور سنت غیر موکدہ کا خلاف کرنا مکروہ تنزیہی ہے تو پھر صاحب مضمرات کا اس کو مکروہ لکھنا ان کا تسامح کیسے ہے؟ جب کہ آپ نے ان کے مکروہ لکھنے کو ان کا تسامح بتایا ہے۔

جواب: سب سے پہلے یہ جان لیں کہ صاحب مضمرات نویں صدی کے

([1]) ارشاد الفحول (۲۶/۱) الابہاج (۵۹/۱) نہایۃ السول شرح منہاج الوصول (ص: ۲۴)
([2]) طحطاوی علی الدر المختار (۲۱۵/۱)

اوائل کے ہیں اور صاحبِ مالابد منہ اور امام طحطاوی دونوں تیرہویں صدی کے اوائل کے ہیں [1] ان لوگوں کا مکروہ لکھنا صاحب مضمرات کے لیے دلیل نہیں بن سکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ صاحبِ مالابد منہ نے حی علی الصلاۃ پر کھڑے ہونے کو سنت سے نہیں بلکہ آدابِ نماز سے شمار کیا ہے جس کا خلاف کراہت تنزیہ کو مستلزم نہیں اور امام طحطاوی نے تو "در مختار" کے حاشیہ میں خود لکھا ہے کہ اگر کوئی شروع اقامت ہی میں کھڑا ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ [2]

رہا صاحب مضمرات کا تسامح تو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثر "خَرَجَ عَلِيٌّ، وَقَدْ أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ وَهُمْ قِيَامٌ يَنْتَظِرُونَهُ، فَقَالَ: مَا لِي أَرَاكُمْ سَامِدِينَ؟" [3] سے جو امام کی موجودگی میں ابتدائے اقامت میں قیام کی کراہت ثابت کرنا چاہا ہے اس سے کراہت ثابت نہیں ہوتی؛ کیوں کہ اس اثر میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد سے باہر تھے، جب مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ لوگ آپ کے انتظار میں کھڑے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ تم لوگ حیران و پریشان کیوں کھڑے ہو؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب امام مسجد میں نہ ہو، تو اس کے انتظار میں کھڑا نہیں ہونا چاہیے، اس سے امام کی موجودگی میں ابتدائے اقامت میں قیام کی کراہت ثابت کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

کیا عامۂ تابعین ابتدائے اقامت میں قیام کو مکروہ سمجھتے تھے؟

سوال (۴) آپ نے لکھا ہے کہ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کی کراہت کا قول صاحب مضمرات سے پہلے نہیں ملتا، جب کہ حضرت حسن بصری، ابن سیرین اور حضرت معاویہ بن قرہ کے بقول عامۂ تابعین ابتدائے اقامت میں کھڑے

([1]) یوسف بن عمر بن یوسف صوفی کادوری (متوفی: ۸۳۲ھ) صاحب مالابد منہ، قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی، متوفی: ۱۲۲۵ھ - حاشیہ طحطاوی علی الدر، احمد بن محمد بن اسماعیل الطحطاوی الحنفی متوفی (۱۲۳۱ھ)

([2]) طحطاوی علی الدر المختار (۱/۲۱۵)

([3]) مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الصلوات، فی القوم یقومون اذا اقیمت الصلاۃ قبل ان یجیء الامام، ۱/۳۵۶

ہوجانے کو مکروہ سمجھتے تھے، لہٰذا یہ کہنا کیسے درست ہوگا کہ صاحب مضمرات سے پہلے کراہت کا قول نہیں ملتا، حالانکہ یہ سب تابعین عظام ہیں، جو ظاہر ہے کہ صاحب مضمرات سے پہلے کے ہیں۔

جواب: میری بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ صاحب مضمرات سے پہلے کسی سے بھی کراہت کا قول نہیں ملتا۔ رہا ان مذکورہ شخصیات کے حوالے سے یہ کہنا کہ یہ لوگ کراہت کے قائل تھے، تو یہ مغالطہ پر مبنی ہے، وہ اس لیے کہ حضرت حسن بصری اور حضرت ابن سیرین رضی اللہ عنہما کی کراہت کی یہ روایت "الاستذکار" سے لی گئی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: عن الحسن وابن سِيرِينَ أَنَّهُمَا كَانَا يَكْرَهَانِ أَنْ يَقُومَا حَتَّى يَقُولَ الْمُؤَذِّنُ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ[1] یعنی حضرت حسن بصری اور ابن سیرین قد قامت الصلاۃ سے پہلے کھڑے ہونے کو مکروہ سمجھتے تھے۔

اسی سطر سے متّصل ہی نیچے والی سطر میں حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے ہی دوسری روایت موجود ہے، الفاظ یہ ہیں: وَقَالَ فَرْقَدُ السَّبَخِيُّ لِلْحَسَنِ أَرَأَيْتَ إِذَا أَخَذَ الْمُؤَذِّنُ فِي الْإِقَامَةِ أَأَقُومُ أَمْ حَتَّى يَقُولَ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ فَقَالَ الْحَسَنُ أَيُّ ذَلِكَ شِئْتَ[2] یعنی فرقد سبخی نے حضرت حسن بصری سے دریافت کیا کہ مکبر کے اقامت شروع کرتے ہی میں کھڑا ہو جاؤں یا قد قامت الصلاۃ کہنے کے بعد کھڑا ہوں؟ آپ نے فرمایا: تم جو چاہو کرو۔

اس روایت میں حضرت فرقد سبخی کے دریافت کرنے پر آپ نے ان کو حکم شرعی سے آگاہ فرمایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک حکم شرعی یہی تھا کہ ابتدا میں کھڑا ہو یا حی علی الصلاۃ کے وقت، سب درست ہے، اور مذکورہ بالا روایت میں

([1]) الاستذکار، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی النداء للصلاۃ (۱/۳۹۱)

([2]) الاستذکار، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی النداء للصلاۃ (۱/۳۹۱)

جو آپ سے کراہت منقول ہے ،اِس کواُس صورت پر محمول کیا جاسکتا ہے جب امام مسجد میں موجود نہ ہو،اور اس کے انتظار میں کھڑا ہواجائے، جیساکہ اس کی ممانعت بخاری کی حدیث سے ثابت ہے، تاکہ ان کے اقوال میں تضاد نہ ہوسکے۔

اور حضرت معاویہ بن قرہ کے حوالے سے یہ کہنا کہ ان کے بقول عامۂ تابعین اقامت کے شروع میں کھڑے ہونے کو مکروہ سمجھتے تھے، یہ بھی درست نہیں ہے کیوں کہ حضرت معاویہ بن قرہ کی جس روایت سے اقامت کے شروع میں کھڑے ہونے کی کراہت کا مسئلہ ثابت کیاجاتا ہے، اس سے یہ مسئلہ بالکل ثابت نہیں ہوتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت معاویہ بن قرہ کی یہ روایت مصنف عبدالرزاق سے ماخوذ ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ قُرَّةَ قَالُوا: كَانُوا يَكْرَهُونَ أَنْ يَنْهَضَ الرَّجُلُ إِلَى الصَّلَاةِ حِينَ يَأْخُذُ الْمُؤَذِّنُ فِي إِقَامَتِهِ[1]

یعنی حضرت معاویہ بن قرہ فرماتے ہیں کہ تابعین عظام مکروہ سمجھتے تھے کہ کوئی نماز کے لیے اس وقت کھڑا ہو جب مؤذن اقامت شروع کردے۔

اس روایت سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ مؤذن کے تکبیر کہنے کے وقت کوئی نماز جیسے نفل وسنت یا کوئی دوسرا فرض شروع نہیں کرنا چاہیے۔

اس عبارت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نماز کو جماعت سے ادا کرنے کے لیے شروع اقامت میں کھڑا ہونا مکروہ ہے کیوں کہ اگر مذکورہ بالا عبارت میں نماز کو جماعت سے ادا کرنے کے لیے شروع اقامت میں کھڑے ہونے کو مکروہ بتایا جاتا تو اس کراہت کی انتہا بھی اسی کے ساتھ درج ہوتی مثلاً «حتی یقول المؤذن قد قامت الصلاۃ» وغیرہ

یہ جواب بھی اس عبارت کو صحیح تسلیم کرلینے کی صورت میں ہے، ورنہ تو مصنف عبدالرزاق کا دوسرا نسخہ جو مصر سے طبع ہے، اس میں " يَأْخُذُ الْمُؤَذِّنُ فِي

([1]) مصنف عبدالرزاق، کتاب الصلاۃ، باب الرجل متی یقوم للصلاۃ اذا سمع الاذان (۱/۴۸۰)

إِقَامَتِهِ کی جگہ يَأْخُذُ الْمُؤَذِّنُ فِي أَذَانِهِ'' ہے[1] جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں مؤذن سے مراد مکبر نہیں بلکہ مؤذن ہی ہے، اور تکبیر کہنا مراد نہیں بلکہ اذان دینا ہی مراد ہے، اور قرین قیاس بھی یہی ہے کہ یہاں مؤذن کا اذان دینا ہی مراد ہو، نہ کہ مکبر کا تکبیر کہنا کیوں کہ امام عبد الرزاق نے اس روایت کو «باب الرجل متى يقوم للصلاة إذا سمع الأذان» کے تحت ذکر کیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی نماز کے لیے کب کھڑا ہو جب اذان سنے؟ اس باب کے یہ معنی نہیں کہ مکبر جب تکبیر کہے تو مقتدی نماز کے لیے کب کھڑا ہو؟

اس باب کے تحت مُصَنّف نے صرف دو ہی روایتیں پیش کی ہیں اور دونوں ہی اذان سے ہی متعلق ہیں نہ کہ تکبیر سے متعلق - ایک روایت وہ جو ماقبل میں گزری اور دوسری روایت وہ ہے جو حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، آپ فرماتی ہیں: كَانَ فِي بَيْتِهَا فَسَمِعَ الْمُؤَذِّنَ فَقَالَ كَمَا يَقُولُ: فَلَمَّا قَالَ: حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، نَهَضَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى الصَّلَاةِ[2]

یعنی حضور ﷺ آپ کے حجرۂ مبارکہ میں آرام فرما تھے، جب اذان سنی تو آپ نے اذان کا جواب دیا، جب مؤذن نے حی علی الصلاۃ کہا تو آپ نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس حدیث سے بھی صاف واضح ہے کہ مؤذن سے مراد اذان دینے والا ہی ہے، نہ کہ تکبیر کہنے والا اور حضور ﷺ اذان سن کر ہی نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہو ئے تھے نہ کہ تکبیر سن کر۔

ان دونوں روایتوں کے علاوہ کوئی اور روایت پیش نہیں کی ہے جو تکبیر سے متعلق ہو، بلکہ تکبیر سے متعلق متعدّد روایتیں امام عبد الرزاق نے اپنی اسی کتاب میں

([1]) مصنف عبد الرزاق، کتاب الصلاۃ، باب الرجل متی یقوم للصلاۃ اذا سمع الاذان (۲/۲۹)

([2]) مصنف عبد الرزاق، کتاب الصلاۃ، باب الرجل متی یقوم للصلاۃ اذا سمع الاذان (۱/۴۸۱)

جلد ۱/ صفحہ ۵۰۴ پر «باب قيام الناس عند الإقامة» [اقامت کے وقت لوگوں کے قیام کا باب] میں ذکر کی ہیں، لہٰذا اگر معاویہ بن قرہ کی روایت کا مفہوم یہی ہوتا کہ مکبر کے حی علی الصلاۃ کہنے سے پہلے کھڑا ہونا مکروہ ہے تو پھر امام عبد الرزاق اس روایت کو «باب قيام الناس عند الإقامة» کے تحت لاتے۔

مذکورہ دلائل کی روشنی میں یہ بات مکمل طور سے ثابت ہوگئی کہ حضرت معاویہ بن قرہ والی روایت کا تعلق "تکبیر" سے نہیں ہے بلکہ "اذان" سے ہے، لہٰذا اِس روایت سے تکبیر کے وقت کھڑے ہونے کی کراہت ثابت کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

بعض صحابہ و تابعین اور مجتہدینِ ثلاثہ کا عند الفلاح پر قیام کی توضیح

سوال (۵) اگر ابتدائے اقامت میں کھڑا ہونا مکروہ نہیں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت انس بن مالک، حضرت امام حسین، حضرت عطا رضی اللہ عنہم مطلقاً حی علی الصلاۃ/حی علی الفلاح پر کھڑے ہوتے تھے، بلکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ تو قد قامت الصلاۃ سے پہلے کھڑے ہونے والے کو بیٹھا دیتے تھے اور پھر حضرت امام اعظم، امام ابو یوسف، امام محمد، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کیسے حی علی الصلاۃ کے بعد ہی کھڑے ہونے کو مستحب قرار دیتے تھے؟

جواب: حضرت انس، امام حسین، حضرت عطا، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کے حی علی الصلاۃ/الفلاح پر کھڑے ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ابتدا میں کھڑا ہونا مکروہ ہے، کیوں کہ ان نفوس قدسیہ سے کوئی ایسی روایت منقول نہیں ہے کہ جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ یہ لوگ ابتدا میں کھڑے ہونے کی کراہت کے قائل تھے اور نہ کوئی ایسی روایت ملتی ہے کہ جس میں یہ ہو کہ یہ لوگ ابتدا میں کھڑے نہیں ہوتے تھے بلکہ صرف روایتوں میں یہ ملتا ہے کہ یہ لوگ قد قامت الصلاۃ کے وقت کھڑے ہوتے تھے۔ اس سے صرف زیادہ سے زیادہ قد قامت الصلاۃ کے وقت کھڑے ہونے کا استحباب ثابت ہوگا، اور اس کے ہم بھی قائل ہیں کہ کھڑے ہونے کا استحباب ابتدا

سے لے کر قد قامت الصلاۃ تک رہتا ہے، لہٰذا اس درمیان میں جب بھی کھڑا ہوا جائے استحباب ہی پر عمل ہوگا۔ہاں! اس سے زیادہ تاخیر کرنے سے استحباب ختم ہوجائے گا۔یہی وجہ ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے جو قد قامت الصلاۃ کے وقت کھڑے ہونے کی روایت منقول ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:عن أبي يعلى قال رأيت أنس بن مالك إذا قيل قد قامت الصلاة قام فوثب[1]

یعنی حضرت ابو یعلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ جب قد قامت الصلاۃ کہا گیا تو آپ تیزی کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔[2]

آپ تیزی کے ساتھ اسی لیے کھڑے ہوگئے کہ اب اس سے زیادہ تاخیر کرنا مناسب نہیں تھا،کیوں کہ اگر کھڑے ہونے کا استحباب قد قامت الصلاۃ کے بعد ہی شروع ہوتا تو پھر تیزی کے ساتھ کھڑے ہونے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔

اسی طرح حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ جب مؤذن نے قد قامت الصلاۃ کہا تو آپ کھڑے ہوگئے،آپ سے عرض کیا گیا کہ آپ بیٹھ جائیں، تاکہ لوگ صف لگالیں، تو آپ نے دوبارا رشاد فرمایا:''نماز قائم ہوچکی ہے، نماز قائم ہوچکی ہے''[3] اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ نماز قائم ہوچکی ہے،اب اس کے بعد بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔اور یہی میری رائے ہے کہ قد قامت الصلاۃ کے بعد بیٹھے رہنا مناسب نہیں ہے۔

([1])الاستذکار،کتاب الصلاۃ،باب ماجاء فی النداء للصلاۃ(۱/۳۹۱)

([2]) ''قام فوثب ''کا معنی '' تیزی کے ساتھ کھڑا ہونا''اس لیے کیا گیا ہے کہ وثب کا معنی کودنا،اچھلنا، چھلانگ لگانا ہوتا ہے، معنی ہوگا اچھلتے کودتے کھڑے ہوئے یعنی تیزی کے ساتھ کھڑے ہوئے۔لسان العرب(۱/۷۹۲)

([3])فَلَمَّا قَالَ: قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ، قَامَ حُسَيْنٌ، وَذَلِكَ بَعْدَ وَفَاةِ مُعَاوِيَةَ، وَأَهْلُ مَكَّةَ لَا إِمَامَ لَهُمْ، فَقَالَ لَهُ: اجْلِسْ حَتَّى يَصُفَّ النَّاسُ فَيَقُولُ: قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ- فی روایة-مَرَّتَيْنِ۔مصنف عبدالرزاق(۱/۵۰۵)

دوسری بات یہ ہے کہ لوگوں نے جو آپ کو بیٹھنے کے لیے کہا تھا تو وہ ترجماً تھا کہ جب تک لوگ صفیں درست نہیں کیے ہوئے ہیں تب تک آپ بیٹھ جائیں تاکہ سب لوگ صفیں درست کر لیں، کیوں کہ جب تک صفیں درست نہ ہوں گی تب تک جماعت شروع نہ ہوگی تو اس سے پہلے کھڑا ہونا گویا کہ مشقت اٹھانا ہے، اس لیے لوگوں نے چاہا کہ آپ یہ مشقت نہ اٹھائیں، لوگوں کے روکنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا منع ہے، اس لیے آپ بیٹھ جائیں، لیکن آپ نے لوگوں کی بات یہ کہہ کر رد کر دی کہ نماز قائم ہو چکی ہے، اب اس سے زیادہ بیٹھے رہنا مناسب نہیں ہے۔ اور آپ جو پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے اور قد قامت الصلاۃ پر کھڑے ہوئے تو اس کی وجہ یہی تھی کہ لوگ صف درست نہ کیے ہوئے تھے، اس لیے آپ کا پہلے سے کھڑا ہونا بھی کوئی ضروری نہیں تھا۔

اور حضرت عطار ضی اللہ عنہ سے جو سوال ہوا کہ مکبر جب قد قامت الصلاۃ کہے اس وقت لوگوں کو کھڑے ہونا چاہیے، تو آپ نے جواباً فرمایا: ہاں![1] اس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ اس وقت تک کھڑا ہو جانا چاہیے، اس سے تاخیر ٹھیک نہیں۔ یہ توضیح میں اس لیے کر رہا ہوں کہ حضرت عطا کا مذہب یہ تھا کہ جب اقامت شروع ہوتی تھی آپ اسی وقت کھڑے ہو جاتے تھے جیسا کہ امام ابن المنذر نے "الاوسط" میں اور ابن قدامہ حنبلی نے "المغنی" میں بیان کیا ہے، المغنی کے الفاظ یہ ہیں:

وَكَانَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ، وَمُحَمَّدُ بْنُ كَعْبٍ، وَسَالِمٌ، وَأَبُو قِلَابَةَ، وَالزُّهْرِيُّ، وَعَطَاءٌ، يَقُومُونَ فِي أَوَّلِ بَدْوَةٍ مِنْ الْإِقَامَةِ[2] یعنی حضرت عمر بن عبد العزیز، محمد بن کعب، سالم، ابو قلابہ، زہری اور امام عطا اقامت کے

([1])عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ قَالَ: قُلْتُ لِعَطَاءٍ، إِنَّهُ يُقَالُ: إِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ فَلْيَقُمِ النَّاسُ حِينَئِذٍ قَالَ: نَعَمْ۔ مصنف عبد الرزاق (۵۰۵/۱)

([2])المغنی لابن قدامۃ (۳۳۱/۱) الاوسط فی السنن والاجماع والاختلاف، بن المنذر النیسابوری (۱۶۶/۴)

شروع میں کھڑے ہوتے تھے۔ لہٰذا امام عطا کے بارے میں یہ بتانا کہ وہ مطلقاً حی علی الصلاۃ پر کھڑے ہوتے تھے، درست نہیں ہے۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے جو یہ منقول ہے کہ وہ قد قامت الصلاۃ سے پہلے کھڑے ہونے والے کو بیٹھا دیتے تھے[1] تو یہ اس صورت پر محمول ہے جب امام مسجد میں موجود نہ ہو، کیوں کہ حضور ﷺ نے امام کے عدم موجودگی میں کھڑے ہونے سے منع فرمایا تھا۔ یہاں کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ امام تھے اور مسجد میں ہوتے ہوئے قد قامت الصلاۃ سے پہلے کھڑے ہونے والے کو بیٹھا دیتے تھے، اس پر عرض یہ ہے کہ ان کے امام ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ قرین قیاس یہ ہے کہ آپ امام نہ رہے ہوں گے کیوں کہ اس زمانے میں امامت یا تو خلیفہ کرتا تھا یا خلیفہ کی جانب سے مقرر کردہ گورنر کرتا تھا، اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نہ خلیفہ تھے اور نہ کسی جگہ کے گورنر۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا تفرد ہو۔ اور تفرد کبھی حجت نہیں ہوتا، اور یہ بات کسی بھی فقہ و اصول کے ادنی طالب علم سے مخفی نہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے کتنے ایسے تفردات ہیں جن کو خاص کر حنفیہ نے قبول نہیں کیا ہے۔

اور یہ کہنا کہ ائمہ ثلاثہ حی علی الفلاح کے بعد ہی کھڑے ہونے کو مستحب قرار دیتے ہیں، یہ بھی محل نظر ہے، کیوں کہ ائمہ ثلاثہ کا مذہب یہ تو ہے کہ امام اگر مسجد میں موجود ہو تو امام اور مقتدی حی علی الصلاۃ کے وقت کھڑے ہوں، لیکن یہ کہیں نہیں ہے کہ حی علی الصلاۃ کے بعد ہی کھڑا ہونا مستحب ہے، اور اس سے پہلے کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ مبسوط سرخسی میں ہے: فَإِنْ كَانَ الْإِمَامُ مَعَ الْقَوْمِ فِي الْمَسْجِدِ، فَإِنِّي

([1])عَنْ عَطِيَّةَ قَالَ: كُنَّا جُلُوسًا عِنْدَ ابْنِ عُمَرَ فَلَمَّا أَخَذَ الْمُؤَذِّنُ فِي الْإِقَامَةِ قُمْنَا، فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: " اجْلِسُوا فَإِذَا قَالَ: قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ فَقُومُوا "مصنف عبدالرزاق،۱/۵۰۶

أُحِبُّ لَهُمْ أَنْ يَقُومُوا فِي الصَّفِّ إِذَا قَالَ الْمُؤَذِّن حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ[1] یعنی اگر امام اور مقتدی مسجد میں موجود ہوں تو میں پسند کرتا ہوں کہ وہ مکبر کے حی علی الفلاح کہنے کے وقت کھڑے ہوں۔

اس سے یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ حی علی الفلاح کے وقت کھڑا ہونا مستحب ہے، لیکن اس سے یہ مفہوم نہیں نکل رہا ہے کہ کھڑے ہونے کا استحباب حی علی الفلاح کے بعد ہی شروع ہوگا اور حی علی الفلاح سے پہلے مکروہ ہوگا، کیوں کہ حی علی الفلاح کے بعد فوراً جب مکبر قد قامت الصلاۃ کہے گا اسی وقت امام اعظم اور امام محمد کے مذہب کے مطابق امام اور مقتدی پر نماز کے لیے تکبیر کہنا مستحب ہے[2] اس سے سمجھ میں یہ آتا ہے کہ حی علی الفلاح کے بعد کھڑا ہونا فرض ہوگا، کیوں کہ اس کے بعد ہی نماز شروع ہوگی، اور اگر اس کے بعد بھی کھڑا نہیں ہوا تو اب اسے مکروہ ہونا چاہیے کیوں کہ فرض کے امتثال میں تاخیر ہوگی، اور فرض کے امتثال میں تاخیر کرنا مکروہ ہوگا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شروع ہی سے کھڑا ہونا مستحب ہونا چاہیے جو حی علی الفلاح تک باقی رہے، جیسا کے امام طحطاوی نے اس کی وضاحت کی ہے۔

امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے بارے میں مطلقاً یہ کہنا کہ یہ دونوں حی علی الصلاۃ کے بعد ہی کھڑے ہونے کو مستحب قرار دیتے ہیں، تو یہ بھی محل نظر ہے کیوں کہ ان دونوں سے دو قول منقول ہیں، امام عبد البر ''تمہید'' میں امام شافعی کا دوسرا قول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقَالَ الشَّافِعِيُّ وَأَصْحَابُهُ وَدَاوُدُ الْبِدَارُ فِي الْقِيَامِ إِلَى الصَّلَاةِ أَوْلَى فِي أَوَّلِ أَخْذِ الْمُؤَذِّنِ فِي الْإِقَامَةِ لِأَنَّهُ بِدَارٌ إِلَى فِعْلِ بِرٍّ وَلَيْسَ فِي ذَلِكَ شَيْءٌ

([1])المبسوط لمحمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي(۱/۳۹)

([2]) فَإِذَا قَالَ قَدْ قَامَتْ الصَّلَاةُ كَبَّرَ الْإِمَامُ وَالْقَوْمُ جَمِيعًا فِي قَوْلِ أَبِي حَنِيفَةَ وَمُحَمَّدٍ رَحِمَهُمَا اللهُ،المبسوط لمحمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمة السرخسي،۱/۳۹

مَحْدُودٌ عِنْدَهُمْ[1] یعنی امام شافعی اور ان کے اصحاب اور امام داؤد نے فرمایا: مکبر کے اقامت شروع کرتے ہی فوراً نماز کے لیے کھڑا ہوجانا اولی ہے، کیوں کہ یہ نیک عمل کی طرف جلدی کرنا ہے اور اس سلسلے میں ان کے نزدیک کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ اور امام ابن المنذر نے "الاوسط" میں امام احمد بن حنبل کا مذہب بیان کیا ہے کہ ان کا مذہب بھی یہی ہے کہ اگر امام مسجد میں موجود ہو تو اقامت کی ابتدا میں کھڑے ہوں۔[2]

امام ابن منذر کے مطابق امام احمد بن حنبل کا مذہب "ابتدائے اقامت میں کھڑا ہونا" اور امام شافعی کے نزدیک المبادرۃ الی البر کی وجہ سے "ابتدائے اقامت میں کھڑا ہونا" سے پتہ چلتا ہے کہ مطلقاً ان دونوں اماموں کے نزدیک قد قامت الصلاۃ پر ہی قیام کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اگر شروع سے بھی کھڑا ہوجائے تو کوئی حرج نہ ہوگا۔ یا ان دونوں اماموں کے دونوں قول میں تطبیق کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اقامت کے شروع ہونے کے ساتھ ہی کھڑا ہوجانا چاہیے، یہی مستحب ہے، البتہ اگر شروع میں کھڑا نہیں ہوا اور قد قامت الصلاۃ پر کھڑا ہوا تو بھی مستحب ہی پر عمل کیا، اس سے تاخیر استحباب کو ختم کردے گا۔

کیا حدیث سے مطلقاً ابتدا میں قیام کی ممانعت ثابت ہے؟

سوال (۷) شارع علیہ السلام کی حدیث ہے: إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ، فَلَا تَقُومُوا حَتَّى تَرَوْنِي[3]

یعنی جب اقامت کہی جائے تو مت کھڑے ہو، یہاں تک کہ مجھے نہ دیکھ لو، اور

([1]) التمہید لابن عبد البر (۱۹۰/۹)

([2]) وَكَانَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ، وَمُحَمَّدُ بْنُ كَعْبِ الْقُرَظِيُّ، وَسَالِمُ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ، وَأَبُو قِلَابَةَ، وَعِرَاكُ بْنُ مَالِكٍ، وَالزُّهْرِيُّ، وَسُلَيْمَانُ بْنُ حَبِيبٍ الْمُحَارِبِيُّ يَقُومُونَ إِلَى الصَّلَاةِ فِي أَوَّلِ بَدْئِهِ مِنَ الْإِقَامَةِ. وَبِهِ قَالَ عَطَاءٌ وَهُوَ مَذْهَبُ أَحْمَدَ، وَإِسْحَاقَ إِذَا كَانَ الْإِمَامُ فِي الْمَسْجِدِ-الاوسط فی السنن والاجماع والاختلاف، ابو بکر محمد بن ابراہیم بن المنذر النیسابوري (المتوفی: ۳۱۹) (۱۶۶/۴)

([3]) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب: متی یقوم الناس، اذا راوا الامام عند الاقامۃ، ح: ۶۳۷

دیکھنا اسی وقت پایا جائے گا جب آپ حجرۂ مبارکہ سے نکلیں گے اور آپ حجرۂ مبارکہ سے اس وقت نکلتے تھے جب مکبر حی علی الفلاح کہتا تھا، جیساکہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے لکھا ہے: شاید کہ بیرون آمدن آں حضرت دریں وقت می بود (اشعۃ اللمعات ج:۱، ص:۳۲۱، بحوالہ سائل) یعنی "شاید حضور ﷺ مکبر کے حی علی الصلاۃ/حی علی الفلاح کہنے کے وقت ہی تشریف لاتے"۔ اور ترمذی شریف کے محشی نے لمعات کے حوالے سے لکھا ہے: یحتمل أنه صلي الله عليه وسلم كان يخرج عند هذا القول (حاشیہ ترمذی، ج:۱، ص:۷۶) یعنی "ممکن ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ مکبر کے حی علی الصلاۃ/حی علی الفلاح کہتے وقت ہی تشریف لاتے ہوں"۔

تو حدیث کا مقصود یہ ہوا کہ جب تک مکبر حی علی الفلاح نہ کہے تم لوگ کھڑے مت ہوا کرو۔ کیوں کہ قاعدہ ہے کہ کوئی خاص قرینۂ صارفہ نہ ہو تو عموم لفظ کے بالمقابل خصوص سبب کا اعتبار نہیں ہوتا، فتح القدیر میں ہے: أَنَّ الْعِبْرَةَ لِعُمُومِ اللَّفْظِ لَا لِخُصُوصِ السَّبَبِ[1] ترجمہ: اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے، چاہے اس کا سبب خاص ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا مذکورہ حدیث میں آپ نے مطلقاً ابتدا میں کھڑے ہونے سے منع فرمایا، اور حی علی الصلاۃ پر کھڑے ہونے کا حکم دیا، اگرچہ اس کا سبب خاص تھا۔

جواب: سب سے پہلے یہ بات ذہن نشیں رہے کہ اگر امام مسجد میں موجود نہیں ہے تو اس وقت تک قیام نہیں کرنا ہے جب تک امام کو مسجد میں آتا ہوا نہ دیکھ لیا جائے، اور جس وقت امام پر نظر پڑے گی اسی وقت اس کو دیکھ کر کھڑا ہونا ہے، اگر امام سامنے سے آئے تو اس کو دیکھتے ہی کھڑا ہو جانا ہے اور اگر پیچھے سے آئے تو جس صف کے لوگ اس کو دیکھتے جائیں وہ لوگ کھڑے ہوتے جائیں، امام خواہ اقامت کے جس کلمے پر آئے، مقتدی پر ضروری ہے کہ امام کو دیکھتے ہی کھڑے ہو جائیں، اس میں سب کا اتفاق ہے، کسی کا اختلاف نہیں ہے، اختلاف اس صورت میں ہے کہ امام اور مقتدی

([1]) فتح القدیر للکمال ابن الھمام، فصل فی القراءۃ (۱/۳۴۲)

پہلے سے مسجد میں موجود ہیں، اب کب کھڑا ہونا ہے؟ تو اس سلسلے میں معدودے چند لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ حی علی الصلاۃ/الفلاح کے وقت کھڑا ہونا مستحب ہے اور اس سے پہلے مکروہ ہے، لیکن میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اقامت کی ابتدا ہی سے کھڑا ہونا مستحب ہے جو حی علی الصلاۃ/الفلاح کے وقت تک باقی رہتا ہے اور سوال کے اندر جس حدیث سے حی علی الصلاۃ/الفلاح کے وقت کھڑے ہونے کا استحباب ثابت کیا گیا ہے اس سے یہ بالکل ثابت نہیں ہوتا ہے کیوں کہ اس حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ مسجد میں موجود نہیں تھے اور صحابہ آپ کے انتظار میں کھڑے ہو گئے تھے، اس لیے آپ نے منع فرما دیا، اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر امام مسجد میں نہ ہو تو اس کے انتظار میں کھڑا نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ امام کے بغیر نماز کے لیے قیام کرنا بلاوجہ کی مشقت اٹھانا ہے، جیسا کہ ملا علی القاری اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں: (وَلَا تَقُومُوا) : أَيْ: لِلصَّلَاةِ إِذَا أَقَامَ الْمُؤَذِّنُ (حَتَّى تَرَوْنِي) : أَيْ: فِي الْمَسْجِدِ لِأَنَّ الْقِيَامَ قَبْلَ مَجِيءِ الْإِمَامِ تَعَبٌ بِلَا فَائِدَةٍ[1] یعنی جب مکبر نماز کے لیے اقامت کہے تو- (مت کھڑے ہونا یہاں تک کہ) مسجد میں (مجھے نہ دیکھ لینا) کیوں کہ امام کے آنے سے پہلے کھڑے ہونا بلاوجہ مشقت اٹھانا ہے۔ اور دیکھنے کے بعد کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن اقامت کے کس کلمے پر کھڑا ہونا ہے، اس کی کوئی قید نہیں ہے جیسا کہ ابن حجر عسقلانی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں :لَا تَقُومُوا: نَهْيٌ عَنْ الْقِيَام، وَقَوْله: «حَتَّى تَرَوْنِي» تَسْوِيغٌ لِلْقِيَامِ عِنْدَ الرُّؤْيَة، وَهُوَ مُطْلَقٌ غَيْرُ مُقَيَّدٍ بِشَيْءٍ مِنْ أَلْفَاظ الْإِقَامَة[2] لاتقوموا کے ذریعہ قیام سے منع کیا گیا ہے، جب کہ دیکھنے کے بعد قیام کی اجازت دی گئی ہے، اور یہ اجازت مطلق ہے، اقامت کے کسی مخصوص کلمہ پر اس حکم کو مقید نہیں کیا گیا ہے۔

([1]) مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، کتاب الصلاۃ، باب الاذان (۵۵۲/۲)
([2]) فتح الباری، باب متی یقوم الناس (۱۱۹/۲)

لہٰذا اس سے یہ ثابت کرنا کہ امام مسجد میں موجود ہو تب بھی حی علی الصلاۃ/الفلاح پر ہی کھڑا ہونا مستحب ہے اور اس سے پہلے کھڑا ہونا مکروہ ہے، استدلال بلا دلیل ہے، یہی وجہ ہے کہ مبسوط سرخسی میں اس حدیث سے یہ مسئلہ اخذ کیا گیا ہے کہ امام اگر غائب ہو تو اس کے انتظار میں کھڑا ہونا مکروہ ہے، مبسوط کی عبارت یہ ہیں:

إِذَا لَمْ يَكُنْ الْإِمَامُ مَعَهُمْ فِي الْمَسْجِدِ يُكْرَهُ لَهُمْ أَنْ يَقُومُوا فِي الصَّفِّ حَتَّى يَدْخُلَ الْإِمَامُ لِقَوْلِهِ - عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ -: لَا تَقُومُوا فِي الصَّفِّ حَتَّى تَرَوْنِي خَرَجْتُ[1] جب امام مقتدی کے ساتھ مسجد میں موجود نہ ہو تو ان کے لیے صف میں کھڑے ہونا مکروہ ہے، شارع علیہ السلام کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ آپ نے فرمایا: صف میں مت کھڑے ہو یہاں تک کہ مجھے نکلتے ہوئے دیکھ لو۔

رہا یہ تخیل کہ حضور ﷺ حی علی الصلاۃ/الفلاح کہنے کے وقت ہی تشریف لاتے رہے ہوں گے تو اس پر بھی کوئی دلیل نہیں ہے، اس بات کی تائید میں دو عبارتیں پیش کی گئی ہیں، اولا تو یہ عرض کردیں کہ یہ دونوں عبارتیں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ہی ہیں، ترمذی شریف کے محشی نے لمعات کے حوالے سے جو عبارت پیش کی ہے اگر لمعات سے مراد لمعات التنقیح ہے تو اس میں یہ عبارت موجود نہیں ہے، اور اگر لمعات سے مراد اشعۃ اللمعات ہے جیسا کہ میرا غالب گمان یہی ہے کہ محشی نے لمعات سے اشعۃ اللمعات ہی مراد لیا ہے تو اس میں یہ عبارت اس طرح موجود ہے: در فقہ مذکور است کہ تا چون حی علی الصلاۃ گوید باید برخاست شاید کہ آنحضرت نیز دریں وقت بیرون می آمدند[2] یعنی فقہ میں مذکور ہے کہ جس وقت مکبر حی علی الصلاۃ کہے اس وقت کھڑا ہونا چاہیے کہ شاید حضور ﷺ بھی اسی وقت تشریف لاتے ہوں۔

([1]) المبسوط للسرخسی، کتاب الصلاۃ، باب افتتاح الصلاۃ (۱/۳۹)

([2]) اشعۃ اللمعات فارسی، کتاب الصلاۃ، باب فضل الاذان، فصل ثانی (۱/۱۶۱)

اس عبارت میں دیکھیں کہ شیخ محقق نے خود یقین سے یہ بات نہیں کہی کہ حضور ﷺ اسی وقت ہی باہر تشریف لاتے تھے، بلکہ محض ان کا احتمال ہے اور ظاہر ہے کہ احتمال سے مسئلہ ثابت نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک دوسری حدیث نے اس احتمال کو بھی باطل کر دیا ہے، ترمذی شریف میں ہے: جَابِرِ بْنَ سَمُرَةَ، يَقُولُ: كَانَ مُؤَذِّنُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُمْهِلُ فَلاَ يُقِيمُ، حَتَّى إِذَا رَأَى رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ خَرَجَ أَقَامَ الصَّلاَةَ حِينَ يَرَاهُ.[1] حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے مکبر تکبیر کہنے میں تاخیر کرتے تھے، اور اس وقت تک اقامت نہیں کہتے تھے جب تک آپ کو نکلتے ہوئے دیکھ نہ لیتے۔ جب دیکھ لیتے اس وقت اقامت کہتے تھے۔ یہی حدیث مسلم شریف میں بھی کچھ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ اس طرح ہے: كَانَ بِلَالٌ يُؤَذِّنُ إِذَا دَحَضَتْ، فَلَا يُقِيمُ حَتَّى يَخْرُجَ النَّبِيُّ ﷺ، فَإِذَا خَرَجَ أَقَامَ الصَّلَاةَ حِينَ يَرَاهُ[2] حضرت بلال رضی اللہ عنہ آفتاب ڈھلنے کے بعد اذان کہتے تھے، اور اقامت اس وقت تک نہیں کہتے تھے جب تک حضور کو تشریف لاتے ہوئے نہ دیکھ لیتے۔

مذکورہ حدیثوں میں صاف واضح ہے کہ اقامت اس وقت تک نہیں ہوتی تھی جب تک آپ تشریف نہ لاتے، جس وقت آپ تشریف لاتے اسی وقت تکبیر شروع ہو جاتی تھی۔

آپ ﷺ کا حجرۂ مبارکہ مسجد سے بالکل متصل تھا، بلکہ آپ کا دروازہ مسجد ہی میں کھلتا تھا، چنانچہ آپ جوں ہی کمرے کا دروازہ کھولتے، صحابہ آپ کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایک دو بار ایسا ہوا کہ صحابہ آپ کے آنے سے پہلے تکبیر کہہ کر آپ کا انتظار کرنے لگے تھے، تو آپ ﷺ نے منع فرما دیا کہ میرے نکلنے کا انتظار کھڑے ہو

([1]) سنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء ان الامام احق بالاقامۃ، ح:۲۰۲(۱/۳۹۱)
([2]) صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب متی یقوم الناس للصلاۃ، ح:۶۰۶(۱/۴۲۳)

کرمت کرنا۔امام نووی شرح صحیح مسلم میں لکھتے ہیں:

أَنَّ بِلَالًا – رَضِيَ الله عَنْهُ – كَانَ يُرَاقِب خُرُوج النَّبِيّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ حَيْثُ لَا يَرَاهُ غَيْره أَوْ إِلَّا الْقَلِيل،فَعِنْد أَوَّل خُرُوجه يُقِيم،وَلَا يَقُوم النَّاس حَتَّى يَرَوْهُ،ثُمَّ لَا يَقُوم مَقَامه حَتَّى يَعْدِلُوا الصُّفُوف.وَقَوْله فِي رِوَايَة أَبِي هُرَيْرَة رَضِيَ الله عَنْهُ:(فَيَأْخُذ النَّاس مَصَافّهمْ قَبْل خُرُوجه).لَعَلَّهُ كَانَ مَرَّة أَوْ مَرَّتَيْنِ،وَنَحْوهمَا،لِبَيَانِ الْجَوَاز أَوْ لِعُذْرٍ،وَلَعَلَّ قَوْله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (فَلَا تَقُومُوا حَتَّى تَرَوْنِي) كَانَ بَعْد ذَلِكَ، قَالَ الْعُلَمَاء:وَالنَّهْي عَنْ الْقِيَام قَبْل أَنْ يَرَوْهُ لِئَلَّا يَطُول عَلَيْهِمْ الْقِيَام ، وَلِأَنَّهُ قَدْ يَعْرِض لَهُ عَارِض فَيَتَأَخَّر بِسَبَبِهِ .[1]

ترجمہ: حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے نکلنے کا انتظار فرماتے تھے،اس لیے صرف آپ یا آپ کے علاوہ کچھ لوگ ہی آپ ﷺ کو نکلتے دیکھ پاتے تھے،آپ ﷺ کے نکلتے ہی حضرت بلال رضی اللہ عنہ اقامت شروع کر دیتے تھے،اور لوگ آپ ﷺ کو دیکھنے کے بعد ہی کھڑے ہوتے تھے،جب کہ حضور ﷺ مصلے پر صف درست ہونے کے بعد ہی تشریف لے جاتے تھے،اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ لوگ حضور ﷺ کے نکلنے سے پہلے ہی اپنی اپنی صفوں میں جگہ لے لیتے تھے،تو ہوسکتا ہے کہ یہ ایک یا دو مرتبہ کا واقعہ ہو،یا بیان جواز یا عذر کی بنا پر ہو،اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ کا یہ قول کہ ”مت کھڑے ہو یہاں تک کہ مجھے نہ دیکھ لو“اس واقعہ کے بعد کا قول ہو۔علما نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ کے دیکھنے سے پہلے کھڑے ہونے کی ممانعت اس لیے ہے تاکہ لوگوں پر قیام طویل نہ ہوجائے،اور اس لیے بھی کہ آپ ﷺ کو کوئی عارضہ پیش آجائے جس

([1])المنہاج شرح صحیح مسلم،کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ،باب متی یقوم الناس للصلاۃ،۵/۱۰۳)

کی وجہ سے آپ کے نکلنے میں تاخیر ہوجائے۔

لہٰذا معمول ہی یہ تھا کہ جب حضور ﷺ حجرۂ مبارکہ سے باہر تشریف لاتے تب ہی اقامت ہوتی تھی ،اور جوں ہی آپ باہر تشریف لاتے صحابہ آپ کو دیکھ کر کھڑے ہوجاتے تھے۔

رہ گئی بات قاعدہ کی کہ کوئی خاص قرینۂ صارفہ نہ ہو تو عموم لفظ کے بالمقابل خصوص سبب کا اعتبار نہیں ہوتا، یہ قاعدہ اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن یہاں اس کا انطباق غلط ہے۔اس حدیث میں اس کا صحیح انطباق یہ ہے کہ آپ ﷺ کی عدم موجودگی میں اگرچہ صحابہ کھڑے ہوگئے اور آپ ﷺ نے ان کو منع فرمادیا تھا لیکن اب اس کا حکم عام رہے گا کہ جو بھی امام ہوگا اگر وہ مسجد میں موجود نہ ہو تو مقتدی اس کے انتظار میں کھڑے نہ ہوں۔کیوں کہ یہ واقعہ اگرچہ خاص صحابہ کے ساتھ پیش آیا تھا لیکن اس حکم کا صرف صحابہ کے ساتھ خاص ہونے پر کوئی قرینہ نہیں ہے۔یہ حکم صحابہ وغیر صحابہ سب کو عام رہے گا؛کیوں کہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے خصوص سبب کا نہیں۔

اور یہ دعویٰ کرنا بھی باطل ہے کہ آپ ﷺ نے مذکورہ حدیث میں مطلقاً ابتدا میں کھڑے ہونے سے منع فرمایا تھا اور حی علی الفلاح کے وقت کھڑا ہونے کا حکم دیا تھا کیوں کہ اس حدیث میں صرف اتنا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی عدم موجودگی میں کھڑا ہونے سے منع فرمایا تھا اور دیکھنے کے بعد کھڑے ہونے کا حکم دیا تھا، لیکن حضور ﷺ کو دیکھنا کب متحقق ہوتا تھا، شروع میں، درمیان میں، انتہا میں، اس کا کوئی ذکر اس روایت میں نہیں ہے ،ہاں! دوسری روایت سے اس بات کی توثیق ہوجاتی ہے کہ آپ ﷺ کو دیکھنے کے بعد ہی مکبر تکبیر کہتا اور مقتدی کھڑے ہوتے ۔لہٰذا دیگر روایات کے ہوتے ہوئے صرف تخمینے اور تخیل کی بنیاد پر اس کے خلاف کچھ کہنا یقینی طور پر ناقابل قبول ہے۔

جمہورِ امت نے قیام عند الفلاح کا حکم کیوں دیا؟

سوال (۸) اس پر کیا دلیل ہے کہ امام اگر مسجد میں ہو تو ابتدا میں کھڑا ہونا مکروہ نہیں ہے اور اگر مکروہ نہیں ہے تو پھر جمہور امت نے امام کے مسجد میں ہوتے ہوئے بھی حی علی الصلاۃ کے بعد ہی کھڑے ہونے کا حکم کیوں دیا؟

جواب: امام اگر مسجد میں موجود ہو تو ابتدا ہی سے کھڑے ہوجانے کی ممانعت و کراہت کسی حدیث، اقوالِ صحابہ و تابعین اور اقوالِ فقہا سے ثابت نہیں ہے، اس لیے بقول خلیفۂ راشد مجدد اول حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ "جب تم اقامت کی ندا سنو تو سب سے پہلے اس کی بجاآوری کرنے والے بنو"[1] اس لیے آپ اقامت کے شروع ہی میں کھڑے ہوجاتے تھے اور بقول امام شافعی "مکبر کے اقامت شروع کرتے ہی فوراً نماز کے لیے کھڑا ہوجانا اولی ہے کیوں کہ یہ نیک عمل کی طرف جلدی کرنا ہے"[2] اور امام طحطاوی کی تشریح کہ حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کو مستحب کہنا یہ تاخیر سے روکنا ہے، نہ کہ ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے سے روکنا، لہٰذا کوئی اگر ابتدائے اقامت ہی میں کھڑا ہوجائے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔[3] اور قرآن کریم کی آیت کریمہ أُولَٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ [المؤمنون:٦١] (یہ لوگ بھلائیوں میں جلدی کرتے ہیں اور یہی لوگ اس میں آگے نکل جانے والے ہیں) کی وجہ سے ابتدا میں کھڑا ہونا مکروہ نہیں ہے بلکہ ابتدا سے حی علی الفلاح/قد قامت الصلاۃ تک قیام کرنا مستحب ہے۔

---

(1) عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيزِ يَقُولُ إِذَا سَمِعْتَ النِّدَاءَ بِالْإِقَامَةِ فَكُنْ أَوَّلَ مَنْ أَجَابَ (الاستذكار، كتاب الصلاة باب ما جاء في النداء للصلاة(٣٩١/١)

(2) قَالَ الشَّافِعِيُّ وَأَصْحَابُهُ وَدَاوُدُ الْبِدَارُ فِي الْقِيَامِ إِلَى الصَّلَاةِ أَوْلَى فِي أَوَّلِ أَخْذِ الْمُؤَذِّنِ فِي الْإِقَامَةِ لِأَنَّهُ بِدَارٌ إِلَى فِعْلِ بِرٍّ – التمهيد لابن عبد البر(١٩٠/٩)

(3) طحطاوی علی الدر المختار (٢١٥/١)

اور آپ کا یہ کہنا کہ جمہور امت نے حی علی الصلاۃ کے بعد ہی کھڑے ہونے کا حکم دیا ہے، تو کیا یہ مذکورہ حضرات جمہور امت سے خارج ہیں؟ اور پھر تابعین کی ایک معتد بہ تعداد سے صراحتًا ابتدا میں کھڑے ہونے کی روایت موجود ہے [1] لہٰذا یہ کہنا کیسے درست ہوگا کہ جمہور امت نے حی علی الصلاۃ کے بعد ہی کھڑے ہونے کا حکم دیا ہے؟

حنفی ہونے کے باوجود تابعین کا سہارا کیوں؟

سوال (۹) آپ امام اعظم کے مقلد ہیں اور حنفی کہلاتے ہیں پھر ابتدا میں قیام کی کراہت کو تسلیم کیوں نہیں کرتے اور عمر بن عبد العزیز، سعید بن مسیب اور دیگر تابعین کا سہارا کیوں لیتے ہیں؟

جواب: اولاً امام طحطاوی کی تشریح کے مطابق احناف کے یہاں یہ مسئلہ ہے ہی نہیں کہ امام اگر مسجد میں موجود ہو تو حی علی الفلاح کے بعد ہی کھڑا ہونا مستحب ہے اور اگر مان لیں کہ اس کے بعد ہی کھڑا ہونا مستحب ہے تب بھی ترکِ مستحب کراہت تنزیہ کو مستلزم نہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ احناف نے یہ کہا کہ حی علی الصلاۃ کے وقت کھڑا ہونا مستحب ہے تو کیا اس سے پہلے کھڑے ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ چونکہ احناف کے یہاں اس کی کراہت اور ممانعت کی سرے سے کوئی صراحت ہی نہیں ہے، اس لیے تابعین عظام کے عمل کے بموجب اول اقامت میں قیام کو مستحب جانتے ہیں، لہٰذا ہم تابعین کرام کا سہارا احناف کو رد کرنے کے لیے نہیں لیتے بلکہ جس صورت میں احناف کی عبارت خاموش ہے اس صورت میں عمل کرنے کے لیے تابعین کی تائید لیتے ہیں۔

---

(1) وَكَانَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ، وَمُحَمَّدُ بْنُ كَعْبٍ الْقُرَظِيُّ، وَسَالِمُ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ، وَأَبُو قِلَابَةَ، وَعِرَاكُ بْنُ مَالِكٍ، وَالزُّهْرِيُّ، وَسُلَيْمَانُ بْنُ حَبِيبٍ الْمُحَارِبِيُّ يَقُومُونَ إِلَى الصَّلَاةِ فِي أَوَّلِ بَدْئِهِ مِنَ الْإِقَامَةِ. وَبِهِ قَالَ عَطَاءٌ وَهُوَ مَذْهَبُ أَحْمَدَ، وَإِسْحَاقَ إِذَا كَانَ الْإِمَامُ فِي الْمَسْجِدِ- الاوسط فی السنن والاجماع والاختلاف، ابوبکر محمد بن ابراہیم بن المنذر النیسابوری (المتوفی: ۳۱۹) (۱۶۶/۴)

اثرِ علی سے قیام عندالاقامۃ کی کراہت کا استنباط غلط ہے؟

سوال (۱۰) کیا حضور ﷺ کی حدیث: إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا تَقُومُوا حَتَّى تَرَوْنِي اور اس سے ماخوذ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے اثر خَرَجَ عَلِيٌّ، وَقَدْ أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ وَهُمْ قِيَامٌ يَنْتَظِرُونَهُ، فَقَالَ: مَا لِي أَرَاكُمْ سَامِدِينَ؟[1] سے ابتدائے اقامت میں کھڑے ہونے کی کراہت تنزیہ کے استنباط کو آپ غلط قرار دیتے ہیں؟

جواب: میں نے "غلط" لفظ کا استعمال نہیں کیا ہے اور نہ یہ زیب دیتا ہے کہ میں اپنے بڑوں کے متعلق یہ لفظ استعمال کروں۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ حضور ﷺ کی مذکورہ حدیث اور مولائے کائنات رضی اللہ عنہ کے اثر سے جو لوگ بھی ابتدائے اقامت میں امام کے موجود ہوتے ہوئے کھڑے ہونے کی کراہت کا استنباط کر رہے ہیں ان سے یقیناً تسامح ہوا ہے اور یہ تسامح بالکل واضح ہے کیوں کہ اس حدیث اور اثر میں امام کی عدم موجودگی میں کھڑے ہونے کی نہی وارد ہے اور امام کی موجودگی میں کھڑے ہونے کا امر ہے لہٰذا اس کو امام کی موجودگی میں قیام کی کراہت ثابت کرنا کتنا عجیب ہے!

امام ابن ابی شیبہ نے مذکورہ حدیث اور اثر سے متّصل ہی ایک روایت ذکر کی ہے، وہ یہ ہے: كَانُوا يَكْرَهُونَ أَنْ يَنْتَظِرَ الرَّجُلُ إِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ وَلَيْسَ عِنْدَهُمُ الْإِمَامُ، وَكَانُوا يَكْرَهُونَ أَنْ يَنْتَظِرُوا الْإِمَامَ قِيَامًا، وَكَانَ يُقَالُ هُوَ السُّمُودُ[2]

یعنی لوگ مکروہ سمجھتے تھے کہ مکبر جب قد قامت الصلاۃ کہے اس وقت کوئی امام کا انتظار کرے جب کہ امام اس کے پاس موجود نہ ہو، اور لوگ مکروہ جانتے تھے کہ امام

([1]) مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الصلوات، فی القوم یقومون اذا اقیمت الصلاۃ قبل ان یجیء الامام (۱/۳۵۶)

([2]) مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الصلوات، فی القوم یقومون اذا اقیمت الصلاۃ قبل ان یجیء الامام (۱/۳۵۶)

کا کھڑے ہو کر انتظار کیا جائے، اسی کو سمود [حیران و پریشان ہونا] کہا جاتا تھا۔

اس سے صاف واضح ہے کہ امام کا کھڑے ہو کر انتظار کرنا مکروہ ہے جب کہ امام مسجد میں نہ ہو، تکبیر کہنے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی - لہٰذا یہ کہنا کیسے درست ہو سکتا ہے کہ امام کی موجودگی میں کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ اب اتنے واضح دلائل کے باوجود بھی کوئی نہ مانے تب بھی ہمیں کوئی شکوہ نہیں، کیوں کہ ہر صاحبِ علم کو اپنے اپنے دلائل کے تابع رہنا چاہیے اور ایک دوسرے کی دلیل اور رائے کو برداشت کرنے کی جرأت رکھنی چاہیے۔

"وَجَبَ" کا معنی آپ نے وجوب اصطلاحی سمجھ لیا ہے؟

سوال (۱۱) "وَجَبَ" کے معنی ثَبَتَ کے ہوتے ہیں، اور آپ نے اپنی کتاب میں اس کا معنی وجوبِ اصطلاحی حکماً فرض سے کم اور سنت موکدہ سے بڑھا ہوا سمجھ لیا ہے۔

جواب: یہ میرے اوپر الزام ہے، میں نے خود کتاب میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ "یہاں لفظِ "واجب" واجب اصطلاحی کے معنی میں نہیں ہے"۔

امام مالک کو مسئلہ اقامت کے تعلق سے کوئی حدیث نہیں ملی؟

سوال (۱۲) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا جو یہ مذہب ہے کہ اقامت کے وقت کھڑے ہونے کی کوئی تحدید نہیں ہے، وہ اس لیے ہے کہ ان تک اس تعلق سے کوئی حدیث نہیں پہنچی ہے، اگر ان تک حدیث پہنچتی تو وہ بھی اسی کے قائل ہوتے کہ حی علی الصلاۃ / الفلاح پر کھڑا ہونا مستحب ہے۔

جواب: بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ امام دار الہجرۃ مالک بن انس رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی ایسی حدیث نہیں پہنچی جس سے قیام کی کوئی حد بندی کی جائے، آپ خود فرماتے ہیں: فَلَمْ أَسْمَعْ فِيهِ بِحَدٍّ يُقَامُ لَهُ[1]

([1]) موطا امام مالک، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی النداء للصلاۃ (۱/۷۰)

یعنی میں نے کوئی ایسی حدیث نہیں سنی جس سے اقامت کے وقت قیام کی تحدید کی جائے؛اور آپ سنتے بھی کیسے !کیوں کہ کوئی ایسی حدیث ہے ہی نہیں جس میں اقامت کے کسی کلمے پر قیام کی حدبندی کی گئی ہو۔اگر کسی کو بھی اس تعلق سے کوئی ایسی حدیث ملتی جس میں اقامت کے کسی کلمے پر قیام کی حدبندی کی گئی ہوتی تو ہر کسی کا مذہب اسی حدیث کے مطابق ہوتا۔اور آج کل جو حدیثِ ابوقتادہ[1] سے حی علی الصلاۃ کے وقت قیام پر استدلال کیاجاتاہے اور یہ کہا جاتاہے کہ اگر امام مالک کو یہ حدیث مل گئی ہوتی توان کا مذہب یہی ہوتا کہ حی علي الصلاۃ/ الفلاح پر کھڑا ہونا مستحب ہے،ہم اپنے ایسے مخلص دوستوں کو بتادیں کہ امام مالک کسی ایرے غیرے کا نام نہیں ہے، وہ مدینہ منورہ کے امامِ فقہ و حدیث تھے اورآپ کی کتاب ''مؤطا'' حدیث میں سب سے پہلی تدوین مانی جاتی ہے بلکہ بعض لوگوں نے آپ کی اس کتاب کو کتاب اللہ کے بعد سب سے صحیح ترین اور مستند ماناہے، یہ آپ کے علمِ حدیث میں تبحر کا بین ثبوت ہے،اس کے باوجود یہ حدیث آپ کو نہیں ملی ہوگی، حیرت ہے۔میں یہ تو دعویٰ نہیں کرتا کہ دنیا کی ساری حدیثیں آپ تک پہنچ ہی گئی ہوں گی لیکن حیرت کی وجہ یہ ہے کہ حدیثِ ابوقتادہ جو مشہور حدیث ہے ،آپ کے بعد کے اکثر محدثین نے اس حدیث کو اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے ،بخاری و مسلم سمیت احادیث کی بیشتر کتابوں میں یہ حدیث موجود ہے، توبعد کے اتنے محدثین کو یہ حدیث ملی اور آپ کی نگاہ سے یہ حدیث اوجھل رہی، یہ باعث حیرت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اقامت کے وقت قیام کا مسئلہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے

([1])عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي قَتَادَةَ - لاَ أَعْلَمُهُ إِلَّا - عَنْ أَبِيهِ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لاَ تَقُومُوا حَتَّى تَرَوْنِي، وَعَلَيْكُمُ السَّكِينَةَ-صحیح البخاری،کتاب الجمعۃ، باب المشیۃ الی الجمعۃ،ح:۹۰۹) ترجمہ: حضرت عبداللہ بن ابوقتادہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: مت کھڑے ہو یہاں تک کہ مجھے نکلتے ہوئے نہ دیکھ لو،اور اطمئنان و سکون کے ساتھ رہو۔

جولوگوں سے مخفی رہ جائے کیوں کہ یہ دن رات میں پانچ مرتبہ پیش آنے والا مسئلہ ہے اور مسجد نبوی شریف میں آپ کے درس و تدریس اور افتا کے لیے مسند لگتا تھا اور آپ امامت بھی فرماتے تھے اس کے باوجود آپ کے لیے اس مسئلہ میں کسی حدیث سے رہنمائی نہیں ملی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیثِ ابوقتادہ سے وہ مسئلہ ثابت ہی نہیں ہے، اور اس وقت کا تراث بھی یہی رہا ہوگا کہ تابعین عظام مسجد نبوی میں جب چاہتے تھے کھڑے ہوتے رہے ہوں گے۔ بلکہ یہ تراث ابھی تک باقی ہے اور آج بھی مسجد نبوی میں لوگ جب چاہتے ہیں کھڑے ہوتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ حدیث ابوقتادہ کے رواۃ میں بھی کئی لوگ مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے یا اگر باہر کے تھے تو وہاں وہ قیام پذیر رہے ہیں جیسے خود حضرت ابوقتادہ اور آپ کے بیٹے مدینہ منورہ ہی کے رہنے والے تھے اور یہیں ان دونوں کی وفات بھی ہوئی[1] اور حضرت یحی بن ابی کثیر اگرچہ بصرہ کے رہنے والے تھے لیکن انہوں نے مدینہ میں دس سال تک قیام فرمایا اور وہاں کے تابعین کبار سے اخذ و استفادہ کیا، یہ امام مالک کے ہم زمانہ ہیں[2] بلکہ خود حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ صرف دو واسطوں سے آپ کے شیوخ میں آتے ہیں، لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ امام مالک کو یہ حدیث نہیں پہنچی ہوگی، ضرور پہنچی ہوگی لیکن بات یہ ہے کہ حدیثِ ابوقتادہ سے امام کی موجودگی میں اقامت کی ابتدا میں قیام کی ممانعت ثابت ہی نہیں ہوتی۔

پھر بر سبیل تنزل تھوڑی دیر کے لیے ہم فرض کر لیتے ہیں کہ امام مالک کو یہ

([1])أَنَّ أَبَا قَتَادَةَ تُوُفِّيَ بِالْمَدِينَةِ سَنَةَ أَرْبَعٍ وَخَمْسِينَ۔ یعنی حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی وفات مدینہ میں ۵۴ھ کو ہوئی۔ الطبقات الکبری (۱۵/۶) عبداللہ بن ابی قتادۃ: تُوُفِّيَ بِالْمَدِينَةِ فِي خِلَافَةِ الْوَلِيدِ بْنِ عَبْدِ الْمَلِكِ۔ یعنی حضرت عبداللہ بن ابی قتادۃ کی وفات مدینہ میں ولید بن عبدالملک کی خلافت کے دور میں ہوئی۔ الطبقات الکبری (۲۷۴/۵)

([2])یحی بن ابی کثیر (متوفی:۱۲۹ھ) أقام عشر سنين في المدينة يأخذ عن أعيان التابعين۔ الاعلام للزرکلی (۱۵۰/۸) امام دار الہجرۃ حضرت مالک بن انس (متوفی:۱۷۹ھ)

حدیث نہیں ملی، اس لیے ان کا مذہب حی علی الصلاۃ پر کھڑے ہونے کا نہیں ہے لیکن صاحب مبسوط کو تو یہ حدیث ملی تھی، انہوں نے تو اس حدیث سے امام کی غیر موجودگی میں قیام پر کراہت کے ثبوت پر استدلال بھی کیا ہے، تو آخر انہوں نے امام کی موجودگی میں حی علی الصلاۃ/ الفلاح پر قیام کے استحباب کو کیوں ثابت نہیں کیا؟

ہمیں حدیثِ ابو قتادہ سے انکار نہیں، ہاں! ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ امام کی غیر موجودگی میں کھڑے ہو کر اس کے انتظار کی کراہت کے سلسلے میں وارد ہے اور اس کو اپنے مورد ہی پر رکھنا چاہیے، اس کو بنیاد بنا کر اضافی کراہتوں کا غیر متعلق اثبات درست نہیں ہے۔

حدیث ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے استدلال اور اس کا جواب

سوال (۱۳) ایک حدیث ہے جو حضرت عبد اللہ ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: كَانَ إِذَا قَالَ بِلَالٌ: قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ نَهَضَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَبَّرَ[1] یعنی جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ قد قامت الصلاۃ کہتے، تو حضور ﷺ اٹھ کر تکبیر کہتے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قد قامت الصلاۃ پر کھڑا ہونا چاہیے۔

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے بلکہ اس کے اندر بہت زیادہ ضعف ہے، امام نووی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: أَمَّا حَدِيثُ ابْنِ أَبِي أَوْفَى فَضَعِيفٌ قَالَ الْبَيْهَقِيُّ لَا يَرْوِيهِ إِلَّا حَجَّاجُ بْنُ فَرُّوخَ وَكَانَ يَحْيَى بْنُ مَعِينٍ يُضَعِّفُهُ: قُلْتُ اتَّفَقُوا عَلَى جَرْحِ الْحَجَّاجِ هَذَا فَقَالَ ابْنُ أَبِي حَاتِمٍ عَنْ يَحْيَى بن معين ليس هو بشئ وَقَالَ أَبُو حَاتِمٍ هُوَ شَيْخٌ مَجْهُولٌ وَقَالَ النسائي ضعيف وقال الدارقطني متروك وهذه أوضح

([1]) بیہقی/السنن الکبری، ابواب صفۃ الصلاۃ، باب من زعم انہ یکبر بل فراغ المؤذن، ح:۲۲۹۷ (۲/۳۵)

الْعِبَارَاتِ عِنْدَهُمْ وَفِي الْحَدِيثِ ضَعْفٌ مِنْ جِهَةٍ أخرى وهى أن ابن العوام بن حوشب لم يدرك بن أَبِي أَوْفَى كَذَا قَالَهُ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ وَغَيْرُهُ وَلَمْ يَسْمَعْ أَحَدًا مِنْ الصَّحَابَةِ وَإِنَّمَا رِوَايَتُهُ عَنْ التَّابِعِينَ[1]

یعنی "ابن ابی اوفی کی حدیث ضعیف ہے، بیہقی نے کہا ہے کہ اس حدیث کو صرف حجاج بن فروخ نے روایت کیا ہے، یحیی بن معین اس کی تضعیف کرتے تھے، امام نووی فرماتے ہیں: حجاج بن فروخ کی جرح پر سب لوگ متفق ہیں، ابن ابی حاتم نے یحیی ابن معین سے نقل کیا ہے کہ وہ حجاج بن فروخ کو "لیس هو بشيء" کہتے تھے، ابو حاتم نے کہا کہ وہ شیخ مجہول ہیں، نسائی نے ضعیف کہا، دارقطنی نے متروک کہا، امام نووی فرماتے ہیں کہ محدثین کی یہ ان کے بارے میں واضح عبارتیں ہیں، اور اس حدیث میں ایک دوسری جہت سے بھی ضعف ہے، وہ یہ ہے کہ عوام ابن حوشب کی ملاقات ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے نہیں ہے جیسا کہ امام احمد بن حنبل اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں نے کہا ہے کہ عوام ابن حوشب کا سماع کسی صحابی سے ثابت نہیں ہے، ان کی ساری روایتیں صرف تابعین سے ہیں۔

اور حافظ ہیثمی نے مجمع الزوائد میں کہا: حَجَّاجِ بْنِ فَرُّوخَ وَهُوَ ضَعِيفٌ جِدًّا[2] یعنی حجاج بن فروخ کے اندر بہت زیادہ ضعف ہے۔ اور فیض القدیر میں ہے:

وقال الذهبي في المهذب: فيه حجاج بن فروخ واه والحديث لم يصح[3]

یعنی امام ذہبی نے کہا کہ اس حدیث میں حجاج بن فروخ ہے، انتہائی ضعیف ہے، اور حدیث صحیح نہیں ہے۔

لہذا اس قدر واضح جرح کے بعد یہ حدیث قابل استناد نہیں رہ جاتی۔

([1]) المجموع، کتاب الصلاۃ، باب صفۃ الصلاۃ (۳/۲۵۴)

([2]) مجمع الزوائد و منبع الفوائد، باب ما یفعل اذا اقیمت الصلاۃ (۲/۵)

([3]) فیض القدیر (۵/۱۵۳)

دوسری بات یہ ہے کہ یہ حدیث ہمارے موقف کے خلاف نہیں ہے کیوں کہ ہمارا موقف یہ ہے کہ ''ابتدا'' سے کھڑے ہونے کا استحباب شروع ہوتا ہے اور ''قد قامت الصلاۃ'' تک باقی رہتا ہے، اس کے بعد استحباب باقی نہیں رہتا، اور پھر نماز کے لیے قیام کرنا ضروری ہوجاتا ہے، اور مذکورہ حدیث میں آپ ﷺ کا قد قامت الصلاۃ پر کھڑے ہونا استحباب کے اندر ہی تھا، لہٰذا یہ حدیث ہمارے معارض نہیں، اور اس لیے بھی معارض نہیں ہے کہ اس حدیث میں ابتدا سے کھڑے ہونے کی کراہت کا ثبوت نہیں ہے جبکہ محل اختلاف یہی ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ ابتدا سے کھڑا ہونا مکروہ نہیں ہے اور ہمارے بعض دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ ابتدا سے کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیثوں میں آتا ہے کہ حضور ﷺ اپنے حجرۂ مبارکہ سے مسجد میں تشریف لاتے تھے اور آپ کے تشریف لانے کے بعد اقامت ہوتی تھی، آپ بیٹھتے نہیں تھے بلکہ کھڑے رہتے اور مصلے پر جاتے اور نماز شروع کرتے تھے۔ اس لیے تمام فقہا نے یہ لکھا ہے کہ امام اگر مسجد میں آئے تو اس کو دیکھ کر سب لوگ کھڑے ہوجائیں، اور امام مصلے پر جاکر نماز شروع کرے، کسی نے بیٹھنے کا حکم نہیں دیا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ امام اگر مسجد میں پہلے سے موجود ہو اور تکبیر شروع ہوجائے تو کھڑے نہیں ہوسکتے بلکہ حی علی الصلاۃ/الفلاح کا انتظار کرنا ہوگا اور اگر اس سے پہلے کھڑے ہوگئے تو مکروہ ہوجائے گا! اس کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اگر شروع ہی سے کھڑے ہوگئے تو حی علی الصلاۃ/الفلاح کہنا لغو ہوجائے گا، اس پر عرض یہ ہے کہ اگر کوئی حی علی الصلاۃ پر کھڑا ہوجائے جیسا کہ بعض کتب فقہ میں اسی کلمے پر کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا ہے تو اس صورت میں حی علی الفلاح کہنا لغو ہوجائے گا؛ کیوں کہ اب حی علی الفلاح کہنے کی ضرورت نہیں ہے حالانکہ بعض کتابوں میں حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کو کہا گیا ہے بلکہ حی علی الصلاۃ کہنا بھی لغو ہوجائے گا جب امام باہر سے

مسجد میں آئے اور مقتدی اس کو دیکھ کر کھڑے ہوجائیں؛ کیوں کہ امام اور مقتدی جب اقامت کے شروع ہی میں کھڑے ہوگئے تو حی علی الصلاۃ/الفلاح کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ اسی طرح اس شخص کے حق میں اذان میں حی علی الصلاۃ/الفلاح کہنا بھی لغو ہوجائے گا جو پہلے سے مسجد میں نماز کے لیے حاضر ہوجائے، پھر تو اس کے لیے پہلے سے مسجد میں آنا بھی مکروہ ہوجائے گا۔

پھر حدیثِ ابن ابی اوفی آپ کے لیے بھی مستدل نہیں کہ اس میں قد قامت الصلاۃ پر کھڑے ہونے کا ذکر ہے اور آپ حی علی الصلاۃ/الفلاح کے قائل ہیں، جب کہ ہم اس پر عامل ہیں اور اسے انتہائے استحباب پر محمول کرتے ہیں، مسئلہ آپ کے لیے ہے کہ وہی آپ کے لیے ابتدائے استحباب بھی ہے اور انتہائے استحباب بھی۔

اس مسئلہ کو ذرا اس انداز سے بھی سوچیے کہ مکبر کو حی علی الصلاۃ پر پہنچنے میں صرف آدھا منٹ لگتا ہے بلکہ اس سے بھی کم، تو کیا صرف آدھا منٹ پہلے امام کے رہتے ہوئے نماز کے لیے کھڑے ہوگئے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ عتاب فرمائیں گے؟ جبکہ امام کے آنے کی صورت میں اِس آدھا منٹ پہلے کھڑے ہونے کا حکم ہے، یہ بات عقل سے بہت بعید لگتی ہے۔

اہل سنت کی عام مسجدوں کے معمولات کی موافقت کیوں نہیں؟

سوال (۱۴) آپ علما و مشائخ کے توارث پر عمل کی بات کرتے ہیں تو پھر اہل سنت کی عام مسجدوں کے معمولات کی موافقت کیوں نہیں کرتے؟ خصوصاً جمعہ میں تمام مسجدوں میں ائمہ خطبہ کے بعد بیٹھ کر اقامت سنتے ہیں، جب کہ آپ کے یہاں اس کے برخلاف معمول ہے؟

جواب: الحمد للہ علما و مشائخ کے توارث پر صرف عمل کرنے کی بات ہی نہیں کرتے بلکہ حتی الوسع اس پر چلنے اور اس کو باقی رکھنے کی بھی کوشش کرتے ہیں، کیوں کہ یہ

لوگ اللہ کے انعام یافتہ بندے ہوتے ہیں، اور اللہ نے سورہ فاتحہ میں اپنے انعام یافتہ بندوں کی راہ پر چلنے کی دعا سکھائی ہے، اس لیے اپنے مشائخ کے توارث پر چلنے اور اس کو قائم و دائم رکھنے کے جذبے کے تحت اذان ثانی مسجد کے اندر دیتے ہیں اور اقامت کی ابتدا میں کھڑے ہوتے ہیں، اور ہمارے یہاں کے اہل سنت کی عام مسجدوں کے جدید معمولات متقدمین مشائخ کے توارث کے خلاف ہے اس لیے ہم اپنے یہاں اس سے اجتناب کرتے ہیں لیکن دوسری جگہ عام مسجدوں کے معمولات ہی کی پیروی کرتے ہیں، کیوں کہ یہ ایک فرعی مسئلہ ہے، اس پر بحث و مباحثہ کرنا، اور تشدد اختیار کرنا کسی طرح روا نہیں ہے، اور خطبہ جمعہ کے بعد بیٹھ کر اقامت سننا کہیں سے بھی ثابت نہیں ہے بلکہ اعلی حضرت فاضل بریلوی نے بھی یہ لکھا ہے کہ بیٹھ کر اقامت سننا کہیں منقول نہیں۔[1]

اذان و اقامت سے قبل درودِ پاک کا ورد کیوں نہیں؟

سوال (۱۵) اہل سنت کی عام مسجدوں میں اذان و اقامت سے قبل درود پاک کا ورد معمول ہے، آپ حضرات اگر علما کے معمولات کی موافقت کرتے ہیں تو اس میں ان کی موافقت کیوں نہیں کرتے؟

جواب: آج اہل سنت کی عام مسجدوں میں اذان و اقامت سے بالکل متّصل جہر کے ساتھ جو درود پاک کا ورد کیا جاتا ہے یہ علما کا معمول نہیں ہے بلکہ جہلا نے اس کو رائج کر رکھا ہے، متقدمین و متاخرین میں سے کسی فقیہ اور مفتی نے اس کا حکم نہیں دیا ہے بلکہ اعلی حضرت فاضل بریلوی نے بھی اس سے منع فرمایا ہے۔[2] لیکن اگر کوئی سراً یا فصل کے ساتھ اذان و اقامت سے قبل درود پاک کا ورد کرتا ہے تو اس میں ہمارے نزدیک بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

([1]) فتاوی رضویہ 419/5

([2]) فتاوی رضویہ 386/5

آپ کا قول عملِ اہل سنت و جماعت کے خلاف ہے؟

سوال (۱۶) آپ کی کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس مسئلہ میں آپ کا قول عملِ اہل سنت و جماعت کے خلاف اور ان کے معارض ہے۔

جواب: اس مسئلہ میں ہمارا قول عملِ اہل سنت و جماعت کے خلاف اور ان کے معارض بالکل نہیں ہے۔ بلکہ میں نے اس کتاب میں صرف اہل سنت و جماعت کا قول و عمل ہی پیش کیا ہے، ایک حوالہ بھی اہل سنت و جماعت کے علاوہ نہیں ہے، لہٰذا ہمارے اوپر یہ الزام ہے کہ ہمارا قول اہل سنت و جماعت کے عمل کے خلاف اور معارض ہے۔

صوفیہ اور مشائخ کے توارث کو اتنی اہمیت کیوں؟

سوال (۱۷) آپ نے اپنی کتاب میں جا بجا صوفیہ کرام اور مشائخ کرام کے توارث کا سہارا لیا ہے، آپ بار بار یہ لکھتے ہیں کہ ہم مشائخ کی اتباع میں ان مسائل پر عمل پیرا ہیں، آپ ان کو اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں؟

جواب: ابھی میں نے ذکر کیا کہ مشائخ عظام اللہ کے انعام یافتہ بندے ہیں، اور ہمیں ان کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے، اس لیے ہم ان کو اتنی اہمیت دیتے ہیں اور ان کے طریقے کی پیروی کرتے ہیں، لیکن مشائخ کے بارے میں اس طرح کا سوال کرنا بہت بڑی محرومی کی دلیل ہے، اعلی حضرت فاضل بریلوی فرماتے ہیں: صوفیہ کرام کی نسبت یہ کہنا کہ ان کا قول و فعل معاذاللہ کچھ وقعت نہیں رکھتا بہت سخت بات ہے۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے: وَ اتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ [لقمان:۱۵] جو میری طرف جھکے ان کی راہ کی پیروی کر۔ صوفیہ کرام سے زیادہ اللہ کی طرف جھکنے والا کون ہوگا، فتاوی عالمگیری میں ہے: وَإِنَّمَا يَتَمَسَّكُ بِأَفْعَالِ أَهْلِ الدِّينِ [1] دینداروں کے افعال سے سندلائی جاتی ہے۔ صوفیہ کرام سے بڑھ کر اور کون دیندار ہے [2]

([1]) الفتاوی الہندیۃ، الباب السابع عشر فی الغناء واللھو وسائر المعاصی (۳۵۲/۵)
([2]) فتاوی رضویہ (۵۵۹/۲۲)

اس قسم کا سوال وہابیت کی پیداوار ہے جس کو مشائخ اور بزرگان دین کے طریقے سے سخت نفرت ہے، لیکن افسوس کے آج ہم میں سے کچھ لوگ وہابیت ہی کی روش پر چل پڑے ہیں، اللہ اس سے بچائے، اور ہم سب کو اپنے محبوب بندوں کی راہ پر چلائے!

قابل اعتراض چند جملے اور ان کا جواب

سوال (۱۸) آپ کی کتاب کے چند جملے قابل اعتراض ہیں، مثلاً

۱۔ مسئلہ یہ ہے کہ کوئی جوش عناد میں امت کے اس عظیم توارث کو بدعت، ضلالت، خلاف سنت، موضوعِ اصلاح و دعوت اور عنوانِ جبر و وحشت سمجھے۔

۲۔ ان تمام باتوں کے باوجود اذانِ خطبہ کو مسجد کے باہر ہی دینے پر اگر کوئی مصر ہے اور اس کے خلاف کرنے والے پر بدعت وضلالت کا حکم لگاتا ہے اور عالم گیریت کے اس دور میں اپنی چند مسجدوں کے جدید تعامل کو بنیاد بنا کر اسے سنیت کا شعار قرار دیتا ہے، تو یقیناً ایسے شخص کا قبلۂ تفقہ گم ہو گیا ہے، ایسے شخص کو چاہیے کہ پہلے وہ مقاصد شریعت کو سمجھے اور پھر اس کی مشروعیت کا جائزہ لے اور عہد رسالت سے لے کر اب تک اس میں کس طرح کی تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان پر ایک نظر ڈالے تاکہ اسے مسئلہ کی پوری حقیقت سمجھ میں آجائے **ورنہ امت کی اجتماعیت کو تار تار کرنے کے علاوہ اسے کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔**

۳۔ بعض لوگ بین یدی الخطیب/المنبر کے الفاظ سے دھوکہ کھا جاتے ہیں یا دھوکہ دیتے ہیں کہ اس سے مراد "مواجہت" ہے۔

۴۔ دوسری طرف یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ اذان خطبہ کا مقصد مسجد سے باہر والوں کو مطلع کرنا نہیں ہے، اس لیے **اس کو مسجد سے باہر کرانے کی ضد بھی فضول ہے۔**

۵۔ اب اس مسئلے پر بحث و جدل کرنا کسی طرح جائز نہیں بلکہ انتشار و افتراق کا سبب ہے جو یقیناً معیوب ہے۔

۶۔ اذان خطبہ کو بدعت سیئہ کہہ کر رد کرنا **دوسری صدی سے آج تک کے تمام**

بلادعالم کے علماومشائخ کی ایک گوناں توہین ہے۔

ان جملوں سے بزرگوں کی گستاخی جھلکتی ہے۔

جواب: مذکورہ نمایاں جملے نہ قابل اعتراض ہیں اور نہ ہی ان سے بزرگوں کی گستاخی ہورہی ہے؛کیوں کہ ان مذکورہ جملوں میں جو باتیں کہی گئیں ہیں ان سے ہمارے بزرگ یکسر بری ہیں ،بلکہ جو لوگ مذکورہ باتیں بزرگوں پر چسپاں کررہے ہیں وہ خود گستاخی کرنے کی کوشش کررہے ہیں ،ہم نے مذکورہ جملوں میں جو باتیں کہی ہیں ان کا سیاق و سباق دیکھیں، آپ پر بالکل واضح ہوجائے گا کہ وہ باتیں کس کے لیے کہی گئیں ہیں-ملاحظہ فرمائیں:

پہلے والے جملے میں غور کریں کہ ہم نے ''جوش عناد'' اس شخص کے لیے استعمال کیا ہے جو بزرگوں کے توارث کو

بدعت وضلالت

خلافِ سنت

موضوعِ اصلاح ودعوت

اور عنوانِ جبر ووحشت بنارکھا ہے۔

ظاہر ہے ہمارے بزرگوں نے کبھی بھی ''توارث'' کو بدعت وضلالت نہیں کہا، نہ اس کو خلاف سنت کہا،اور نہ اس کو اصلاح ودعوت کا موضوع بنایااور نہ ہی اس کے ذریعہ جبر ووحشت کا کھیل کھیلا ہے۔

دوسرے جملے میں غور کریں کہ ہم نے ''قبلۂ تفقہ گم ہوگیا ہے''اس شخص کے لیے استعمال کیا ہے جو اذان خطبہ کو مسجد سے باہر ہی دینے پر اصرار کرے-

خلاف کرنے والے پر بدعت وضلالت کا حکم لگائے-

اس کو سنیت کا شعار قرار دے-

اس کے ذریعہ امت کی اجتماعیت کو تار تار کرے۔

ان چاروں باتوں سے ہمارے بزرگ بالکل پاک و منزہ تھے۔انہوں نے کبھی اذان خطبہ کو مسجد سے باہر ہی دینے پر اصرار نہیں کیا اور نہ اس کے خلاف کرنے والے پر بدعت وضلالت کا حکم لگایا، اور نہ اس کو سنیت کا شعار قرار دیا اور نہ ہی اس کے ذریعہ امت کی اجتماعیت کو تار تار کرنے کی کوشش کی، لہٰذا آج جو لوگ اس مسئلہ کے سہارے یہ سارے کام کر رہے ہیں ان کا قبلۂ تفقہ ضرور گم ہو گیا ہے کیوں کہ اگر ان کے اندر تھوڑی سی بھی فقہ کی شد بد ہوتی تو اس فرعی مسئلہ کو ان کاموں کے لیے استعمال نہ کرتے۔

اور تیسرے جملے میں ہم نے اس شخص کے لیے ''دھوکہ کھا جاتے ہیں یا دھوکہ دیتے ہیں'' لکھا ہے جس کو معلوم ہوتا ہے کہ ''بین یدی الخطیب/المنبر'' قریب و بعید دونوں کے لیے آتا ہے، اس کے باوجود صرف ایک ہی معنی یعنی ''بعید'' بتاتا ہے اور جس کو معلوم نہیں ہوتا تو دوسرے لوگ اس کو دھوکہ دے دیتے کہ ''بین یدی الخطیب /المنبر'' کا معنی صرف ''بعید'' ہے جبکہ ہمارے بزرگوں نے کبھی بھی حق کو نہیں چھپایا بلکہ بلا کم و کاست مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو لوگوں کے سامنے رکھا۔

چوتھے، پانچویں اور چھٹے جملے میں غور کریں کہ ان میں کوئی بھی جملہ گستاخی کا نہیں ہے بلکہ صاف واضح ہے کہ جب اذان خطبہ باہر والوں کے لیے نہیں ہے تو اس کو باہر کروانے کی ضد واقعی فضول ہے، اسی طرح اس مسئلہ کو بنیاد بنا کر آپس میں بحث و جدال کرنا اور انتشار و افتراق پھیلانا یقیناً معیوب بات ہے، اسی طرح ہمارے جو بزرگ اذان خطبہ کو مسجد کے اندر دیتے رہے ہیں اور ابھی بھی دے رہے ہیں ان پر بدعت سیئہ کا حکم لگانا ان کی توہین نہیں تو اور کیا ہے؟

ہماری مذکورہ بالا توضیح سے یہ بات عیاں ہو گئی کہ ہمارا مقصد بزرگوں کی شان میں گستاخی کے جملے استعمال کرنا نہیں تھا، بلکہ ہم نے کس کے لیے یہ جملے استعمال کیے ہیں وہ

آپ پر واضح ہو گیا لیکن پھر بھی خیالِ خاطرِ احباب کے تحت اس ایڈیشن سے ہم نے ان جملوں کو حذف کر دیا ہے تاکہ ان کے آبگینۂ خلوص و شفقت کو کہیں ٹھیس نہ لگ جائے۔

کیا یہ مسئلہ اب فرعی نہیں ہے؟

سوال (۱۹) آپ اس مسئلہ کو فرعی مانتے ہیں جبکہ ہمارے بعض بڑے علما نے لکھا ہے کہ جب سے وہابیہ نے اس مسئلہ پر مذہبی رنگ چڑھایا ہے تب سے یہ مسئلہ محض فرعی نہ رہا۔

جواب: یہ مسئلہ ہمیشہ سے فرعی تھا اور ہمیشہ فرعی رہے گا، کسی مجتہد، فقیہ اور مفتی نے اس کو اصول کا درجہ نہیں دیا، اور دے بھی کیسے سکتا ہے کیوں کہ اس مسئلہ کے اصول دین سے ہونے پر کوئی دلیل ہی نہیں ہے۔ کسی بھی مسئلہ کا اصول دین سے ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ثبوت قرآن عظیم یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی قطعی الدلالۃ سے ہو۔ لہٰذا جو لوگ اس کو اصول دین کا درجہ دیتے ہیں ان پر ضروری ہے کہ وہ اس کا اصول دین سے ہونا دلیل کی روشنی میں ثابت کریں! اور محض وہابیہ کے مذہبی رنگ دینے سے یہ مسئلہ اصول کا درجہ نہیں لے لے گا۔

وہابیوں کی حمایت کا الزام اور اس کا جواب

سوال (۲۰) آپ کی کتاب سے وہابیوں کی حمایت اور ان سے اپنے تعلق کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔

جواب: یہی ہمارے اوپر سب سے بڑا الزام ہے، اور یہی الزام اس کتاب کی ترتیب کا محرک بنا، صرف اس مسئلہ کی بنیاد پر ہمیں وہابیہ اور دیابنہ سے جوڑا جا رہا تھا، اور طرح طرح سے ہمیں پریشان کیا جا رہا تھا، ورنہ تو ہمارے سارے عقائد و معمولات اہل سنت و جماعت کے موافق تھے اور آج بھی ہیں، لہٰذا ہمیں یہ لوگوں کے سامنے واضح کرنا پڑا کہ یہ مسئلہ وہابیہ اور دیابنہ کا ایجاد کردہ نہیں ہے بلکہ یہ متقدمین

علما و مشائخ کا معمول بہ ہے-خانقاہ عالیہ عارفیہ کی تاسیس کے تقریباً ڈیڑھ سو سال کا عرصہ ہوا، تب ہی سے ان دونوں مسئلے پر یہاں عمل ہو رہا ہے-اسی طرح ہم نے دیگر کئی خانقاہوں کی مثالیں بھی پیش کی ہیں جہاں یہ صدیوں سے تھا، جب کہ وہابیت و دیوبندیت کی بنیاد بھی نہ پڑی تھی، لہٰذا اس مسئلہ میں ہم کو ان لوگوں سے جوڑنا تاریخ سے کس قدر ناواقفیت ہے!

غیر سنی خانقاہوں سے استدلال کا الزام اور اس کا جواب

سوال (۲۱) آپ نے اپنی کتاب میں جن خانقاہوں کے تعامل سے استدلال کیا ہے، ان میں خانقاہ مجیبیہ پھلواری اور خانقاہ رامپور بھی شامل ہے، یہ دونوں خانقاہیں فکری اعتبار سے دیابنہ سے قریب ہیں؛ کیوں کہ یہ دونوں علمائے دیوبند کی تکفیر کی بجائے انہیں محض خاطی سمجھتی ہیں، لہٰذا یہ دونوں خانقاہیں غیر سنی ہیں، جن سے استدلال درست نہیں۔

جواب: سب سے پہلے ہم یہ بتادیں کہ ان دونوں خانقاہوں کے تعامل کو ہم نے بطور استدلال ذکر نہیں کیا ہے بلکہ ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ماضی میں ہندوستانی خانقاہوں کا توارث رہا ہے کہ وہاں مسجد کے اندر اذان ثانی ہوتی تھی اور لوگ بوقت اقامت ابتدا میں کھڑے ہوتے تھے اور آج بھی کچھ خانقاہیں ایسی ہیں جنہوں نے اپنی اس توارث کو محفوظ رکھا ہے۔ انہی میں سے یہ دونوں مذکورہ خانقاہیں بھی ہیں جو آج بھی اس گئے گزرے زمانے میں اپنے بزرگوں کے توارث پر عمل پیرا ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے ان دونوں خانقاہوں کو صرف اس لیے غیر سنی کی لسٹ میں ڈال دیا ہے کہ یہ علمائے دیوبند کی تکفیر کی بجائے محض خاطی سمجھتی ہیں، یہ کتنا غیر علمی رویہ ہے، اس کو بتانے کی ضرورت نہیں، آپ بخوبی جانتے ہیں کہ کسی کی تکفیر تقلیداً نہیں کی جاتی بلکہ تحقیقاً کی جاتی ہے۔ جس کے نزدیک کفر واضح ہوتا ہے وہ تکفیر کرتا

ہے اور جس کے نزدیک کفر واضح نہیں ہوتا وہ تکفیر نہیں کرتا، شیخ ابن تیمیہ کی اہل سنت و جماعت میں سے بعض لوگوں نے تکفیر کی ہے جیسے امام سخاوی نے اپنی معروف کتاب ''الضوء اللامع'' میں نویں صدی ہجری کے معروف حنفی محقق اصولی اور عالم دین علامہ علاء الدین بخاری (وفات: ۸۴۱ھ) کے حوالے سے لکھا ہے:

من أطلق على ابن تيمية أنه شيخ الإسلام فهو بهذا الإطلاق كافر[1]

یعنی جو شخص ابن تیمیہ کو شیخ الاسلام کہے گا وہ کافر ہے - آپ غور کریں کہ ان کی کتنی سخت تکفیر کی گئی ہے کہ جو ان کو شیخ الاسلام کہے گا وہ بھی کافر ہو جائے گا، لیکن اس کے باوجود اعلی حضرت نے ان کی تکفیر نہیں کی ہے بلکہ صرف ضال مضل کہا ہے۔ (دیکھئے: المستند المعتمد، حاشیہ علی المعتقد المنتقد، ص: ٦٦، ناشر: رضا اکیڈمی، ممبئی)

تو کیا فاضل بریلوی عدم تکفیر کی وجہ سے کافر ہو جائیں گے؟ معاذ اللہ! بلکہ مشہور حنفی عالم دین ملا علی قاری نے علامہ ابن القیم اور شیخ ابن تیمیہ کو اس امت کے اولیا میں شمار کیا ہے، مرقاۃ میں ہے: أنهما كانا من أهل السنة والجماعة بل ومن أولياء هذه الأمة[2] یعنی یہ دونوں اہل سنت و جماعت میں سے ہیں بلکہ اس امت کے اولیا میں سے ہیں۔

اسی طرح اعلی حضرت فاضل بریلوی نے شاہ اسماعیل دہلوی کی احتیاطاً تکفیر نہیں کی جبکہ آپ کے پیش رو علما نے ان کی تکفیر کی ہے۔ آپ خود فرماتے ہیں: بالجملہ ماہ نیم ماہ و مہر نیمروز کی طرح ظاہر و زاہر کہ اس فرقہ متفرقہ یعنی وہابیہ اسمعیلیہ اور اس کے امام نافرجام پر **جزما قطعا یقینا اجماعا بوجوہ کفر لازم، او ربلاشبہ جماہیر فقہائے کرام واصحاب فتوی اکابر واعلام کی تصریحات واضحہ پر یہ سب کے سب مرتد کافر باجماع ائمہ، ان**

([1]) الضوء اللامع لمحمد بن عبد الرحمن السخاوي شمس الدين، وفات: ۹۰۲ھ، (۹/۲۹۲)

([2]) مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح لملا علی القاری، کتاب اللباس (۷/۲۷۷۸)

سب پر اپنے کفریات ملعونہ سے بالتصریح توبہ و رجوع اور از سر نو کلمہ اسلام پڑھنا فرض وواجب، اگرچہ ہمارے نزدیک مقام احتیاط میں اکفار سے کف لسان ماخوذ مختار ومرضی ومناسب۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم وعلمہ جل مجدہ اتم واحکم [1]

فاضل بریلوی کی نمایاں عبارت کو دیکھیں کہ جس کی تکفیر جزمی قطعی یقینی اجماعی ہو، جس پر کثیر وجوہ سے کفر لازم ہو، جو بغیر شک و شبہ کے جمہور فقہائے کرام اور اصحاب فتوی اکابر واعلام کی واضح تصریحات کے مطابق کافر ومرتد ہو، جس کی تکفیر پر ائمہ کا اجماع ہو، جس پر صراحتاً توبہ و رجوع لازم ہو، جس پر از سر نو کلمۂ شہادت پڑھنا فرض وواجب ہو، ان سب کے باوجود آپ کے نزدیک ایسے شخص کی تکفیر سے زبان کو روکنا ہی مختار، پسندیدہ اور مناسب ہے-اسی صفحہ کے حاشیہ میں ہے:ان حضرت سے یہ سب کلماتِ کفر اعلی درجہ تواتر پر ہیں، پھر اگرچہ ہم براہ احتیاط تکفیر سے زبان روکیں، ان کے خسار و بوار کو یہ کیا کم ہے کہ جماہیر ائمہ کرام، فقہائے اسلام کے نزدیک ان پر بوجوہ کثیرہ کفر لازم-والعیاذ باللہ القیوم الدائم۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص سے اعلی درجہ تواتر میں کلمات کفر صادر ہوں، اس کی بھی تکفیر سے زبان کو روکنا چاہیے، اگر ان اقوالِ کفریہ میں کوئی تاویل، بعید ہی سہی ممکن ہو۔آپ خود اسی صفحہ پر لکھتے ہیں:ہم احتیاط برتیں گے، سکوت کریں گے، جب تک ضعیف سا ضعیف احتمال ملے گا حکم کفر جاری کرتے ڈریں گے۔

تو اب سوال یہ ہے کہ جب اسماعیل دہلوی کی تکفیر جزمی قطعی یقینی اجماعی تھی اور جمہور فقہا نے ان کی تکفیر کی تھی تو کیا فاضل بریلوی پر تکفیر سے کف لسان کرنے کی وجہ سے کفر عائد ہوگا؟ معاذ اللہ! کیا فاضل بریلوی اس اختلاف کرنے کی وجہ سے سنیت سے خارج ہوجائیں گے؟ معاذ اللہ!

بات صرف اتنی ہے کہ یہ مسئلہ تقلیدی نہیں تحقیقی ہے، جس کی تحقیق میں کفر

([1])فتاوی رضویہ (۲۳۶/۱۵) ناشر: مرکز اہل سنت برکات رضا، پور بندر، گجرات

ثابت ہوتا ہے وہ کافر کہتا ہے اور جس کی تحقیق میں کفر ثابت نہیں ہوتا وہ کافر نہیں کہتا، یا کفر ثابت تو ہوتا ہے اور بتواتر ثابت ہوتا ہے لیکن اس کے نزدیک تاویل کا کوئی احتمال ضعیف باقی ہوتا ہے، وہ تکفیر نہیں کرتا یا علی الاقل سکوت کرتا ہے۔ یہی حال علمائے دیوبند کی تکفیر کا ہے کہ جس کی تحقیق میں ان کا کفر ثابت ہوا، اس نے تکفیر کی اور جس کی تحقیق میں ان کا کفر ثابت نہیں ہوا، یا کفر تو ثابت ہوا لیکن اس میں تاویل کا کوئی احتمال ضعیف نظر آیا، اس نے تکفیر کرنے میں احتیاط سے کام لیا اور صرف خاطی سمجھا، یا قول کو کفریہ کہا اور قائل کی تکفیر سے گریز کیا۔ لہٰذا خانقاہِ رامپور اور خانقاہ مجیبیہ پھلواری کے ارباب حل و عقد نے اگر تکفیر کرنے میں احتیاط برتی، تو اس کی وجہ سے یہ لوگ سنیت سے خارج نہیں ہو جائیں گے، ورنہ پھر فاضل بریلوی کو بھی شیخ ابن تیمیہ اور شاہ اسماعیل دہلوی کی تکفیر نہ کرنے کی وجہ سے سنیت سے خارج کرنا پڑے گا۔

آج اس مسئلے کو زیر بحث لانے کی ضرورت کیا ہے؟

سوال (۲۲) اس مسئلے میں ماضی میں کافی بحثیں ہو چکی ہیں، اور فریقین کی جانب سے درجنوں کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں، پھر آج اس مسئلے کو زیر بحث لانے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب: یہ آپ نے بہت اچھا سوال کیا، اس مسئلہ کے علاوہ اس وقت امت کے بڑے بڑے مسائل ایسے ہیں جن کو زیر بحث لانے اور ان کا حل پیش کرنے کی سخت ضرورت ہے، لیکن بڑے بڑے مسائل پر کام کرنے میں، اسی طرح دعوت و تبلیغ، اصلاحِ فکر و عمل کے کام میں یہ چھوٹا مسئلہ حائل ہو رہا تھا، اس کی وجہ سے ہمیں سنیت سے باہر کیا جا رہا تھا، ہمیں سکون سے کام نہیں کرنے دیا جا رہا تھا، اس لیے اپنی صفائی کے لیے ناچار اس پر قلم اٹھانا پڑا- یہی وجہ ہے کہ جب بھی اس مسئلے پر لکھنے کے لیے بیٹھتا تو بار بار خیال گزرتا کہ ہم ایک غیر ضروری کام میں اپنا وقت صرف کر

رہے ہیں، لیکن مرتا کیا نہ کرتا کے تحت مجھے بادل نخواستہ اس کام کی طرف آنا پڑا، الحمد للہ !اس کتاب کا اثر یہ ہوا کہ متشدد ین اور مخالفین نے جن مخلصین کو مشکوک بنانے کی کوشش کی تھی، ان کو اس سے انشراح واطمئنان نصیب ہوا، اور خود ہمارے کچھ احباب کے دلوں میں اس حوالے سے کچھ شکوک و شبہات تھے وہ بھی زائل ہوگئے۔ رہے معاندین ومتشددین تو بقول شیخ سعدی:

توانم اینکہ نیازارم اندرون کسے - حسود راچہ کنم کوز خود بہ رنج درست [1]

اہل سنت کے درمیان انتشار برپا کرنے کا الزام

سوال (۲۳) آپ کو واقعی اس مسئلے میں ذہنی خلش تھی، تو ماضی میں لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کرتے یا اپنے اساتذہ میں سے کسی سے رابطہ کرتے لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا اور اہل سنت سے اختلاف کا بیڑا اٹھایا جس سے صاف واضح ہے کہ آپ اپنے عمل میں مخلص نہیں ہیں بلکہ دانستہ اہل سنت میں دراڑ پیدا کر رہے ہیں۔

جواب: اس مسئلے میں مجھے بالکل کوئی ذہنی خلش نہیں تھی، میں جب اس خانقاہ عالیہ عارفیہ میں آیا، اور دیکھا کہ یہاں لوگ بوقت اقامت ابتدا میں کھڑے ہوتے ہیں اور اذان ثانی مسجد میں دیتے ہیں، اسی وقت میں مطمئن ہوگیا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ یہ دونوں مسئلے فرعی ہیں اور دونوں جانب جواز ہے، اس لیے مجھے نہ کتابوں کے مطالعے کی ضرورت تھی اور نہ کسی استاذ سے رابطے کی، اور جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا کہ جب سے یہ خانقاہ قائم ہوئی ہے تب ہی سے یہاں کا یہی معمول رہا ہے۔ کسی نے کوئی تعرض نہیں کیا، لیکن جیسے ہی حضرت داعی اسلام نے احیائے سنت اور احیائے تصوف کا علمی و عملی بیڑا اٹھایا، تو بعض لوگ اس خانقاہ عالیہ عارفیہ کے خلاف طرح طرح سے الزامات لگا کر پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیے، اور پمفلٹ و اشتہار کے ذریعہ احباب و

([1]) میں یہ کر سکتا ہوں کہ کسی کا دل نہ دکھاؤں، مگر حاسد کا کیا کروں کہ وہ خود بخود رنج میں ہے۔

متعلقین کو مشکوک بنانے لگے اور صرف ان دونوں مسئلوں کو بنیاد بنا کر اس خانقاہ عالیہ عارفیہ کو سنیت سے خارج کرنے لگے، تو میں نے کتابوں کا مطالعہ بھی کیا اور اپنے بعض اساتذہ سے رابطے بھی کیے اور میں نے جو کچھ کتابوں کے مطالعے سے سمجھا وہ صفحۂ قرطاس پر رقم کر دیا، اور رہ گئی بات ہمارے اخلاص کی تو اس کو یوم حساب ہی کے لیے چھوڑ دیا جائے وہیں معلوم ہو گا کہ کون مخلص تھا اور کون نہیں۔ اور ہمارے اوپر جو آپ یہ الزام لگا رہے ہیں کہ ہم ان مسئلوں کے ذریعہ اہل سنت میں دانستہ دراڑ پیدا کر رہے ہیں اور اہل سنت سے اختلاف کر رہے ہیں تو سوال یہ ہے کہ جو لوگ ہمیں ان مسئلوں کی وجہ سے سنیت سے خارج کر رہے تھے وہ اہل سنت میں کون سا اتحاد پیدا کر رہے تھے ؟ سچ تو یہ ہے کہ ان متشدد ین ہی نے اہل سنت کو ٹکڑوں میں بانٹ رکھا ہے اور بہت سی خانقاہوں کو صرف اس قسم کے فروعی مسائل میں اپنی رائے کی بالادستی کی خاطر غیر سنی کی فہرست میں ڈال دیا ہے۔ اور رہا اہل سنت سے اختلاف کی بات، تو یہ مسئلہ خود اہل سنت کے درمیان مختلف فیہ ہے اور مدار سنیت نہیں ہے۔

آپ نے ڈیڑھ ہزار سوالات کے جوابات کیوں نہیں دیے ؟

سوال (۲۴) آپ کو اس موضوع پر کتاب لکھنا ہی تھا اور اپنی اصلاح کرنے کی بجائے اہل سنت کی مخالفت پر اصرار ہی تھا تو سب سے پہلے ان ڈیڑھ ہزار سوالات کے سلسلہ وار جوابات دیتے جن کی نشان دہی حضور مفتی اعظم ہند نے کی ہے تاکہ سمجھ میں آتا کہ آپ کا علمی مبلغ کیا ہے ؟

جواب: ہمیں اس موضوع پر نہ کتاب لکھنی تھی اور نہ ہم نے اہل سنت کی مخالفت کی ہے اور نہ ان کی مخالفت کا ہمیں شوق تھا اور نہ ڈیڑھ ہزار سوالات کے سلسلہ وار جوابات دینے کی کوئی ضرورت تھی، اور نہ وہ سوالات ہم سے تھے، صرف ہم نے اپنے دفاع کے لیے مسئلے کی حقیقت لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی

ہے۔ اور رہا ہمارا مبلغ علمی کا سوال تو اس میدان میں ہماری حیثیت محض ایک طالب علم کی ہے، چنانچہ جب بھی کوئی شخص کسی مسئلے میں ہماری تفہیم کرادے گا، سب سے پہلے ہمیں وہ اپنا موافق پائے گا، بشرطیکہ اس کی بات ہمیں سمجھ میں آجائے اور ہمارے نزدیک اس پر کوئی اشکال باقی نہ رہے۔

حافظ ملت کی رائے اور عمل

سوال (۲۵) ایک آخری سوال یہ ہے کہ آپ مصباحی ہیں، آپ نے دو سال حافظ ملت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے چمنستانِ علم و فن الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں تعلیم حاصل کی ہے، ان دونوں مسئلوں میں ان کا عمل اور ان کی رائے کیا تھی؟

جواب: وہاں کے دو سالہ علمی سفر کے دوران کئی مرتبہ ان دونوں مسئلوں کے حوالے سے حافظ ملت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا عمل اور ان کی رائے جاننے کی کوشش کی اور ہر مرتبہ ناکام رہا لیکن ایک قد آور شخصیت سے ایک مجلس میں اس تعلق سے بات چیت ہوئی، انہوں نے فرمایا کہ جامع مسجد راجہ مبارک شاہ مسجد میں جہاں حافظ ملت رحمۃ اللہ علیہ نمازیں ادا کرتے تھے، جمعہ کی اذان ثانی منبر سے متّصل مسجد کے اندر ہوتی تھی اور سب لوگ اقامت کی ابتدا ہی میں کھڑے ہوتے تھے- میں نے عرض کیا: آپ کے حوالے سے یہ بات میں اپنی کتاب میں درج کردوں، انہوں نے فرمایا: رہنے دیں! لوگ ہنگامہ کریں گے۔ اس لیے ان دونوں مسئلوں میں ان کا عمل کیا تھا اور ان کی رائے کیا تھی؟ میں یقین سے نہیں بتا سکتا کیوں کہ اس تعلق سے میری کوئی تحقیق نہیں ہے البتہ علامہ سید رکن الدین اصدق چشتی صاحب جو براہ راست حافظ ملت کے شاگرد ہیں، انہوں نے اپنی کتاب ''آئینۂ حافظ ملت'' میں لکھا ہے: ''حافظ ملت کی یہ عادت کریمہ تھی کہ درس گاہ میں اکثر اوقات کبھی درس سے پہلے اور کبھی درس کے بعد طلبا سے تربیتی گفتگو فرماتے یا انہیں مسائل کے نوک و پلک سمجھاتے -

ایک بار درس بخاری کے بعد فرمایا، عند الاحناف قیام حی علی الفلاح مستحب ہے اور ترتیب صف کی بھی تاکید آئی ہے اگر مسجد میں مقتدیوں کی تعداد اتنی ہے کہ قیام حی الفلاح کی صورت میں ترتیبِ صف باقی رہے گی توقیام حی علی الفلاح اولی ہے۔

اور اگر مسجد کشادہ ہے ،نمازیوں کا ہجوم ہے، قیام حی علی الفلاح پر عمل کی حالت میں ترتیب صف قائم رہنا ممکن نہیں ہے، جماعت قائم ہوجانے کے بعد بھی لوگ آگے پیچھے ہوتے رہیں گے، تکبیر اولی اور ثنا چھوٹ جانے کا ظن غالب ہے، تو قیام حی علی الفلاح کا ترک بہتر ہے۔ مثالاً فرمایا کہ جامع مسجد راجہ مبارک شاہ میں جمعہ کے دن مقتدیوں کا جم غفیر ہوتا ہے، کثیر صفوں کی لمبی قطاریں ہوتی ہیں ، اس میں ترتیبِ صف کا لحاظ رکھتے ہوئے قیام حی علی الفلاح پر عمل ممکن نہیں ہے لہٰذا میں جمعہ کی نماز میں اس کی پابندی نہیں کراتا ہوں "[1]

اس اقتباس سے پتا چلتا ہے کہ حافظ ملت رحمۃ اللہ علیہ اقامت کے مسئلے میں نرم رویہ رکھتے تھے، قیام حی علی الفلاح کو مستحب اور اولیٰ سمجھتے تھے لیکن مقتدیوں کے جم غفیر ہونے کی صورت میں اس کا ترک ہی بہتر سمجھتے تھے اور جمعہ کی نماز میں تو اس کی پابندی بھی نہیں کرواتے تھے کیوں کہ آپ ایک دانا حکیم اور مصلح تھے، آپ کے پیش نظر ہمیشہ مقاصد شریعت ہوتے تھے، نہ کے فروع در فروع کی موشگافیاں - کاش یہی نرم رویہ آپ کے نام لیواؤں میں ہوتا تو آج اس قدر فتنہ وفساد بپا نہ ہوتا۔

([1]) آئینۂ حافظ ملت - حصہ اول از علامہ سید رکن الدین اصدق چشتی، ص: ۸۴/۸۵، الاصدق اکیڈمی، نالندہ

مصادرو مراجع

الابہاج فی شرح المنہاج علی منہاج الوصول الی علم الاصول للبیضاوی، ابو نصر تاج الدین، علی بن عبد الکافی السبکی (۷۷۱ھ) دار الکتب العلمیۃ- بیروت ۱۴۰۴ھ

الاجوبۃ النافعۃ عن اسئلۃ لجنۃ مسجد الجامعۃ، ابو عبد الرحمن محمد ناصر الدین البانی (۱۴۲۰ھ) مکتبۃ المعارف للنشر والتوزیع ۱۴۲۰ھ

الاحکام السلطانیۃ، ابو الحسن علی بن محمد بن محمد بن حبیب بصری البغدادی، ماوردی (۴۵۰ھ) دار الحدیث- القاھرۃ

ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من علم الاصول، محمد بن علی بن محمد الشوکانی (۱۲۵۰ھ) دار الکتاب العربی، ۱۴۱۹ھ

الاستذکار، ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر بن عاصم قرطبی (۴۶۳ھ-) دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۴۲۱ھ

اشعۃ اللمعات (فارسی) عبد الحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ) کارخانہ محمدی، ۱۲۷۷ھ

الاصل المعروف بالمبسوط، ابو عبد اللہ محمد بن الحسن بن فرقد شیبانی (۱۸۹ھ) دارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ- کراچی

اصول الرشاد لقمع مبانی الفساد، نقی علی خان (۱۲۹۷ھ) امام احمد رضا اکیڈمی، بریلی ۱۴۳۰ھ

الاعتصام، ابراہیم بن موسی بن محمد غرناطی شاطبی (۷۹۰ھ-) دار ابن عفان، ۱۴۱۲ھ

الاعلام، خیر الدین زرکلی (۱۳۹۶ھ) ناشر: دار العلم للملایین، ۲۰۰۲م

الانصاف فی معرفۃ الراجح من الخلاف، ابو الحسن علی بن سلیمان مرداوی (۸۸۵ھ) دار احیاء التراث العربی

الاوسط فی السنن والاجماع، ابن منذر نیسابوری، (۳۱۹ھ) دار طیبۃ، الریاض ۱۴۰۵ھ
البحر الرائق، زین الدین ابن نجیم حنفی (۹۷۰ھ)، دار المعرفۃ
البحر المحیط فی اصول الفقہ، ابو عبد اللہ بدر الدین محمد بن عبد اللہ بن بہادر الزرکشی (۷۹۴ھ) دار الکتبی، ۱۴۱۴ھ
البدایۃ والنھایۃ، ابوالفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر (۷۷۴ھ-) دار الفکر ۱۴۰۷ھ
بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، علاء الدین کاسانی (۵۸۷ھ) دار الکتاب العربی
البنایۃ شرح الھدایۃ، ابو محمد محمود بن احمد بن موسی بن احمد بن حسین حنفی معروف بہ بدر الدین عینی (۸۵۵ھ-) دار الکتب العلمیۃ ۱۴۲۰ھ
بہار شریعت، محمد امجد علی اعظمی بن جمال الدین (۱۳۶۷ھ) مکتبۃ المدینۃ ۱۴۲۹ھ
البیان والتحصیل والشرح والتوجیہ والتعلیل لمسائل المستخرجۃ، ابو الولید محمد بن احمد بن رشد قرطبی (۵۲۰ھ) دار الغرب الاسلامی، بیروت، طبع دوم ۱۴۰۸ھ
تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، عثمان بن علی زیلعی (۷۴۳ھ) المطبعۃ الکبری الامیریۃ، القاھرۃ، ۱۳۱۳ھ
تذکرۃ الحفاظ، شمس الدین ابو عبد اللہ محمد ذھبی (۷۴۸ھ-) دار الکتب العلمیۃ ۱۴۱۹ھ
تفسیر الجلالین، جلال الدین محمد بن احمد المحلی (۸۶۴ھ ہ-) وجلال الدین عبد الرحمن بن ابی بکر سیوطی (۹۱۱ھ ہ-) دار الحدیث - قاہرۃ
التمھید لما فی الموطا من المعانی والاسانید، ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر قرطبی (۴۶۳ھ) وزارۃ عموم الاوقاف والشؤون الاسلامیۃ - مغرب ۱۳۸۷ھ
التوضیح لشرح الجامع الصحیح، ابن الملقن سراج الدین ابو حفص عمر بن علی (۸۰۴ھ) دار النوادر، دمشق، ۱۴۲۹ھ
تیسیر التحریر، محمد امین بن محمود البخاری، معروف بامیر بادشاہ الحنفی (۹۷۲ھ) دار الفکر
جامع المضمرات والمشکلات، یوسف بن عمر صوفی (۸۳۲ھ) دار الکتب العلمیۃ
جمع الجوامع، امام جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) الازھر الشریف، ۲۰۰۵ء

الجواهر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ، عبد القادر حنفی (۷۷۵ھ) میر محمد کتب خانہ، کراچی
حاشیۃ السفطی علی شرح ابن ترکی علی العشماویۃ، علامہ شیخ یوسف بن سعید بن اسماعیل سفتی مالکی، مکتبۃ القاھرۃ/مکتبۃ الفکر لیبیا ۱۳۸۸ھ
حاشیۃ الشلبی، شہاب الدین احمد بن محمد بن احمد بن یونس بن اسماعیل بن یونس شلبی (۱۰۲۱ھ) المطبعۃ الکبری الامیریۃ- بولاق، القاھرۃ، ۱۳۱۳ھ
حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار، احمد بن محمد طحطاوی (۱۲۳۱ھ)، مصر ۱۲۵۴ھ
حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح شرح نور الایضاح، احمد بن محمد بن اسماعیل طحطاوی حنفی (۱۲۳۱ھ) دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۱۸ھ
الحدیقۃ الندیۃ شرح الطریقۃ المحمدیۃ، عبد الغنی نابلسی دمشقی حنفی (۱۱۴۳ھ) دیکھیے:
https://almostafa.info/data/arabic/depot3/gap.php?file=i004747.pdf
حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء، ابو نعیم اصبہانی (۴۳۰ھ-) دار السعادۃ، ۱۳۹۴ھ
خزائن العرفان فی تفسیر القرآن، سید محمد نعیم الدین مرادابادی (۱۳۶۷ھ) مجلس برکات، جامعہ اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی
الدر المختار شرح تنویر الابصار، علاء الدین حصکفی (۱۰۸۸ھ) دار الفکر
رد المحتار علی الدر المختار، ابن عابدین، محمد امین بن عمر بن عبد العزیز عابدین الدمشقی الحنفی (۱۲۵۲ھ) دار الفکر، بیروت
رد المحتار علی الدر المختار، محمد امین بن عمر بن عبد العزیز عابدین دمشقی، حنفی (۱۲۵۲ھ)
رسائل ابن عابدین شامی، مؤسسۃ فؤاد بعینو للتجلید، بیروت
سنن ابن ماجہ، أبو عبد اللہ محمد بن یزید قزوینی (۲۷۳ھ) دار احیاء الکتب العربیۃ
سنن ابو داؤد، سلیمان بن الاشعث بن اسحاق سجستانی (۲۷۵ھ) المکتبۃ العصریۃ
سنن الترمذی، ابو عیسی ترمذی، (۲۷۹ھ) مصطفی البابی، مصر ۱۳۹۵ھ
السنن الکبری لابو بکر البیہقی (:۴۵۸ھ) دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۲۴ھ
سنن دار قطنی، ابو الحسن علی بن عمر بن احمد دار قطنی (۳۸۵ھ) مؤسسۃ الرسالۃ، ۲۰۰۴ء

سنن کبری، احمد بن الحسین بن علی بن موسی ابو بکر بیہقی، مکتبۃ دار الباز - مکۃ، ۱۹۹۴ء
سیر اعلام النبلاء، شمس الدین محمد ذھبی (۷۴۸ھ-) مؤسسۃ الرسالۃ ۱۴۰۵ھ
سیرۃ ومناقب امیر المومنین عمر بن عبد العزیز، ابن جوزی (۵۹۷ھ) مکتبۃ الصفا، ۱۴۲۷ھ
شرح الرضی علی الکافیۃ ، ابن الحاجب، رضی الدین محمد بن الحسن استراباذی نحوی (۶۸۶ھ) جامعۃ قاریونس - لیبیا ۱۳۹۵ھ
الشرح الکبیر علی متن المقنع، عبد الرحمن بن محمد بن احمد بن قدامۃ مقدسی جماعیلی حنبلی، ابو الفرج، شمس الدین (۶۸۲ھ) دار الکتاب العربی للنشر والتوزیع
شرح صحیح مسلم، المنھاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج
شرح صحیح مسلم، غلام رسول سعیدی (۱۴۳۷ھ) مرکز اہل سنت برکات رضا، گجرات
شرح عقود رسم المفتی، محمد امین معروف بہ ابن عابدین شامی، مکتبہ زکریا، دیوبند
صحیح بخاری، محمد بن اسماعیل ابو عبد اللہ بخاری (۲۵۶ھ) دار طوق النجاۃ، ۱۴۲۲ھ
صحیح مسلم، مسلم بن الحجاج ابو الحسن نیساپوری (۲۶۱ھ-) دار احیاء التراث العربی - بیروت
صور من حیاۃ التابعین، ڈاکٹر عبد الرحمن رافت پاشا، دار الادب الاسلامی ۱۴۱۸ھ
الضوء اللامع، محمد بن عبد الرحمن سخاوی (وفات: ۹۰۲ھ) دار الجیل - بیروت
الطبقات الکبری، محمد بن سعد بصری زہری، دار صادر، بیروت، ۱۹۶۸ء
عمدۃ القاری شرح البخاری، بدر الدین عینی (۸۵۵ھ) دار احیاء التراث العربی - بیروت
العنایۃ شرح الھدایۃ، محمد بن محمد بن محمود، اکمل الدین ابو عبد اللہ ابن الشیخ شمس الدین ابن الشیخ جمال الدین الرومی البابرتی، دار الفکر (۷۸۶ھ-)
غایۃ البیان ونادرۃ الاقران فی آخر الاوان، امام امیر کاتب بن امیر عمر العمید اتقانی حنفی (۷۵۸ھ) مخطوطہ دیکھیں:
http://waqfeya.com/category.php?cid=199&st=30
الفتاوی الھندیۃ، لجنۃ علماء برئاسۃ نظام الدین بلخی، دار الفکر ۱۳۱۰ھ
الفتاوی البزازیۃ او الجامع الوجیز فی مذہب الامام الاعظم ابی حنیفۃ النعمان، محمد بن محمد بن

شہاب البزاز الکردری الحنفی (۸۲۷ھ) مکتبۃ شاملۃ
فتاوی رضویہ، احمد رضا خان بریلوی (۱۳۴۰ھ) مرکز اہل سنت برکات رضا، گجرات
فتاوی قاضیخان، فخر الدین حسن بن منصور اوزجندی، فرغانی، حنفی (۵۹۲ھ) مکتبہ شاملۃ
فتح الباری شرح صحیح البخاری، ابن حجر عسقلانی، دار المعرفۃ، بیروت ۱۳۷۹ھ
فتح القدیر، کمال الدین معروف بہ ابن ہمام (۸۶۱ھ)، دار الفکر، بیروت
الفقہ الاسلامی وادلتہ، ڈاکٹر وھبہ ذحیلی (۱۴۳۶ھ)، دار الفکر، سوریہ، طبع چہارم
فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، عبد الرؤوف مناوی (۱۰۳۱ھ) المکتبۃ التجاریۃ، مصر، ۱۳۵۶ھ
کشف الاسرار شرح اصول بزدوی، علاء الدین بخاری (۷۳۰ھ)، دار الکتاب الاسلامی
الکافی فی فقہ اہل المدینہ، ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن عبد البر القرطبی مالکی (۴۶۳ھ)
الریاض الحدیثۃ، الریاض، ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء
کشاف القناع عن متن الاقناع، منصور ادریس بھوتی حنبلی (۱۰۵۱ھ) دار الکتب العلمیۃ
کشف الاسرار شرح اصول البزدوی، علاء الدین، بخاری حنفی (۷۳۰ھ) دار الکتاب الاسلامی
لسان العرب، محمد بن مکرم بن منظور مصری (۷۱۱ھ) ناشر: دار صادر - بیروت
مالابد منہ، قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی (۱۲۲۵ھ) ناشر: سب رنگ کتاب گھر دہلی
مبسوط، محمد بن الحسن شیبانی (۱۸۹ھ) ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ، کراچی
المبسوط، محمد بن الحسن الشیبانی ابو عبد اللہ (۱۸۹ھ) ادارۃ القرآن، کراچی
المبسوط، محمد بن احمد بن ابی سھل شمس الائمۃ سرخسی (۴۸۳ھ-) دار المعرفۃ، بیروت
مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، نور الدین ہیثمی (۸۰۷ھ-) مکتبۃ القدسی، قاہرہ، ۱۴۱۴ھ
مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، نور الدین ہیثمی (۸۰۷ھ) مکتبۃ القدسی، القاھرۃ، ۱۴۱۴ھ
مجمع السلوک والفوائد، مخدوم شیخ سعد خیر آبادی (۹۲۲ھ) شاہ صفی اکیڈمی ۱۴۳۸ھ
المجموع شرح المھذب، محی الدین یحی بن شرف نووی (۶۷۶ھ) دار الفکر، بیروت
المدخل، محمد بن محمد عبدری مالکی معروف بہ ابن الحاج (۷۳۷ھ): دار التراث
مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح لملا علی القاری (۱۰۱۴ھ) دار الفکر، بیروت

مرکزالبحوث وتقنیۃالمعلومات، قاھرہ مصر
المستدرک، محمد بن عبداللہ ابوعبداللہ الحاکم نیساپوری (۴۰۵ھ) دار الکتب العلمیۃ
مسند الامام احمد بن حنبل، احمد بن محمد بن حنبل (۲۴۱ھ-) مؤسسۃ الرسالۃ ۱۴۲۱ھ
مصنف ابن ابی شیبۃ، ابوبکر، (۲۳۵ھ) مکتبۃ الرشد، الریاض، ۱۴۰۹ء
مصنف عبدالرزاق، ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام صنعانی (۲۱۱ھ) دارالتاصیل
مصنف عبدالرزاق، ابوبکر عبدالرزاق صنعانی، المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۴۰۳ء
المصنف، ابوبکر عبدالرزاق بن ھمام بن نافع حمیری یمانی (۲۱۱ھ-) المجلس العلمی، الھند
المعجم الکبیر، سلیمان بن احمد شامی، ابوالقاسم طبرانی (۳۶۰ھ) مکتبہ ابن تیمیۃ، القاھرۃ
معجم کبیر، سلیمان بن احمد طبرانی (۳۶۰ھ-) مکتبۃ العلوم والحکم، الموصل، ۱۹۸۳ء
المغنی، موفق الدین ابن قدامہ حنبلی (وفات: ۶۲۰ھ) مکتبۃ القاھرۃ ۱۳۸۸ھ
المقاصد الحسنۃ، شمس الدین سخاوی (۹۰۲ھ) دار الکتاب العربی
مکتوبات امام احمد رضا بریلوی، مرتب: مولانا شاہ محمود احمد قادری کانپور، مکتبہ نبویہ، گنج بخش روڈ لاہور ۲۰۰۱م
المنھاج شرح صحیح مسلم، محیی الدین نووی (۶۷۶ھ) دار احیاء التراث العربی، ۱۳۹۲ھ
موطا امام مالک، ابن انس (۱۷۹ھ-) دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۰۶ھ
نور الایضاح، حسن الوفائی شرنبلالی (۱۰۶۹ھ) دار الحکمۃ، دمشق، ۱۹۸۵م
نور الایضاح، حسن بن عمار بن علی شرنبلالی مصری، حنفی (۱۰۶۹) المکتبۃ العصریۃ
نھایۃ السول شرح منھاج الوصول، عبدالرحیم بن الحسن بن علی سنوی شافعی، (۷۷۲ھ) دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۲۰ھ
الھدایۃ شرح البدایۃ، ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغیانی (۵۹۳ھ) المکتبۃ الاسلامیۃ